تخلیق

CamScanner

اشاعت کا مسلسل 44واں سال

ماہنامہ تخلیق لاہور

بانی مدیر اظہر جاوید

عرصہ ادارت 2012 - 1969ء

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 44	جون 2013ء	شمارہ : 6

قیمت فی پرچہ : 100روپے ..... سالانہ : 500روپے (سالانہ100ڈالر بیرون ممالک)

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki,
Super Town, Lahore-Cantt.

فون نمبرز: 04236620499۔04236671007.....موبائیل فون:03218899007

ای میل:ajavedtakhleeq@yahoo.com.....ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان..... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود..... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔(انشا اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کی باقاعدہ اشاعت کے لئے ''تخلیق فاؤنڈیشن'' قائم کی جا رہی ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے دفتر ''تخلیق'' کی تبدیلی اور پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ **نیّر** جہاں، تاشی ظہیر اور نارنگ ساقی نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لئے زرِتعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِسالانہ صرف 1,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا نیا پتہ: **E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt**

PAKISTAN
Soonan Azhar
E/13/13C-1, Bismilla Lane, Cavalary Ground, Officer Colony, St.No.7 Walton Lahore-Cantt.
Ph: 04236671007
Cell : 0321-8899007
Email:ajavedtakhleeq@gmail.com
Email:ajavedtakhleeq@yahoo.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New Delhi-110001, India
Ph: 0091-41517818
Email:narangsaqi@gmail.com

U.S.A.
Naiyar Jahan
721-Hill Street
111-Santa Monica
C.A. 90405, U.S.A.
Ph : 0013103969303
Email:Zihanat@hotmail.com
urdu@urdu markaz.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
591-Sylvanave
Mountain View
C.A.94041
U.S.A.
Ph: 0015107503297
Email: tzaheer@gmail.com

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 7

مضامین

علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم..... — ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا — 9
اقبال سے شناسائی — ڈاکٹر انور سدید — 14
اقبال کا فلسفہ خودی اور فکرِ حاضر — صائمہ نورین بخاری — 16
پیار کا امرت رس — پروفیسر جمیل آذر — 19

منظومات

حمد — نسرین نکہت سبزواری — 23
نیا سال — شاہین — 23
وہ ایک بات — امجد اسلام امجد — 24
ایسے میں کوئی کیا کرے! — امجد اسلام امجد — 24
دریوزہ گر — انور سدید — 25
وراثت — صفدر صدیق رضی — 25
ماہیے — اعزاز احمد آذر — 26
تو جو آ جائے تو..... — سرور حسین — 27
مشورہ — سلیمان خمار — 27
اُس گھر کی ٹوٹی کھڑکی سے — فوقیہ مشتاق — 28
یہ زمیں — آفتاب راجا — 28
دوہے — نور زمان ناوک — 29

افسانے

بین بجاؤ — ڈاکٹر ابدال بیلا — 30
فرار — پروین عاطف — 33
جنازہ — عطیہ سیّد — 38
وقت تتلی تھا — عذرا اصغر — 43
تہِ سنگ — خاقان ساجد — 47
میرا کنبہ — ڈاکٹر زین السالیکن سالک — 53
خوف کے سایے — شفیع ہمدم — 59
نیل کی واپسی — نجیب عمر — 62
مستحق — محمد عباس ثاقب — 65
گھر! کون سا گھر.....؟ — اظہر جاوید — 71

غزلیں

حفیظ انجم کریم نگری، امین راحت چغتائی، سیّد مشکور حسین یاد، انور سدید، شاہین، مامون ایمن، محمود شام، ناصر زیدی، انوار فیروز، نسیم سحر، سیّد ریاض حسین زیدی، ارشد محمود ارشد، آصف ثاقب، رفیع الدین ذکی قریشی، کرشن کمار طور، وشال کھلر، ڈاکٹر ایوب ندیم، رومانہ رومی، ایم زیڈ کنول، عمرانہ مشتاق، رشیدہ عیاں، تاشی ظہیر، میثم علی آغا، اسد اعوان، ندیم ہاشمی، نجمہ شاہین کھوسہ، طفیل عامر، محمد افضال انجم — 75–89

انشائیہ

رکوع میں جانے کی ادا — سیّد مشکور حسین یاد — 90
بادل — سلیم آغا قزلباش — 92

خاکہ

وزیر آغا۔ عظیم اہلِ قلم، بے مثال انسان — اظہر جاوید — 95
اپنے ملک صاحب — غلام نبی اعوان — 99

یادیں

بمبے ریٹرن — عزیز میرٹھی — 102
اب کون بھلا اتنی محبت ہمیں دے گا — ڈاکٹر طاہرہ بخاری — 108

آپ بیتی

سفرِ شمال — طارق محمود — 110

ڈائری

سنگریزے اور جواہر — غلام الثقلین نقوی — 116

طنز و مزاح

جشنِ آزادی — ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی — 119

پرانی اور نئی گاڑیاں — ڈاکٹر محسن مگھیانہ — 122

جائزے

شاہ دولہ کا چوہا — مامون ایمن — 124

فخرِ زماں کا.....گردش میں پاؤں — ڈاکٹر خیال امروہوی — 127

اِمکان در اِمکان — خورشید بیگ میلسوی — 132

ڈاکٹر محمد علی صدیقی — ڈاکٹر جمال نقوی — 135

خوابید خطوط

ادیبوں کے خطوط۔اظہر جاوید کے نام — 137

اظہر جاوید کے خطوط۔معاصرین کے نام — 140

پنجاب رنگ

ایہہ دوہویں کون — حنیف باوا — 142

آکھیا سی — منزہ شاہد — 142

پنجابی ہائیکو — انوار فیروز — 143

غزل — شگفتہ نازلی — 143

اظہر جاوید.....ٹر گیا ماہی — شوکت علی (گلوکار) — 144

تبصرے

146

قندِ مکرر

اپنی بات.....سب کی بات — اظہر جاوید — 152

انجمن خیال (خطوط)

شفیع عقیل، مشکور حسین یاد، انور سدید، فخر زمان، علی سفیان آفاقی، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، ناصر زیدی، سردار پنچھی، آصف ثاقب، نسیم سحر، آفتاب راجا، رشید آفرین، اثیر احمد خان، انوار فیروز، نجیب عمر، راجہ اسد علی خاں، ضیاء شہزاد، صائمہ نورین بخاری، امتیاز کاظمی، سرور حسین، محمد افضال انجم، وشال کُھلّر، خورشید احمر، اسلم سحاب ہاشمی، مسرت رعنا، جمیلہ شبنم، عزیز میرٹھی، سلیم آغا قزلباش، مرزا شبیر بھیروی — 155

ٹائیٹل

پریانکا واہگیلا (انڈیا)

ناشر — سونان اظہر جاوید

طابع — بیدار سرمدی

قانونی مشاورت — لطیف قریشی، سیّد شاہد بخاری

مطبع — بُکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

o بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط o

پہلی بات

''الحمرا بیٹھک'' میں اظہر جاوید کی پہلی برسی کی سوگوار تقریب منائی جا رہی تھی تو میرے ذہن میں یہ بات بار بار اُبھر رہی تھی کہ مجھے اپنے والد اظہر جاوید سے محروم ہوئے ایک سال گزر گیا ہے۔ وہ زندہ تھے تو ان کی موجودگی کا احساس مختلف نوعیت کا تھا۔ اکثر اوقات ہفتوں ملاقات نہ ہوتی۔ لیکن اُن کا ٹیلی فون آ جاتا تو عدمِ ملاقات کا ازالہ ہو جاتا۔ وہ دُنیا سے اُٹھ گئے تو یہ احساس میری جان کا روگ بن گیا کہ اب میں، میری بیوی سعدیہ سونان اور میرے بچے ان کی دعاؤں سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہم ان کو دیکھ نہ سکیں گے۔ ان کی آواز نہ سُن سکیں گے۔ ان کی برسی کی تقریب میں جب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محترمہ بشریٰ رحمٰن، جناب سرفراز سیّد، محترم انور سدید، محترم شاہد بخاری، جناب قاضی منشا صاحب، جناب راجہ اسد علی خان، محترمہ نسیم صابری، پروفیسر حسن عسکری کاظمی ان کی باتیں کر رہے تھے تو اچانک میں نے دیکھا کہ اظہر جاوید بھی محفل میں موجود ہیں اور ہر ایک سے کہہ رہے ہیں..... ''شاد آباد رہیں، سدا سُکھی رہیں'' اس کے ساتھ ہی مجھے علاّمہ اقبال کا یہ مصرعہ یاد آیا :

''مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں''

''عدمِ فنا'' کے تصوّر نے ہی مجھے اس خوشی سے سرشار کر دیا کہ اظہر جاوید کا رسالہ ''تخلیق'' ادبی دنیا سے غیر حاضر نہیں ہوا اور اس کے تسلسلِ اشاعت کو قائم رکھا گیا ہے اور یہ بھی درحقیقت اظہر جاوید کی زندگی ہی کا مظہر ہے اور وہ اَپنے ادبی مشن کی تکمیل میں اپنے دوستوں اور گوپیوں کے ساتھ شامل ہیں۔

والد مرحوم کبھی کبھی اپنے صحافتی تجربوں کا ذکر کرتے تو اہلِ قلم کے رویّوں پر کھل کر قہقہہ لگاتے لیکن میں یہ سب کچھ حیرت سے سنتا اور فراموش کر دیتا۔ اب گزشتہ ایک سال سے انہیں تجربات سے میں خود بھی گزر رہا ہوں تو ادبی دنیا کی بہت سی باتیں نرالی نظر آئی ہیں مثلاً غزل، نظم اور مضمون بھیج کر لکھنے والوں کی اشاعت کے لیے بے تابی دیدنی ہوتی ہے۔ تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں بھیجنے کی درخواست پر غور نہیں کیا جاتا اور صرف ایک جلد ارسال کر کے ٹیلی فون کالز کا تانتا لگ جاتا ہے کہ ابھی تبصرہ کیوں نہیں چھپا۔ بعض اوقات تو ''تخلیق'' کے کرم فرما اپنے خط میں الفاظ کے انتخاب میں بھی مناسب رویّہ اختیار نہیں کرتے۔

فن پارہ اور تبصرہ چھپ جائے تو بعض لوگوں کی بیگانگی ان کے کردار کا انوکھا روّیہ لے کر سامنے لاتی ہے۔ کبھی انہیں ''تخلیق'' کے حقوق کا احساس دلایا جائے تو یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ ''تخلیق'' کا چھاپنا نہ چھاپنا صرف سونان اظہر جاوید کا فیصلہ یا مسئلہ ہے اور ان کا قلمی تعاون ان کی ادبی مروّت ہے جس کے لیے مدیر سونان اظہر جاوید کو زندگی بھر احسان مند رہنا چاہیے۔

تصویر کا یہ ایک رُخ حوصلہ فرسا ہے لیکن میں اظہر جاوید کے ان دوستوں اور گوپیوں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے ''تخلیق'' کی اشاعت کو برقرار رکھنے کے لیے میری معاونت کی اور نہ صرف نئے خریدار فراہم کیے بلکہ اشتہاروں کے حصول میں بھی مدد کی اور اسی وجہ سے ''تخلیق'' کی سرکولیشن کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ ''انجمنِ خیال'' میں ان کے خطوط نہ صرف لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ ان کے کردار کے روشن زاویوں کے آئینہ دار بھی ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ میرا انحصار ایسے دوستوں پر ہی ہے اور ان کے تعاون سے ''تخلیق''

ادب کی خدمت میں پیش پیش رہے گا۔ اِن کی تجاویز میرا قیمتی سرمایہ اور ''تخلیق'' کا روشن مستقبل ہے۔

جناب اظہر جاوید کی برسی پر ''تخلیق ایوارڈ'' کا اجراء اضطراری خیال نہیں تھا بلکہ یہ ارباب ادب کے کمالِ فن کے اعتراف کا ایک زاویہ ہے۔ ''تخلیق'' نے یہ ایوارڈ کسی پیشگی اعلان کے بغیر جاری کیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اسے ادبی دنیا میں تحسین کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس سے قبل ''نقوش ایوارڈ'' کئی برس تک حکومتی تعاون سے جاری رہا لیکن اب ''نقوش'' کی اشاعت بھی التوا میں پڑ گئی ہے اور شاید ایوارڈ کے سلسلے میں جنرل ضیاء جیسی سرکاری سرپرستی بھی دستیاب نہیں۔ قارئین جانتے ہیں کہ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کے 43 اشاعتی برسوں میں سرکاری معاونت کبھی قبول نہیں کی۔ ہم ''تخلیق ایوارڈ'' بھی آلودگی سے پاک رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کا فیصلہ ادب کے چند سرکردہ افراد کے بورڈ کے سپرد کیا گیا ہے۔ بورڈ کے نام پوشیدہ رکھے جائیں گے تاکہ ایوارڈ کی غیر جانبداری قائم رہے اور سفارش پسند لوگ بورڈ کے ارکان کو پریشان نہ کریں۔ بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ ''تخلیق ایوارڈ'' سال میں صرف ایک ممتاز ادیب کو ان کی زندگی بھر کی ادبی فتوحات پر پیش کیا جائے گا۔ ''انجمنِ خیال'' کے خطوط نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ بے جا تعریف و توصیف کی بجائے ''تخلیق'' کے مندرجات پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار فرمائیں۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کے رسالے کی سب نظمیں، غزلیں، افسانے معیاری اور اعلیٰ پائے کے ہیں بلکہ یہ واضح ہونا چاہیے کہ آپ کو کوئی فن پارہ کیوں پسند آیا ہے اور اس ادب پارے کے محاسن و معائب کیا ہیں۔ بدقسمتی سے ادب میں سچ بولنے اور سچ لکھنے کی روایت کمزور پڑتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی تنقید کو برداشت کرنے کے لیے صبر و تحمل بھی مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے ادب کی صحت مند ترقی رُکتی نظر آ رہی ہے۔ ممتاز مصوّر بشیر موجد صاحب نے ایک بڑے ادیب کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ اپنی ذات اور فن پر تنقید برداشت نہیں کرتے تھے اور قطع تعلق کر لیتے تھے۔ حالاں کے ادبی اختلافات ذاتی نہیں ہوتے۔ صحت مند اختلاف ادب کے لئے نعمت ہے جس کا اظہار تہذیب و ادب کے دائرے میں جاری رہنا چاہیے۔

وفیات

گزشتہ دنوں ادب کے اُفق سے جو تابندہ ستارے ٹوٹ گئے ان میں پاکستان کی منفرد شاعرہ، ادیبہ شبنم شکیل صاحبہ اور خالد احمد صاحب اور ہندوستان کے دیویندر اِسّر، شرون کمار ورما شامل ہیں۔ خالد احمد جدید غزل کے اہم شاعر اور نئے لکھنے والوں کے رہنما تھے۔ ان کا تعلق محترمہ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور توصیف احمد خان کے خاندان سے تھا۔ دیویندر اِسّر نقاد اور افسانہ نگار تھے۔ دہلی میں انہوں نے آخری دور نامساعد حالات میں گزارا۔ امرت سر کے شرون کمار ورما اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار تھے۔ ادب ان سب کی زندگی کی بامعنی سرگرمی تھی۔ یہ چاروں اظہر جاوید کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ ان کی رحلت پر اُردو دنیا سوگوار ہے اور غم کا اظہار کرتی ہے۔

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

علامہ اقبال کی یاد میں

علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم ـــــ کرمکِ شب تاب

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

علامہ اقبال اُردو اور فارسی دونوں زبانوں بہت بڑے شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ دونوں زبانوں کے کلام میں سے کسے فوقیت دی جائے۔ اردو میں ان کے تین مجموعے بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم ہیں اور ایک تہائی حصہ ارمغان حجاز کا بھی اردو کلام ہی پر مشتمل ہے جبکہ فارسی مجموعے اسرار خودی، رموز بے خودی (جنھیں بعد میں یکجا کر کے اسرار و رموز کا نام دیا گیا)، پیامِ مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اور ارمغان حجاز کے دو تہائی حصے مل کر اردو کلام سے دوگنا بلکہ اس بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال نے رسمی طور پر فارسی کی بہت کم تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ چار سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے اور تقریباً دو تین سال زیرِ تعلیم رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے فارسی کی دو نظمیں اور کتابیں پڑھی ہوں گی جو ان دنوں مساجد اور مکاتب میں پڑھائی جاتی تھیں یعنی کریما، مامقیماں، آمد نامہ، محمود نامہ اور گلستان و بوستان سعدی وغیرہ..... لیکن جلد ہی وہ مکتب سے انگریزی سکول میں داخل کرا دیے گئے۔

ان کے ابتدائی اردو کلام میں بھی فارسی کے کلاسیکی ادب کے گہرے اثرات موجود ہیں اور جوں جوں ہم ان کے کلام کے ارتقاء پر نظر ڈالتے ہیں، فارسی سے ان کی آگاہی بلکہ مہارت کے مزید ثبوت ملتے چلے جاتے ہیں۔

اقبال نے اسرارِ خودی کی اشاعت سے پہلے فارسی میں کچھ متفرق کلام کہا ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی مرتبہ اسرار خودی کی اشاعت کی وجہ سے دنیا ان کی فارسی دانی کی معترف ہوئی۔ اس کتاب نے ہندوستان کے اہلِ قلم ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ بیرون ہندوستان بھی اس کا خوب چرچا ہوا اور نکلسن کے انگریزی ترجمے کے بعد مستشرقین نے بھی اس کی طرف توجہ کی۔ اسرار خودی کی تخلیق کے دوران وہ اپنے دوست اور فارسی زبان پر ماہرانہ دسترس رکھنے والے شاعر گرامی سے برابر مشورہ سخن کرتے رہے۔ اقبال کی ترقی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ہر عالم سے سیکھنا چاہتے تھے۔ اور ان سے بڑے اصرار سے اپنی غلطیوں سے آگاہ کیے جانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ گرامی کو جب وہ اسرار خودی کے مختلف اشعار مشورے کے لیے بھجواتے تھے تو بطور خاص انھیں لکھتے تھے کہ: ''ان اشعار کو دشمن کی نظر سے دیکھیں''۔ یہ وسعت قلبی مشکل ہی سے کسی اور شاعر میں ملے گی۔ گرامی کی ناز برداری انھوں نے اس لیے کی کہ انھیں فارسی زبان اور محاورے پر جو عبور تھا وہ اس زمانے میں نایاب ہو چلا تھا۔ علاوہ ازیں گرامی کو فارسی کے جتنے اشعار یاد تھے شاید ہی کسی اور کو ہوں۔ اس لیے وہ گرامی کی قدر کرتے تھے اور ان سے اپنے اشعار کو بہتر بنانے میں مدد لیتے رہتے تھے۔ جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ اقبال کو فارسی پر اتنی مہارت ہو گئی کہ وہ مشورہ سخن سے بے

نیاز ہو گئے۔

اقبال کی اردو شاعری میں بڑی باکمال نظمیں موجود ہیں۔ بانگ درا کی مختصر نظموں میں حیران کن تنوع اور بڑی دلکشی ہے جبکہ بال جبریل کی طویل نظموں میں بڑی گہرائی اور عظمت ہے۔ ضرب کلیم کی نظمیں، پختگی فن کا لازوال کارنامہ ہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری بھی پوری طرح ان کی بہترین اردو شاعری کی ہم پلہ ہے بلکہ بعض خصوصیات میں اردو شاعری سے بڑھ گئی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں پہلے عربی کی تعلیم کا زوال ہوا اور پھر جب انگریزوں کی آمد کے بعد پنجاب میں فارسی کی بجائے اردو کو رائج کیا گیا تو فارسی کی اہمیت اور بھی کم رہ گئی۔ قیام پاکستان کے بعد کئی سال تک سکولوں میں دو یا تین سال تک ہر طالب علم کو عربی یا فارسی میں سے کوئی ایک زبان سیکھنی پڑتی تھی تو فارسی زبان سے طالب علموں کا رابطہ کسی قدر بحال تھا مگر اب تقریباً چالیس سال سے فارسی کی تدریس کالجوں میں آپشنل تک محدود ہو گئی ہے۔ طالب علم فارسی بالکل نہیں سیکھتے۔ سعدی کی چند حکایتوں کے اردو تراجم رٹ لیتے ہیں اور امتحان میں اچھے نمبر لے کر پاس ہو جاتے ہیں مگر قابلیت کا یہ حال ہے کہ کسی آسان نادیدہ مصرعے یا فقرے کا اردو ترجمہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

ان حالات میں پاکستان کے قومی شاعر اور تصور پاکستان کے خالق اقبال کا فارسی کلام کون پڑھے اور سمجھے گا؟ سچ تو یہ ہے کہ اب ان کا اردو کلام بھی آسان ترین شرحوں کے ذریعے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ فارسی کلام کی تفہیم کا مسئلہ اور بھی دشوار ہے اگرچہ اقبال کی فارسی سبک ہندی کے فارسی شعرائی مثلاً عرفیؔ، نظیریؔ، صائبؔ، بیدلؔ اور غالبؔ وغیرہ کے مقابلے میں آسان ہے تاہم جب تک فارسی زبان کے قواعد اور محاورے پر دسترس نہ ہو، اسے سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اندریں حالات اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اقبال کی فارسی کلام کا صحیح اردو ترجمہ شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں کوشش ہو چکی ہے مثلاً اقبال اکیڈمی نے تسہیل پیام مشرق اور تسہیل زبور عجم وغیرہ شائع کی ہیں مگر اہل عمل ان کے معیار سے مطمئن نہیں ہیں۔ اقبال کے قارئین کی یہ خواہش ہے کہ کوئی ادارہ اقبال کے تمام فارسی کلام کا بامحاورہ اردو ترجمہ (فرہنگ کے بغیر) شائع کرے تاکہ تفہیم اقبال کے در وا ہوں۔

میں فی الحال 'پیام مشرق' کی ایک مشہور نظم اردو ترجمے کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اسی عنوان پر اقبال نے اردو میں بھی ایک نظم لکھی ہے۔ دلچسپی کے لیے اردو نظم کے بعض اشعار بھی تقابلی مطالعے کے لیے درج کیے جا رہے ہیں۔

کرمکِ شب تاب

یک ذرہ ای بے مایہ متاعِ نفس اندوخت　　شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

واماندہ شعائے کہ گرہ خورد و شرر شد　　از سوز حیات است کہ کارش ہمہ زر شد
دارائے نظر شد

پروانہ بیتاب کہ ہر سو تگ و پو کرد　　بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترکِ من و تو کرد

یا اختر کے ماہ مینے بہ کمینے　　بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد

از چرخ برینے

یا ماہِ تنک ضو کہ بیک جلوہ تمام است ماہے کہ برو منتِ خورشید حرام است
آزادِ مقام است

اے کرمکِ شب تاب سرا پائے تو نور است پروازِ تو یک سلسلہ غیب و حضور است
آئینِ ظہور است

در تیرہ شباں مشعلِ مرغانِ شب استی آن سوز چہ سوز است کہ در تاب و تب استی
گرمِ طلب استی

مائیم کہ مانند تو از خاک دمیدیم دیدیم تپیدیم نہ دیدیم تپیدیم
جائے نہ رسیدیم

گویم سخنِ پختہ و پرورده و تہ دار از منزلِ گم گشتہ مگو پائے برہ دار
یک جلوہ نگہ دار

.....

اردو ترجمہ

جگنو

رات کو چمکنے والا کیڑا

۱۔ ایک حقیر ذرے نے زندگی کی متاع فراہم کی۔
محبت نے اس کے اندر اتنی حرارت بھر دی کہ اس نے پروانگی سیکھ لی۔
اور شب کی وسعت کو روشن کر دیا

۲۔ یہ (سورج سے) بچھڑی ہوئی کوئی شعاع ہے جس نے اپنے آپ کو کشمکش میں ڈالا اور چنگاری بن گئی۔
یہ اسی سوز حیات کا فیض ہے کہ وہ ایک قیمتی چیز بن گئی
اور صاحب نظر ہو گئی

۳۔ یہ کوئی بے چین پروانہ ہے جس نے ہر طرف بھاگ دوڑ کی۔
اس نے شمع پر اپنے آپ کو یوں جلایا کہ سراپا شمع بن گیا۔
من و تو کا فرق مٹا دیا۔

۴۔ یا یہ چھوٹا سا ستارہ ہے جو چمکتے ہوئے چاند کے تعاقب میں زمین کے بہت نزدیک آ گیا ہے۔
اونچے آسمان سے۔

۵۔ یا یہ تھوڑی سی روشنی دینے والا چاند ہے جو روشن ہوتے ہی کمال پر پہنچ جاتا ہے۔

ایسا چاند۔۔۔جس کو سورج کا منت پذیر ہونا حرام ہے۔
اور مقام کی پابندی سے آزاد ہے۔

۶۔ اے رات کو روشن کرنے والے کیڑے تو سر سے پاؤں تک نور ہے۔
تیری پرواز غائب ہونے اور ظاہر ہونے کا تسلسل ہے۔
(اور) اظہار کا طریقہ یہی ہے۔

۷۔ تو تاریک راتوں میں رات کے پرندوں کے لیے مشعل ہے۔
وہ سوز کس طرح کا سوز ہے جس نے تجھے روشنی اور حرارت دے رکھی ہے۔
اور کسی جستجو میں محو کر رکھا ہے؟

۸۔ ہم بھی تیری طرح مٹی سے زندگی پاتے ہیں۔
(حقیقت) نظر آتی ہے تب بھی تڑپتے ہیں اور نظر نہیں آتی تب بھی تڑپتے ہیں۔
لیکن مقصد تک نہیں پہنچ پاتے۔

۹۔ میں تم سے ایک پختہ، سوچی سمجھی اور گہری بات کہتا ہوں۔
کھوئی ہوئی منزل کے بارے میں تاسف نہ کرو.....راستہ طے کرتے رہو۔
اور اس روشنی کو پیش نظر رکھو۔

اگرچہ فارسی اور اردو زبانیں ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اور ایک ہی لسانی خاندان (ہند آریائی) سے تعلق رکھتی ہیں اس کے باوجود بہر حال الگ الگ زبانیں ہیں اس لیے مشابہت کے باوجود ان کے محاورہ و روزمرہ میں بہت کچھ عدم مشابہت بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں شاعری کی زبان شاعر کی ساختہ پرداختہ ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ ٹھوس نثر کی طرح بہت واضح ہو۔ اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پابند ترجمے سے بامحاورہ ترجمہ زیادہ بہتر اور موثر ہوتا ہے چنانچہ میں مذکورہ نظم کا بامحاورہ ترجمہ پیش کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔

جگنو

۱۔ ایک حقیر ذرے نے اپنی زندگی کی شعاع کو یکجا کیا۔ اپنی ذات کو محبت میں اتنا جلایا کہ پروانگی سیکھ لی اور تاریک شب کو چمکا دیا۔
۲۔ شاید یہ سورج سے بچھڑ جانے والی کوئی متاع ہے جو گرمی عشق کی بدولت چنگاری بن گئی اور اسی وجہ سے صاحب نظر ہو گئی۔
۳۔ یا یہ کوئی مضطرب پروانہ ہے جس نے بہت تگ و دو کے بعد خود کو شمع پر یوں جلایا کہ سراپا شمع بن گیا اور من و تو کا فرق مٹا ڈالا۔
۴۔ یا یہ کوئی ننھا سا ستارہ ہے جو بلند آسمان سے چمکتے ہوئے چاند کا تعاقب کرتے ہوئے زمین کے بالکل نزدیک آ گیا ہے۔
۵۔ یا یہ چھوٹا سا چاند ہے جو روشن ہوتے ہی مہ کامل بن گیا ہے۔ ایسا چاند جو سورج کا احسان مند نہیں ہوا اور قیدِ مقام سے آزاد رہا۔
۶۔ اے رات کو روشن کرنے والے کیڑے تو سراپا نور ہے۔ تیری پرواز غیب و حضور کا ایک سلسلہ ہے اور اظہار ذات کا طریقہ یہی ہے۔
۷۔ تاریک راتوں میں تو پرندوں کی مشعل ہے۔ تیرا سوز کیسا سوز ہے جس نے تجھے روشنی اور حرارت بخش رکھی ہے اور جستجو میں محو کر

رکھا ہے۔

۸۔ ہم بھی تیری طرح خاک سے پیدا ہوتے ہیں۔حقیقت کے جلوے کو دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں، دونوں صورتوں میں تڑپتے ہیں اور حصول مقصد سے محروم رہتے ہیں۔

۹۔ میں تم سے ایک پختہ، آزمودہ اور گہری بات کہتا ہوں۔کھوئی ہوئی منزل کو بھول جاؤ۔راستہ طے کرتے رہو اور روشنی کو پیش نظر رکھو۔

نظم بہت حد تک واضح ہے اور ترجمہ اصل نظم کے تاثر کو کسی حد تک ہی سہی، اردو زبان کے قارئین تک پہنچا دیتا ہے۔اگرچہ نظم سے نثر میں ترجمہ کرنے سے شاعری کی روح قالب سے نکل جاتی ہے مگر فارسی نظم سے براہِ راست استفادہ نہ کر سکنے کی صورت میں یہ بھی غنیمت ہے۔علامہ اقبال کی اردو نظم جگنو (مشمولہ بانگ درا) دسمبر 1904ء میں لکھی گئی تھی۔پیامِ مشرق کی زیرِ نظم کا قطعی سال معلوم نہیں لیکن یہ 1920ء کے اردگرد لکھی گئی ہوگی۔اردو نظم 'جگنو' فارسی نظم 'کرمک شب تاب' سے بہت مختلف ہے اور دونوں کا موضوع بھی ایک دوسرے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔اردو نظم اس زمانے میں لکھی گئی جب اقبال وحدت الوجودی تھے اس لیے اس نظم کے آخر میں وحدت الوجود کی تبلیغ کی گئی ہے جبکہ فارسی نظم کی تخلیق سے پہلے وہ اسرار خودی اور رموز بے خودی کی صورت میں اپنا نظریہ زندگی پیش کر چکے تھے اس لیے دونوں کا موازنہ اپنے تضادات کی وجہ سے دلچسپی کا باعث ہے تاہم اردو نظم کے یہ دو شعر فارسی نظم میں دلچسپ معلوم ہوں گے۔

آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ　　یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

.....

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی　　نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

فارسی کی نظم سے مندرجہ ذیل بند پیش نظر رکھیے:

یا اختر کے ماہ مہینے بہ کمینے　　نزدیک تر آمد بہ تماشائے زمینے
از چرخ بریئے

اے کرمکِ شب تاب سراپائے تو نور است　　پروازِ تو یک سلسلہ غیب و حضور است
آئینِ ظہور است

اردو فارسی نظموں میں بڑی مشابہت ہے لیکن دونوں ایک دوسرے کا چربہ نہیں ہیں۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی شاعر دو زبانوں میں لکھتے ہوئے ایک خیال کو بالکل ہی مختلف انداز سے پیش نہیں کر سکتا۔

ہر زبان کا مزاج، بحر اور ہیئت کا اختلاف وغیرہ تاثر میں فرق پیدا کر دیتے ہیں۔فارسی نظم 'کرمک شب تاب' ہیئت کی ندرت کا نمونہ ہے جس کے ہر بند کے پہلے دو مصرعے چار چار ارکان پر مشتمل ہیں جبکہ ہر تیسرا مصرع فقط دو ارکان کا ہے۔قافیہ کی ترتیب کے لحاظ سے نظم کو مثلث قرار دیا جا سکتا ہے لیکن تیسرے مصرعے کا اختصار نظم کو ایک غیر روایتی مستزاد کی سی شکل دیتے دیتا ہے۔پیامِ مشرق کی متعدد نظمیں ہیئتی اعتبار سے جدت کی حامل ہیں اور قافیوں کی نئی نویلی ترتیبیں انھیں بہت خوش آہنگ بنا دیتی ہیں جس کی وجہ سے نظموں کی قرأت بہت پُر لطف معلوم ہوتی ہے۔

◆◆◆

اقبال سے شناسائی

ڈاکٹر انور سدید

شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال سے میری شناسائی کی ابتداء تحریکِ پاکستان کے حوالے سے ہوئی تو میں نے اپنی چاروں جانب قومی تحریکوں کا ولولہ انگیز ہنگامہ بپا دیکھا۔ تحرّک کی اس فضا میں اقبال ایک ایسی مرکزی شخصیت تھا، جس کے افکار و اشعار نے فضا میں سب سے زیادہ ارتعاش پیدا کر رکھا تھا۔ اور پھر اس ارتعاش میں جب مسلم لیگ کا آل انڈیا اجلاس الہ آباد میں 1930ء میں ہوا تو اس نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کیلئے زمین ہموار کر دی اور 1940ء کی ''قرارداد'' لاہور نے اس مطالبے کو استحکام عطا کر دیا۔ اگرچہ اس وقت اقبال دنیا میں موجود نہیں تھے لیکن اجلاس لاہور میں ان کی روح کی موجودگی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میری عمر 12 سال (پ دسمبر 1928ء) تھی اور اقبال کا مطالعہ میرا جزوِ حیات بن چکا تھا۔ میں ان کے اشعار کی پوری تفہیم سے قاصر تھا لیکن سکول کے ثانوی درجے میں میرے اردو کے استاد مولوی محمد بخش کلامِ اقبال کی املاء کراتے اور ان کے اشعار کا مفہوم سمجھاتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ باتیں آسمان سے اتر رہی ہیں اور ان میں مستقبل کو کامیاب بنانے کا پورا عمل موجود ہے۔ اس سب کے باوجود اقبال سے یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔

اقبال سے میری ملاقات تو طفولیت کی بیداری سے بھی شاید قبل ہوئی تھی۔ کیفیّت اس اجمال کی یہ ہے کہ میرے والد گرامی مولوی امام الدین شب بیداری کیلئے اٹھتے تو مثنوی مولانا روم کے ساتھ اقبال کا کلام بھی پڑھتے۔ ان کی زیرِ لب آوازرات کے سناٹے میں گونج تو پیدا نہ کرتی تاہم مجھے اکثر سوتے سے جگا دیتی۔ میں دیکھتا کہ والد گرامی اقبالؔ کے اشعار پڑھ رہے ہیں اور مسلسل رو رہے ہیں۔ درمیان میں کہیں وقفہ آ جاتا، تب بھی وہ چپ نہ ہوتے بلکہ سسکیاں لیتے رہتے۔ میں اس زمانے میں والد صاحب کی آواز کا تعاقب کرتا تو اقبالؔ کے بہت سے اشعار زبان پر جاری اور قلب میں پیوست ہو جاتے۔ چنانچہ تعلیم کے ساتویں درجے میں گورنمنٹ ہائی سکول کی ''بزم ادب'' میں، جس کا میں سیکرٹری تھا، مجھے مضمون لکھ کر پڑھنے کیلئے کہا گیا اور یہ دریافت کیا گیا کہ میرا موضوع کیا ہوگا تو میں نے بلا توقّف کہا ''اقبال''، مولوی پیر بخش جو کہ میرے استاد اور ادبی راہنما تھے، سن کر خوش ہوئے اور بولے۔

''اقبال پر تم شاید اچھا مضمون نہ لکھ سکو''۔

لیکن مجھے اعتماد تھا کہ ثانوی درجے کے دوسرے طلباء کے مقابلے میں میری کارکردگی بہتر ہوگی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بڑے بھائی فیروز الدینؔ نور انہیں دنوں علاّمہ اقبال پر چراغ حسن حسرت کی ایک کتاب لائے تھے جو انہوں نے بچوں کیلئے لکھی تھی اور میں نے اس کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اب یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہے کہ میرے اس بڑے بھائی نے علاّمہ اقبال کی کتابیں ''بانگ درا''، ''بال جبریل''، ''ضرب کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' ایک ضخیم کاپی میں اپنے قلم سے کتابت کر رکھی تھیں اور وہ مطبوعہ نسخوں کی بجائے کلامِ اقبال اس کتاب سے ہی پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ صبح کی نماز کے بعد ہمارے گھر کی بیٹھک میں مولوی محمد بخش صاحب اور مرزا ہاشم الدین صاحب

جو میرے استاد تھے، والد صاحب کے ساتھ مثنوی مولانا روم اور کلام اقبال پر باہمی تفہیم کے لئے گفتگو کرتے تو بڑے بھائی فیروز صاحب ان کی باتیں غور سے سنتے۔ اس محفل میں ہی اقبال کی وفات کی خبر 21 اپریل کو پہنچی تو سب رونے لگے اور مرزا ہاشم الدین اقبال کے جنازے میں شرکت کیلئے لاہور گئے تو والد گرامی نے میرے بڑے بھائی کو بھی ان کے ساتھ روانہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال سے میری شناسائی میں فیروز الدین صاحب کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام اقبال میرے پاس اب بھی موجود ہے۔

ذکر سکول میں مضمون نویسی کا ہو رہا تھا۔ میں نے چراغ حسن حسرت کی کتاب سے استفادہ کیا اور جلسے میں مضمون پڑھا تو مجھے سب سے زیادہ داد مولوی پیر بخش صاحب نے دی اور مجھے کلاس لائبریری کا انچارج بنا دیا اور ایک کتاب گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔ میری دلچسپی اقبال پر کتابوں میں زیادہ تھی۔ اسی طرح ہندو ہائی سکول ڈیرہ غازی خان میں بیت طرازی کا مقابلہ ہوا تو جو اشعار میں نے پڑھے وہ سب اقبال ہی کے تھے اور ہندو اساتذہ حیران رہ گئے کہ زیریں ثانوی درجے کا ایک طالب علم کس فراوانی سے اقبال کے اشعار اس مقابلے کی ''الف بائی'' ضرورت کے تحت پڑھ رہا ہے۔

(میں نے اپنی زندگی میں اس نوع کا صرف ایک ہی طالب علم دیکھا ہے اور وہ روزنامہ ''نوائے وقت'' کے سابق ڈپٹی چیف ایڈیٹر جناب ارشاد احمد عارف کا صاحبزادہ ہے۔ سردار محمد ڈوگر کے دولت کدے پر انہوں نے بھری محفل کو جس میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، سعید بدر، اعزاز احمد آذر اور متعدد نامی گرامی شعراء موجود تھے، چیلنج کیا کہ کسی شاعر کا کوئی شعر پڑھیے اور بیت طرازی کے اصول کے مطابق وہ آخری حرف سے صرف اقبال کا شعر پیش کرے گا۔ یہ چیلنج کسی نے قبول نہ کیا تو ابن ارشاد عارف نے اقبال کے ایک شعر سے بیت طرازی کا آغاز کیا اور فریق مخالف کا کردار بھی خود ادا کیا اور دونوں جانب سے اقبال کے اشعار پڑھے اور بے پناہ داد سمیٹی)

اس اجمال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ میں نے اقبال کا ذکر سب سے پہلے اپنے گھر میں اور پھر سکول میں سنا۔ میرے اساتذہ نے ذوق اقبال کو پروان چڑھایا اور پھر درجہ بدرجہ، روز بروز اقبال سے شناسائی بڑھتی گئی اور کلام اقبال کی ہر قرأت زندگی کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے اور لفظ و معنی کی ایک نئی کائنات آشکار کرنے لگی۔ اہم بات یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے مجھے ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی سطح کا مقالہ لکھنے کی اجازت دی اور مجھے اقبالؔ کو تحقیقی و تنقیدی نظر سے بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا تو یہ احساس نمایاں ہوا کہ اقبال تو ایک ایسا مینارۂ نور ہے جو زندگی اور ادب کے بے شمار آفاق کو روشنی اور توانائی عطا کر رہا ہے اور الطاف مشہدی کا یہ مصرع مبنی بر حقیقت ہے کہ ''حشر تک دنیا پھرے گی محور اقبال پر''

میں نے متذکرہ کتاب میں ''اقبال کی تحریک'' کے عنوان سے ایک الگ باب لکھا، ایک کتاب ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' تالیف کی اور یہ دونوں کتابیں قومی ایوارڈ کی مستحق قرار دی گئیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال شناسی کے سلسلے میں دو کتابیں رسالہ ''اوراق'' اور رسالہ ''ادبی دنیا'' کے حوالے سے مرتّب کرنے کا اعزاز مجھے عطا کیا۔ میرے لئے طمانیت کی بات یہ ہے کہ عمر عزیز کے اسّی سے زیادہ سال گزار لینے کے بعد بھی اقبال سے شناسائی کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس وقت میرے ذاتی کتب خانے میں ''اقبالیات'' کے موضوع پر چار سو سے زائد کتابیں موجود ہیں اور ''اقبالیات'' پر نئی کتاب چھپنے کی خبر ملتی ہے تو میں اسے حاصل کرنے اور پورے مطالعے کے بعد اسے کتب خانے میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اقبال سے شناسائی کے اس سلسلے کو آپ میری طالب علمانہ زندگی کا اقبال سے مضبوط بندھن قرار دے سکتے ہیں۔

◆◆◆

اقبال کا فلسفہ خودی اور فکرِ حاضر

صائمہ نورین بخاری

اقبال فہمی اور اس فہم کی ترسیل کی اہمیت سے ہر وہ صاحبِ ذوق واقف ہے جس پر اقبال شناسی کے در قدرت نے کھولے ہیں۔ ''اقبالیات'' نہ صرف اردو اور فارسی بلکہ بین الاقوامی زبان وادب میں ایک دبستان کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اقبال کے کلام اور فلسفہ میں عہد بعہد اثرات کی حسن آفرینی کے علاوہ ایک ایسا گہرا فلسفیانہ قرینہ وسلیقہ ملتا ہے، جس کی بناء پر اقبال کی شاعری کل کی شاعری بھی قرار پاتی ہے اور آج کی بھی۔

غالب اور رومی نے اپنے دل نواز کلام میں جس علمی وعقلی، حسیاتی وقلبی تفہیم کی بنیاد رکھی تھی۔ اقبال نے اسی بنیاد پر ایک عالی شان عمارت تعمیر کی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال شناسی کی تڑپ جس دل میں پیدا ہو جائے وہ خودی کی وسعت، تصوف وعشق، بلند نگاہی، حرکت وتغیر اور پیغامِ ابدی کی دلآویز دنیاؤں میں خود کو گم پاتا ہے۔

فکر اقبال، تصوفِ اقبال، اقبال اور خودی، پیامِ مشرق ایسے گوناگوں موضوعات پر بے شمار شارحین اور ناقدین ومحققین نے قلم اٹھایا اور اقبال مندی کی مثالیں پیش کیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین حکمتِ اقبال میں تصور خودی کا مقام میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے تمام تصورات خود ایک دوسرے کے ساتھ عملی اور عقلی رشتے میں منسلک ہیں اور اقبال کا فکر ایک ایسے نظامِ حکمت کی صورت میں ہے جس کا ہر تصور دوسرے تمام تصورات سے عملی، عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا ہے۔ جب تک ہم اس نظامِ حکمت کے مرکز یعنی تصورِ خودی کو ٹھیک سے نہ سمجھیں ہم اقبال کے کسی تصور کو بھی ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکتے.....''

کہا جاتا ہے کہ اگر انفرادیت کی بنیادیں مضبوط ہوں تو مانوس تجربوں میں بھی سچا شاعر کوئی نہ کوئی نئی بات ڈھونڈ نکالتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کے فلسفیانہ عقائد واضح اور روشن ہوں۔ بقول اقبال ؎

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

اقبال کا دور ایک سیاسی کشمکش اور بین الاقوامی انتشار کا دور تھا۔ انہوں نے 1905ء سے 1908ء تک اقبالؔ کے لئے یورپ کا سفر وقیام کیا جو بہت اہمیت کا حامل رہا۔ یورپ سے واپسی پر اقبال نے باقاعدہ فلسفہ خودی پیش کیا۔ یہی ''فلسفہ خودی'' ان کے عارفانہ افکار اور حکیمانہ کلام کی بنیاد ہے۔ ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت سے تقریباً چھ سات ماہ پہلے انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں ''عجمی تصوف اور اسلام'' میں لیکچر کے دوران اقبالؔ نے ''خودی'' کی وضاحت اس طرح فرمائی۔

> ''تصوف کے لٹریچر میں جہاں کہیں خودی کو مارنے کا ذکر آیا ہے وہاں عوام اس کے معنی غرور وتکبر کرتے ہیں، جو

حقیقتاً رذائل میں سے ہے اور اس سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے، لیکن متصوفین نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا، بلکہ احساسِ ذات ''انا'' اور ''میں'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے، اپنے نفس کی نفی کر دے، تب معرفت کی منزل پر فائز ہو سکتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قائم رہے، بلکہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے، جو اس کے لئے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور میں نہیں آ سکتا''۔

اقبال فرماتے ہیں۔ خودی کا وجود خدا سے الگ نہیں۔ خودی اپنے عمل کی رو سے ظاہر ہے لیکن اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ خودی خدا کے رازوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو اک راز تھا سینۂ کائنات میں (بال جبریل)

گویا جس نے اپنے نفس (ناطقہ) کو جان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا اور اس ضمن میں ''ایمان و یقین'' ہی اقبال کے مربی و مرشد ہیں۔ فقر و استغنا خودی کی سب سے بڑی شرط ہے۔ کیوں کہ فقر کا سب سے بڑا مقصد عمل ہے۔ قرآنی فقر، تسخیر کائنات کی منزلیں واضح کرتا ہے اور احتسابِ ذات کا دائرہ فراہم کرتا ہے۔ مسلمان کے لئے فقر ہی امیری ہے۔ شانِ قلندری ہے۔ نگاہِ فقر کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے؟ خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

اقبالؔ کے فلسفہ خودی کا محرک مسلمانوں کے بے عملی، تقدیر پرستی، اسلاف فراموشی اور عمل سے گریز تھا۔ مردہ تہذیبوں کے آثار یہی عیاں کرتے ہیں کہ جب دلوں سے نئی امنگیں، نئی آرزوئیں اور عزتِ نفس ختم ہو جائے مسلسل پیکار کو زندگی نہ سمجھا جائے۔ مقصد کوشی کو زیست میں فروغِ عمل نہ ملے تو قومیں فکر و عمل کے میدان میں دم توڑنے لگتی ہیں۔ حرکت اور جدوجہد اور فقر سے عاری، اغیار کا دستِ نگر ہونا، زوالِ ذات ہے۔

فریڈرک نطشے (1844-1900) جرمنی کا بلند پایہ فلسفی تھا۔ جو ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن میں پادری خاندان کی نسبت سے اس کا رجحان مکمل طور پر مذہبی رہا مگر بتدریج اس کی سوچ ملحدانہ نظریات میں ڈھلتی رہی۔ یونیورسٹی میں پڑھانے کے دوران اس نے دعویٰ کیا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے خدا کی بجائے اس خدا کی تلاش میں ہے جو زمین پر خود اتر کر آئے اور دکھی انسانیت کو درد و غم سے، آنسوؤں، آہوں اور سسکیوں سے نجات دلائے۔ دراصل وہ نوجوانی میں فوجی خدمات کے دوران گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہو گیا تھا اسی لئے بے چارگی، دکھ اور تکلیف نے اس کی طبیعت میں آزردگی کی تاریکی بھر دی تھی۔

اس کے بارے میں ''بالِ جبریل'' میں اقبال لکھتے ہیں ؎

اگر وہ ہوتا مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

نطشے کی شوپن ہار، افلاطونؔ اور ارسطوؔ پر تہلکہ خیز تنقید، روحانیت اور اخلاقیات پر شدید نکتہ چینی سے اسے ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت ملی۔ اس نے اپنی کتابوں خصوصاً ''ارادۂ قوّت'' ''زرتشت نے کہا''، ''خیر و شر سے ماورا'' میں فوق البشر کے تصوّرات پیش کیے لیکن یہ ''سپر مین'' یا ''فوق ابشر'' ہرگز اقبال کا ''انسانِ کامل'' نہیں۔ کیوں کہ نطشے کا ''فوق ابشر'' اخلاقیات کی غلامی سے دور رہنا چاہتا

ہے۔لہٰذا ''مردِ برتر'' اور ''مردِ کامل'' دو مختلف تصورات ہیں۔ محمد شمس الدین صدیقی اپنے مضمون ''اقبال اور نطشے'' میں لکھتے ہیں :

''نطشے کے خیالات اور اقبال کے خیالات میں جو مماثلتیں اور مشابہتیں ملتی ہیں وہ دراصل نطشے اور اسلام کی تعلیمات کی مشابہتیں اور مماثلتیں ہیں اور ان کے لئے اقبال نطشے کے مرہونِ احسان نہیں بلکہ کلام اللہ اور مولانا روم کی تعبیرِ قرآن کے رہینِ منت ہیں''۔

رومی کے لئے اقبال نے ''دانائے اسرارِ قدیم'' اور ''پیرِ عجم'' کے القابات استعمال کئے ہیں۔اور وہ رومی کے باطنی تعلیمی پہلو سے متاثر نظر آتے ہیں۔کیوں کہ مولانا روم نے بھی ایسے دور میں جنم لیا جب انسانیت کا زوال، عروج پر تھا۔رومی 1207ء میں پیدا ہوئے۔ 1219ء میں چنگیز خان کے حملوں نے مسلمانوں کی بربادی کا آغاز کر دیا تھا۔صلیبی جنگیں، منگولوں کے بے رحمانہ حملے اور کچھ عرصے کے بعد 1256ء میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں دوسری بار بڑی تباہی کے باعث 1258ء میں خلافتِ بغداد کا خاتمہ۔تیسری جانب ہسپانیہ میں 1266ء میں مسلم سلطنت کا اختتام، یہ ایک بھیانک ترین دور تھا۔فلسطین، ہسپانیہ اور بغداد عبرت ناک علمی و مادی نقصانات اٹھا رہے تھے۔علم و حکمت کے بے شمار خزینے، کتب خانے تباہ اور مسلمانوں کے اذہان برباد ہو چکے تھے۔حنفی و شافعی مسلکوں کے باہمی اختلافات، منگولوں سے ساز باز اور حملہ آوروں کی کثرت نے مسلمانوں کو مایوس کر دیا تھا یہی وہ وقت تھا جب مولانا روم نے اسلام کی علمی، روشن اور واضح تعبیر پیش کی۔مایوس کن ماحول کو ختم کر کے ایک علمی و روحانی تحریک سے کم مائیگی کے احساس کو ختم کیا۔''مثنوی مولانا روم'' کی انہی خوبیوں نے اقبال کو رومی کا گرویدہ بنا دیا۔اور اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے کہ رومؔی اور ان کے عہد کے خارجی اور داخلی حالات تقریباً ایک جیسے تھے۔انہوں نے مولانا روم کی غائبانہ مریدی کو اپنا شعار بنا لیا۔اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ

''میں نے مطالعہ کتب ترک کر دیا ہے اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔''

کیوں کہ رومؔی کے ہاں بھی خودی کا استحکام ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبال اور مولانا روم کے ہاں تقدیر کے مفہوم کی مماثلت اور نئی تعبیر ملتی ہے۔دونوں کے نزدیک روحِ انسانی خود اپنی تقدیر کی معمار ہو سکتی ہے۔

رومی اور اقبال خودی کی تقویت صرف عشق اور جذبے سے چاہتے ہیں۔عقل و خرد کے آگے عشق کی دنیا لامتناہی، عرفانی و جدانی سلسلوں سے منسلک ہے۔کیفیتِ عشق نہ ہو تو طلب و جستجو، عرفان و وجدان سب بے معنی ہیں۔''خودی'' دراصل ایک محرک جذبے کا نام ہے۔وہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسانی ذہن و دل میں آرزو کے حصول کی تڑپ اور نئی دنیاؤں کی دریافت میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے اور بقول اقبال خدا بھی بندے سے اس کی رضا جاننا چاہتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کر ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ Ego نہیں۔انانیت نہیں۔انسان کی انفرادی ہستی کو فنا کر دینا نہیں بلکہ اسے قائم و بلند رکھنا خودی ہے۔ذوقِ پرواز خودی ہے۔نئے جہانوں کی تلاش خودی ہے۔کیوں کہ اقبال کی نظر میں یہ کائنات موہوم نہیں بلکہ موجود ہے۔اس کا وجود حقیقی نہیں بلکہ ظلّی ہے۔ اقبال تصوف کو بھی دین نہیں بلکہ فلسفہ قرار دیتے ہیں۔اور وحدت الوجود کے اس حصے پر قائم ہیں جس کے معنی ''لاموجود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی اور موجود نہیں'' ہے۔یہی فکرِ حاضر ہے اور اسی فکرِ حاضر کو اقبال کی تلاش ہے۔

◆◆◆

پیار کا امرت رس

پروفیسر جمیل آذر

اظہر جاوید کی کئی تخلیقی جہتیں تھیں۔ وہ ادیب تھا، شاعر تھا، صحافی تھا، افسانہ نویس تھا، نقاد تھا، مدیر تھا اور کالم نگار تھا۔ بہ ایں ہمہ وہ بنیادی طور پر نئے اور منفرد لہجے کا شاعر تھا۔ اس کا بین ثبوت اس کا شعری مجموعۂ کلام ہے جو ''غم عشق گر نہ ہوتا'' کی صورت میں میرے سامنے موجود ہے۔ اس کتاب کے نام سے لے کر کلام تک اس میں حسن و محبت اور عشق و سرمستی کی کرنیں موج زن ہیں۔ میں جب اس کے کلام کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہا تھا تو کبھی مجھے انگریزی شاعر شیلے یاد آتا تو کبھی کیٹس اور ایڈمنڈ سپنسر۔ ان سب میں قدر مشترک حسن، محبت، صداقت اور خیر ہے۔ کیٹس شاعرِ حسن ہے تو شیلے شاعرِ عشق اور سپنسر مصوّرِ حسن۔ اظہر جاوید کے ہاں حسن، محبت اور عشق کے نتیجہ میں جو تلب و ذہن اور جسم و جاں پر گہرے جذبات اور احساسات مرتسم ہوتے ہیں ان کا بھرپور اور پرخلوص شاعرانہ اظہار ملتا ہے۔ اس اظہار میں وہ کسی رکاوٹ اور ہچکچاہٹ (inhibition) کا شکار نہیں ہوتا۔ اپنے محبوب سے ہمکنار ہونے کے بعد جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا بیان دیکھئے وہ کتنے خلوص کے ساتھ کرتا ہے :

جب تم مجھ کو بانہوں میں بھر لیتی ہو — میں نے وقت کو رکتا تھمتا دیکھا ہے
اکثر تیرے جسم کو چھو لینے کے بعد — پوروں پر مہکار کا میلہ دیکھا ہے

.....

اک بار ہاتھ چھو گیا اس کے بدن کے ساتھ — برسوں میں انگلیوں کو یونہی چومتا رہا

وہ نسوانی حسن کا سچا پرستار ہے اور اسے عطیۂ خداوندی سمجھتا ہے۔ یہ نسوانی حسن ہی ہے جس نے تصویرِ کائنات میں رنگ بھر دیئے ہیں۔ وہ وصل سے زیادہ تصوّرِ جاناں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ تصوّرِ جاناں کبھی عشق کی صورت اختیار کرتا ہے تو کبھی درد و غم کی۔ محبوب کی چاہت سے کبھی دل اداس ہوتا ہے تو کبھی شاداب۔ وہ ان تمام لمحوں کو جو محبوب کی سنگت آور صحبت میں گذرے ہوتے ہیں جب بازیافت کرتا ہے، تو ہونٹوں کے افسانے، آنکھوں کے مے خانے، موسموں کے لمس کی خوشبوئیں اپنی پوروں میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور پھر اس کے خیالات و تصوّرات کے محل سرا میں عینی، مومل، کومل، ہیر، سوہنی اور سسّی جلوہ گر ہونے لگتی ہیں۔ حسن کی دیویوں کی، دیکھئے، وہ کس خوبصورتی سے تعریف کرتا ہے:۔

تمام عمر کی بے چارگی کا حاصل ہیں — یہ چند شعر جو مقبول، ہیں حسینوں میں

.....

دھڑکنیں دل کی پھر غزل خواں ہیں　　کیا کہیں تیری زلف لہرائی؟

.....

شوخ دھنک، گل رنگ فضا یا بادِ صبا　　سب نے تیرے گھر کا رستہ دیکھا ہے

.....

میں نے جن غزلوں میں اس کو پیار سے موہل کہا　　اس نے لکھا ہے، اسے وہ شاعری اچھی لگی
جانے کیا کہہ کر گئی ہے تیری آنکھوں کی کرن　　رات صحرا میں بھٹکتی چاندنی اچھی لگی

.....

اس بدن کے لمس میں اظہر یہ کیسا کیف ہے　　انگلیاں ہیں مضطرب، خوشبو چرانے کے لیے

.....

کیا تمہیں بھی کسی بدن کی باس　　رات بھر بے قرار رکھتی ہیں

اظہر جاوید جہاں حسن وعشق کی وادی کا سیّاح ہے، وہاں وہ زندگی کا ناقد بھی ہے۔ وہ اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ ہمارے وطن عزیز کو کبھی مارشل نے اور کبھی نام نہاد جمہوریت نے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ سیاسی مہم جوؤں نے کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی غریبوں کے نام پر اس ملک کے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں کے بیرونِ ملک اربوں روپے بنکوں میں محفوظ ہیں۔ وہ سیاست یہاں کرتے ہیں اور عیش وعشرت کا بازار وہاں گرم کرتے ہیں۔ غریب غریب تر ہوتا جارہا ہے اور امیر امیر تر۔ مڈل کلاس روز بروز کمزور ہوتی جارہی ہے۔ مغربی استعماریت ہماری سرزمین پر اپنے پنجے گاڑ رہی ہے۔ ادھر ہمارے حکمران ہوسِ زر میں مبتلا ہیں۔ اس کرب ناک صورتِ حالات کو اظہر جاوید اپنے اشعار میں اس طرح بیان کرتا ہے:۔

پھیل جاتی ہے جہاں کے حکمرانوں میں ہوس　　وہ ہری شاداب ہنستی بستیاں رہتی نہیں

.....

جو بھی حاکم آیا ہمیشہ نعرے دعوے ہی لایا　　لیکن اس طرح بگڑا، آوے کا آوا، رہ جاتا ہے

.....

سنتا ہوں تو ہنس دیتا ہوں، جب یہ لوگ بتاتے ہیں　　برے دنوں کے بعد ہمیشہ اچھے دن بھی آتے ہیں

.....

اے خدایانِ سیاست کوئی سمجھوتہ کرو　　قوم ساری منتظر ہے مسکرانے کے لیے

اظہر جاوید کے ہاں غمِ روزگار پر غمِ عشق کی کیفیّت غالب ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ عشق ہی اس کی ابتدا ہے اور عشق ہی اس کی منزل۔ اس کے ہاں عشق قوتِ حیات (Life Force) بھی ہے اور قوتِ تخلیق (Energy of creation) بھی ہے۔ یہ کتنا حسنِ اتفاق ہے کہ اس کے ادبی رسالہ کا نام بھی ''تخلیق'' ہے۔ کیٹس (Keats) کے ہاں حسن، صداقت ہے، جب کہ اظہر جاوید کے ہاں حسن،

محبت، حیات اور قوتِ تخلیق ہے۔ وہ اہلِ عشق کو سب پر فوقیت دیتا ہے اور انہیں قدر و احترام سے دیکھتا ہے:

جب بھی لکھی جائے گی تاریخ، شہرِ درد کی　　پہلے پہلے ہم سے اہلِ عشق کا نام آئے گا

اپنے عشق کی سرمستی کا اس طرح ذکر کرتا ہے:۔

اتنا پیار دیا ہے اس نے دامن میرا تنگ ہوا　　قدرت کے اس لطف و کرم پر میں حیرت سے دنگ ہوا

.....

جب وہ بانہوں میں سمٹی سب آنسو آہیں ختم ہوئیں　　اب تو شاد آباد ہی رہنا جیون کا اک ڈھنگ ہوا

.....

کبھی ملے جو نہ چاہت تو دل مچلتا ہے　　کبھی کبھی یہی چاہت، اداس رکھتی ہے

.....

وصل کا لمحہ، خوشی کا پل، وفا کی چاشنی　　کس کی قسمت میں یہ اظہر سکھ کی سوغاتیں ہوئیں

اپنی ایک خوبصورت نظم ''شعلہ شبنم لڑکی'' میں تو وہ بڑے واضح طور پر محبت کا نغمہ گاتا ہے اور عشق ہی کو زندگی، روشنی اور شاعری کو قوت متحرکہ (Motor Force) سمجھتا ہے۔

''میں اس کے لہجے کی چاشنی کو
اداس نغموں میں میں گھول ڈالوں
اسے بتاؤں وہ زندگی ہے
وہ روشنی ہے، وہ شاعری ہے''

اظہر جاوید کے ہاں یک طرفہ محبت کا اظہار نہیں بلکہ دونوں طرف سے اس کا اظہار ہے۔ وہ حسن کا پرستار ہے تو حسن اس کا شیدائی ہے۔ وہ بہ ہوش و حواش حسن کا شیدائی اور متوالا ہے لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ حسن بھی اس کا چاہت کا اسیر ہے تو وہ حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور اس عالم حیرت میں حسن کی مدح سرائی کرتا ہے:۔

''سوچتا ہوں اس نے کیوں چاہا مجھے
مجھ میں کیا دیکھا کہ میری ہو گئی

.....

وہ دمکتا جگمگاتا آسماں
وہ بہاروں سے مہکتا گلستان
وہ حسیں قوس قزح دہ کہکشاں
وہ ستاروں سے چنا اک سائباں

وہ تجلّی، وہ اجالوں کا نشاں
وہ جوانی سے لکھی ایک داستاں
وہ تو ہے صبح طرب، لطفِ دوام
وہ سراپا کیف، وہ حسنِ تمام
وہ ہے پُروا، وہ صبا اندام ہے
مہرباں قدرت کا وہ انعام ہے
وہ مچلتی موج ہے وہ لہر ہے (نظم: میں اور وہ)

اظہر جاوید اپنی شاعری میں حسن کے گیت گاتا ہے، نغمے لاتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کے رنگ بھرتا ہے۔ اس کی نظمیں اور غزلیں سندر کومل جذبوں سے معمور ہیں۔ اس کی شاعری کا مرکزی کردار (میں) بھنورے کی طرح پھولوں کا طواف کرتا ہے اور رنگوں اور خوشبوؤں سے اپنی روح کو تازہ کرتا ہے۔ وہ پتنگے کی طرح روشنی کی طرف لپکتا ہے اور اپنے جسم و جاں کو منوّر کرتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کی ہر بات اچھی لگتی ہے؟ فون پر مختصر گفتگو ہو یا عرضِ شوق پر کھلکھلا کر ہنسنا ہو، اس کی غزلوں پر پسندیدگی کا اظہار ہو یا بے ترتیب سی دوستی ہو، اس کا اقرار محبت ہو یا آنکھوں کی کرنیں وہ محبوب کی تمام اداؤں پر دل و جاں سے فریفتہ ہے کیونکہ محبوب کا اپنائیت کے اقرار سے وہ اپنے باطن کو مستنیر کرتا ہے:

میں تو صدیوں سے مقیّد تھا اندھیرے غار میں اس نے جب اپنا کہا تو روشنی اچھی لگی ہے

اظہر جاوید اپنی کائناتِ شاعری کو محبوب کے حسن سے تابناک بناتا ہے، اس کائنات میں آنچلوں کی دھنک ہے تو کہیں گیسوؤں کی مہک، دلدار اٹھکیلیاں ہیں تو کہیں چاند چہروں کی تجلّی، ہونٹوں کی حلاوت ہے تو کہیں آنکھوں کی شرارت۔ اس کا چمنستانِ شاعری حسن و عشق اور لطیف جذبوں سے معمور ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اظہر جاوید کی شاعری پیار کا امرت رس ہے، جو پڑھنے والے کو سرشار کرتی ہے اور اچھی شاعری کا یہی حسنِ کمال ہے۔

◆◆◆

ادارہ ''تخلیق'' تمام قارئین کو درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے مسودوں کو کمپوز کروا کر بھیجیں اور ایک کاپی ای۔میل پر بھی ارسال کریں۔
(ادارہ ''تخلیق'')

نسرین نکہت سبزواری

حمد

جو بھی مل جائے، ہے خوشی تیری
خواب میرے ہیں، زندگی تیری

دل میں کوئی خلش نہیں باقی
زندگی ہے یہ بندگی تیری

درد کی راہ میں شکایت کیا
بے طلب ہے یہ عاشقی تیری

اور کسی آستاں پہ سر نہ جھکے
ہے بہت شرط یہ کڑی تیری

جو ترے نام پر ہوئے مصلوب
ان کو مقصود تھی خوشی تیری

جب ارادہ ہو نیک منزل کا
ساتھ چلتی ہے دوستی تیری

پھر کوئی کام بھی نہیں مشکل
گر ملے ہم کو رہبری تیری

OOO

شاہین (کینیڈا)

نیا سال

گریۂ شبنم رہا جن کا مقدّر
وہ نگوں سر ڈالیاں
خوش رنگ، نکہت بیز پھولوں میں تُلیں

اب کے
جب آنگن میں بادل کُھل کے برسیں
رہگزاروں کی کثافت سے اَٹے چہرے دُھلیں

آنے والے
موسموں کی چاپ سے
گوش برآواز دل کے بند دروازے کُھلیں

OOO

امجد اسلام امجد

وہ ایک بات

دَس میں سے کوئی ایک بھی نمبر ہو گر غلط
ملتا نہیں وہ شخص جسے فون کیجئے
ملتے ہیں راہِ زیست میں جتنے بھی ہم سفر
اُن سے تعلقّات کی نازک سی ڈور کا
ایسا ہی کچھ ہے حال
چُبھ جائے ان کے دل کو اگر ایک بات بھی
اُس سے بنائے جاتے ہیں اُلجھا سا ایک جال

ایسا ہی ایک جال ہے اب اپنے بیچ میں
جس نے ہماری راہ کو کانٹوں سے بھر دیا
مدّت سے اُس کے فون میں محفوظ تھا جو نام
اُس نے بس ایک آن میں ڈیلیٹ [1] کر دیا

Delete (1)

OOO

امجد اسلام امجد

ایسے میں کوئی کیا کرے!

چُپ چاپ اگر کوئی آنکھوں میں ٹھہر جائے
دھڑکن میں سنائی دے سانسوں میں اُتر آئے
اے دوست بتا تُو ہی، ہم روک سکیں کیسے؟
جب آنکھ جھپکنے میں
اک تیر چلے ایسا جو رُوح کی گلیوں میں
بجلی کی طرح کوندے اور سَن سے گزر جائے!

OOO

انور سدید

دریوزہ گر

ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
آیا میری جانب
تو میں نے کھول دیں بانہیں
کہ ان میں وہ سما جائے
مجھے کچھ روشنی دے دے
کہ میں تاریکیوں میں چلتے چلتے
تھک گیا تھا.....
کھو چکا تھا، اپنے رستے کو
گھنیری رات کی تاریکیوں نے
مجھ پہ سایہ ڈال رکھا تھا
میں پیاسا روشنی کا تھا

.....

معاً ٹوٹا ہوا تارہ
مری پلکوں پہ آ بیٹھا
سمیٹے اپنے پر اس نے
مجھے تکنے لگا حسرت بھری نمناک آنکھوں سے
گنوا آیا ہو جیسے روشنی کی ریزگاری ساری رستے میں
تہی دامن کھڑا ہو سامنے
دریوزہ گر بن کر

.....

میں حیراں ہوں
کہوں کیا؟.....آسماں سے ٹوٹ کر
آئے ہوئے مہماں ستارے کو!

OOO

صفدر صدیق رضی

وراثت

میرے بچّو!
تمہارے لئے میں وراثت میں
کیا چھوڑا کر جا رہا ہُوں
وہ حدِّ نظر تک کھلے
بے کنار آسماں کے تلے
نیلگوں لہلہاتے سمندر کے پہلو میں
بارُود کے ڈھیر پر
ایک گنجان آباد شہر
آگ جس کے مسلسل تعاقب میں ہے
میرے ہوتے ہُوئے
یا مرے بعد اگر جل اُٹھے
تو بُجھانے کو نزدیک
خوش قسمتی سے سمندر کا پانی بہت ہے
اس آبِ سکوت آفریں میں روانی بہت ہے

OOO

اعزاز احمد آذر

ماہیئے

کوئی روگ نہ یہ پالے
گالوں پہ کاجل نے
سب راز ہیں لکھ ڈالے

o

سب دیپ بُجھے مَن کے
رُوٹھ گیا ماہی
پائل بھی نہیں چھنکے

o

اب ایسے نہ شرماؤ
کس لیے چُپ چُپ ہو
کچھ بھول تو بکھراؤ

o

یہ رُت ہے گلابوں کی
چِڑ ہے سوالوں سے
اور ضد ہے جوابوں کی

o

میں لاج سے مر جاؤں
پوچھ نہ وہ باتیں
جو تم سے نہ کہہ پاؤں

موسم ہے بہاروں کا
نام سہیلی کا
اور تحفہ ہے پیاروں کا

o

تم پیار حقیقت ہو
کر لو یقین مرا
تم میری ضرورت ہو

o

سر زانو پہ دھرنے دے
دیکھ مرے بابو
مجھے چَین سے مرنے دے

o

پھر دُوری نہ ہو جائے
ڈرتا ہے دل میرا
میرا پیار نہ کھو جائے

o

اک کرم کما ماہی
دیکھ، میں مر جاؤں گی
پردیس نہ جا ماہی

OOO

سرور حسین (انڈیا)

تو جو آ جائے تو.....

عمر کا سیلِ رواں ہے کہ ٹھہرتا ہی نہیں
وقت کے پنجۂ بے رحم سے ہے کس کو مفر
ایک بے رنگ سفر
میری آنکھوں کی سیاہی مرے چہرے کی شکن
ڈھونڈھتی ہے
وہ نئی عمر، شرارت
وہ حسیں شام و سحر
وہ جواں خواب، وہ بے چین نظر
کوئی حسرت، کوئی بے کار سوال
تیرے کوچے سے گزرنے کا خیال
دل دھڑکنے کے جو اسباب ہوا کرتے تھے
کب بھلا لوٹ کر آ پائے ہیں کہ اب
لوٹ بھی آئیں گے وہ بیتے ہوئے پل
پھر بھی کیوں دل میں وہ آتا ہے اک بے ربط خیال
وہ رُکی بات بیاں ہو جائے
کوئی صورت ہی کہیں اب جو عیاں ہو جائے
دل کے ویرانہ میں کچھ رنگ بکھر سکتا ہے
میری صورت نہ سہی دل تو سنور سکتا ہے
تو جو آ جائے تو پھر وقت بدل سکتا ہے

OOO

سلیمان خمار (انڈیا)

مشورہ

تو ایسا کیجیے.....
اک ایک سورج کو جلا دیجیے
سمندر کی سیہ آنکھوں میں خنجر گھونپیے
گرجتے آبشاروں کے گلے میں
خامشی کا کالا پھندہ ڈالیے
زمیں کے پیٹ میں پکتے ہوئے لاوے کو زخمی کیجیے
خلاء میں تیرتے
نیلے، زہریلے دھوئیں کے پاؤں میں زنجیر پہنا دیجیے
وقت کے پھنکارتے ناگوں کو
دانتوں سے چبا کر تھوک دیجیے
تو ہو سکتا ہے جینے کی کوئی صورت نکل آئے

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکا)

اُس گھر کی ٹوٹی کھڑکی سے

چھٹی گلی میں سیدھے ہاتھ پہ پیلا گھر
جو دو برسوں سے بند پڑا ہے
گھر کے پچھلے حصے میں فرش پہ ڈھیروں
پیلے پتے بچھے ہوئے ہیں
اونچے اونچے درخت ہیں جن پر
اک وحشت سی طاری ہے
اور فضا میں خاموشی نے
ایک ملال سے گھول دیا ہے
ایک سیمنٹ کی بینچ ہے اور اک جھولا ہے
ساتھ میں اک مٹکا رکھا ہے
اور مٹکے پر کائی جمی ہے
کائی کب کی سوکھ چکی ہے
سامنے اک ٹوٹی کھڑکی ہے
گھر کے اندر تاریکی ہے
پیلے گھر کے اندر اک عورت رہتی تھی
جس کا ایک ہی بیٹا تھا
اور پھر اک دن
وہ بیٹے کی لاش پہ اتنے زور سے چیخی
کہ خاموشی ڈر کے اُس سے لپٹ گئی تھی
جب سے یہ گھر بند پڑا ہے
کوئی نہیں یہ جانتا لیکن
اب بھی شام ڈھلے روزانہ
اُس گھر کی ٹوٹی کھڑکی سے
دو آنکھیں جھانکا کرتی ہیں
جانے کیا ڈھونڈا کرتی ہیں

OOO

آفتاب راجا

یہ زمیں

یہ شب گزاروں کی مسند پہ عاشقوں کی جبیں
قلندروں کا بچھونا شہید ظلم یہیں
جنوں نواز نظر کے لئے صراطِ مُبیں
ہر اک سے ربط کی صورت ہے اس کا طرز حسیں
ملیں گے ہم کو بہت بوریا نشیں اس میں
قدم قدم پہ بھٹکتے ہیں مہ جبیں اس میں

کبھی کبھی تو یہ سارے جہاں سے ملتی ہے
مکیں سے ملتی ہے ہر اک مکاں سے ملتی ہے
یہ جا رہی ہے کسی سمت ایک مدّت سے
یقیں سے کہتا ہوں اکثر گماں سے ملتی ہے
یہ موتیوں کے خزانے اُگلتی رہتی ہے
چُھپے ہوئے کسی شاہ جہاں سے ملتی ہے

مری مُراد ستاروں کے آسماں سے نہیں
سجے ہوئے کسی جنت کے گلستاں سے نہیں
فلک پہ تیرتی روشن سی کہکشاں سے نہیں
کسی برستے ہوئے ابرِ مہرباں سے نہیں
خلا سے جھانک کے دیکھو تو مختصر سی ہے
اُتر کے دیکھو جو! اس پر تو اپنے گھر سی ہے

OOO

نورزمان ناوکؔ

دوہے

گندم کا چسکارا لایا ہم کو دھرتی اور
اب بھی سو سو دوش کرائے گندم ہے چت چور

آج تلک ہے پائی کس نے گندم پیٹ اتھاہ
اس کی تہہ کے کھوجی سارے بھولے گھر کی راہ

لاکھوں دیکھے کرتے ہیں بھگوان کا جو انکار
گندم کا نہ منکر دیکھا ڈھونڈ پھرے سنسار

گندم ہٹ اور بالک ہٹ میں جانے کیسا بھید
دونوں کا ہی رونا دھونا جائے سینہ چھید

گھاٹ گھاٹ کا پانی چکھا بن بن پھانکی دُھول
جانے کیسا انت دکھائے گندم پہلی بھول

منڈلانے کو نکلے گھر سے بھونروں کی اک ڈار
گندم کی بالی پہ آئے جب بھی چیت بہار

گوری بانکی گندم دیکھی ہو گئے ہم بھی رام
کرنے لگ گئے ہم مورکھ بھی چھاپ گری کا کام

جس گندم کی تکڑی اندر نہیں حیا کے باٹ
بیساکھی کے میلے اندر کھولے چُنری ہاٹ

روم روم میں اُتری جائے گندم باس کٹار
کاہے کو آ نکلے بھیّا ہم کوچی بازار

گندم موہ میں کھیل رہا ہوں ناوکؔ دوہا کھیل
نہ میں عاجزؔ نہ میں عالیؔ نہ پرتوؔ روہیل

OOO

افسانے

بین بجاؤ

ڈاکٹر ابدال بیلا

''دیکھو! یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ جتنا کسی کے پاس دنیاداری کا زیادہ حصہ ہوگا، اتنا ہی اندر سے وہ سہما ہوا، ڈرا ہوا ہوگا، اس لیے کہ جب بھی کسی کے پاس کچھ ہوتا ہے تو اسی لمحے اسے اس سب کے چھننے کا ڈر بھی ہوتا ہے۔ تجھے پیٹ بھرنے کے لیے جینا ہے تو دنیا والوں میں ایسے لوگ ڈھونڈ جنھوں نے اپنے حصّے سے زیادہ دنیا لوٹی ہوئی ہے۔ لیکن ان کا پیٹ نہیں بھرا۔'' گرو اپنے چیلے کو سمجھا رہا تھا۔

چیلا اپنے خالی پچکے پیٹ کو چھونے کے بعد ہاتھ جوڑ کے بولا ''سرکار، آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی، مگر پیٹ نہیں بھرا۔ آپ نے کہا بانسری بجانا سیکھ، میں نے سیکھ لی، بجاتا رہا، کوئی ہیر چُوری لے کر نہیں آئی، آپ نے بولا الغوزہ سیکھ، وہ بھی سیکھ لیا، ایک رتی غوزہ نہ ملا، سرنگی بھی آپ کے کہنے سے بجائی، وہ منتیں کرتی رہی، مگر اسکی پکاری التجائیں بھی کسی کان کے دل تک نہیں پہنچیں، طبلے اور ہارمونیم تک میں کمال حاصل کرلیا۔ پورا میراثی بن گیا، میراث کچھ نہ بنی۔ پیٹ بھرنے کا کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا۔ اب آپ لوگوں میں ''ڈر'' ڈھونڈنے کا سبق دے رہے ہیں۔ اسے ڈھونڈ بھی لوں تو کیا بجاؤں۔''

''بین بجاؤ!''

''سرکار بین بجانی بھی سکھا دیں''

گرو نے سکھا دی، چیلا جب بین بجانے میں ماہر ہوگیا تو گرو نے پاس پڑی ایک پٹاری اسے تھما دی۔ بولا ''یہ اب ساتھ رکھ۔ اس پٹاری میں کالا ناگ ہے۔ ڈر نہ۔ سانپ کے دانت نکالے ہوئے ہیں۔ اسے صرف فراٹا مارنا آتا ہے۔ کاٹنے سے یہ معذور ہے۔ تو چار دن گھر میں اسکی سیوا کر۔ اسے بین پہ نچانے کے نرت سیکھ۔ جب یہ ترے ساتھ گھل مل گیا تو سمجھ تیرے اچھے دن آ گئے۔''

''وہ کیسے حضور؟''

''تو نے پھر ایک کام کرنا ہے۔ سانپ کو پٹاری میں ڈال کے بین لے کر ہر روز گھر سے نکلنا ہے۔ ہر شام تو مالا مال ہو کے لوٹا کرے گا۔''

''سرکار کیا چوک میں مجمع لگا کے سانپ کا تماشہ دکھایا کروں گا؟''

''ہے نا بے قوف۔ تماشہ دکھانے کے لیے بین بجانے والے کی جھولی میں آنے دو آنے کے سکّے آتے ہیں۔ میں نے تمھیں بین بجانی ایسے بے دام کام کے لیے تھوڑی سکھائی ہے؟ تو نے تماشہ نہیں دکھانا۔ بین بجا کے تماشہ دیکھنا ہے۔''

''وہ کس طرح سرکار؟''

''دیکھ تو نے پہلے ایک کام کرنا ہے۔کسی بڑے شہر جانا ہے۔شہر میں جا کے امیر لوگوں کی بستی ڈھونڈنی ہے۔اس بستی میں بھی ایسا گھر ڈھونڈنا ہے جو اپنے خود کو لاٹ صاحب سمجھتا ہو۔بیگم صاحبہ خود کو میم بنائے رکھتی ہو۔بس تسلّی کر لینا کہ وہ گھر ایسا ہو جس میں سونے چاندی کے انبار لگے ہوں۔ہن برستا ہو۔ایسا گھر تو نے تاڑ لینا ہے۔سمجھ جانا یہ وہی گھر ہے جس میں ''ڈر'' اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے۔جب اس گھر کے باسیوں کے پاس اتنا کچھ ہے تو ان سب کے دلوں میں ملے خزانوں کے چھننے کا ''ڈر'' لازمی ہے۔تو نے اور کچھ نہیں کرنا۔بس اس گھر کے پھولوں اور پھلوں بھرے باغیچے میں چپکے سے اپنا پالا ہوا سانپ چھوڑ دینا ہے۔پھر تھوڑی دیر بعد اسی گھر کے چوڑے دروازے پر لگی گھنٹی بجا دینی ہے۔گھر سے جو نکلے،اسے کہنا ہے۔''عالیجاہ میں سات پشتوں سے چلا آتا سپیرا ہوں۔سانپ کی خوشبو دو کوس سے سونگھ لیتا ہوں۔میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ آپ کے خوش رنگ باغیچے میں کوئی کالا ناگ ہے۔کسی بچے بڑے کو ڈس گیا تو کہرام مچا دے گا۔اجازت ہو تو بین بجا کے پکڑ لوں۔'' ''اب بتا،کون تجھے روکے گا۔وہ تو دست بستہ تجھے بین بجانے کو کہیں گے۔تو بین بجانا۔تیرا اپنا پالا ہوا سیکھا ہوا سانپ ادھر ہوتا ہے۔تھوڑی دیر بین سن کے جھومتا ہوا تیرے سامنے آ جاتا ہے۔تو نے ہاتھ بڑھا کے اسے پکڑ لینا ہے۔پھر دیکھنا وہ گھر والے تجھے کیسے مالا مال کرتے ہیں۔''

چیلے کے دن پھر گئے۔

جتنا وہ کبھی سال میں تماشے کر کے کمایا کرتا تھا،اتنا وہ ایک دن میں کمانے لگا۔بے شمار شہر تھے۔ہر شہر میں ان گنت چمکتی دمکتی بستیاں۔ہر بستی میں سجے سجائے گھر۔وہ روز کسی لشکارے مارتے بڑے مکان کے باغیچے میں جا اپنا سانپ چھوڑتا۔گھنٹی بجاتا۔مدعا بیان کرتا۔اور بین بجانے لگتا۔اس کا سانپ پھولوں بھرے تختوں کے نیچے سے سرکتا ہوا باہر نکل کے اس کے سامنے جھومنے لگتا۔

ایک دن عجیب تماشہ ہو گیا۔

اس نے بین بجائی۔بین سن کے ایک کی بجائے دو سانپ نکل آئے۔دونوں ایک جیسی شکل وصورت والے،کالے سیاہ ناگ۔سپیرا تو اپنے دانت نکلے سانپ کو پکڑنے کا عادی تھا۔اس کے سامنے اسی روپ کے دو ناگ آ گئے،تو اسکی سٹی گم ہو گئی۔وہ بین بجا رہا تھا۔مگر اسکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔آنکھوں کی پتلیاں پھیل ہوئی تھیں۔دل دھڑکتا سینے سے باہر نکلنے کو زور مار رہا تھا۔اس کا سانس پھول گیا۔بین بجتی بجتی بے سری ہو گئی۔وہ خوف سے بین بجاتے بجاتے کھسکتا کھسکتا پیچھے ہٹتا گیا۔پیچھے دیوار آ گئی۔وہ دیوار سے جا لگا۔دونوں جھولتے جھولتے اس کے سامنے پھن پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔پیچھے ہٹنے کی جگہ ہی نہ بچی۔جب موت کا خوف اسکی بین سروں سے سرک کے اسکے نتھنوں میں بجنے لگا تو اس نے بین چھوڑ کر ہاتھ جوڑ لیے۔گھر والوں سے بولا

''سرکار گھر والا سانپ آپ پکڑ دیں۔اپنے والا سانپ میں خود پکڑ لوں گا۔''

گھر والے حیران،یہ سپیرا کیا کہہ رہا ہے؟۔

دنیا بھی ان دنوں اسی گھر والوں کی طرح حیران ہوئی بیٹھی ہے۔دنیا بھر کے امیر گھروں کے خوش رنگ باغیچوں میں دنیا کی حکمرانی کا زعم رکھنے والا کرنے والا ہے۔جو جب چاہے سانپوں اور سپولیوں کی سرکوبی کے لئے کسی سوٹی کو سانپ بنا کے جہاں چاہے چھوڑ

دے۔اب اپنی ہی منتخب کی ہوئی جگہوں پہ اپنے سانپ چھوڑ کے پکڑنے کو پہنچا ہوا بین بجانے والا بھی کپکپاتا ہوا دیوار سے لگا بیٹھا ہے۔اب کون اٹھے،اور اپنے ہی گھر کی اپنے ہی ہاتھوں لگائی گھاس سے نکلا ہواز ہریلا سانپ پکڑے؟

سیانے ٹھیک کہتے ہیں۔ گھر میں گھاس لگانی ہے تو وقت پر اسے کاٹتے رہیں۔اگر گھر میں جنگل بن گیا اور اس میں کوئی سانپ آ گھسا تو سانپ چھوڑ کے سانپ پکڑنے والا سپیرا اسے کیسے پکڑے گا؟

◆◆◆

''تخلیق'' لاهور، راولپنڈی اور کراچی میں مندرجه ذیل مقامات پر دستیاب هے

لاہور ایسٹ بُک سنٹر

6-B، دی مال،لاہور (فون: 042-38543006)

شرافت نیوز ایجنسی

ٹورسٹ سٹریٹ،مدینہ مسجد،چوک پرانی انارکلی،لاہور (فون: 0300-4766734)

راولپنڈی ورائٹی بُکس سٹال

ورائٹی بُکس، بنک روڈ،صدر۔راولپنڈی (فون: 051-5583397)

سمائل بُکس ڈپو

200-B، لالہ رُخ،واہ کینٹ۔راولپنڈی (فون: 051-4532598)

کراچی اکادمی بازیافت

M-17،کتاب مارکیٹ،سٹریٹ نمبر 3،اردو بازار،کراچی۔74200(فون:021-32751324)

دانش کدہ

زہرا سکوائر،بلاک نمبر 6،گلشن اقبال،راشد منہاس روڈ۔کراچی-75300(فون:021-34966138)

فرار

پروین عاطف

جاڑا اس طرح ہے جیسے مڑمڑ کی واپس آ رہا ہو۔ کوئی صبح کبھی کھلی شفاف روشن ہوتی ہے اور کوئی مندی مندی۔ میلی کہرے سے ڈھکی۔ آج بھی فضا دھواں سی ہے۔ گز بھر کے فاصلے پر بھی کوئی چیز صاف دکھائی نہیں دیتی۔ ابھی تک چرند پرند بھی رات کی تاریکی کی ردا اپنے اوپر اوڑھے اپنے اپنے گھونسلوں میں سو رہے ہیں۔ حالانکہ صبح کاذب میں اب محض تھوڑا سا وقت باقی ہے۔

پچھلے کئی دنوں سے مجھے ایسی ہی ایک صبح کا انتظار تھا۔ گھڑیال رات کے ساڑھے تین بجا رہا ہے۔ رات بھر کا جاگا اپنی تیاری میں مشغول میں ایسی ہی گھڑی کا منتظر تھا۔ جب چاروں طرف ہو حق کا عالم ہو۔ اور گھر والے خواب خرگوش میں گم۔ بالخصوص میری بیوی صبوحی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی نیند اچھی نہیں اور سحری سے پہلے وہ بستر پر پڑی یونہی پہلو بدلتی رہتی ہے۔ اور جب سوتی ہے تو پھر زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

جس صندوق کو میں نے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا ہے اسے میں رات بھر سامان سے ہلکا کرنے میں مصروف رہا ہوں۔ پھر بھی میرے لئے میرے کاغذات اور اپنی کتابوں کے چند مسودے ساتھ لے جانا بے حد ضروری تھے، کیونکہ ان کی آخری آخری تصحیح کرنے کے بعد انہیں ''پبلش'' کرنا میرے لئے لازم ہے۔ ورنہ میری غیر حاضری میں پڑے پڑے وہ کرم خوردہ خاک کی چٹکی میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اور ان کے مٹ جانے کے بعد میری ذات بھی معدوم ہونا شروع ہو جائے گی۔ لکھنا یا کچھ تخلیق کرنا یوں بھی میری مجبوری اور میرا اولین فرض ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں کسی راجہ گدھ کی طرح شہرت کے پیڑ سے لٹکے رہنا چاہتا ہوں بلکہ محض اس لئے کہ جس طرح کمہار کو چاک پہ بیٹھ کر گھڑا یا کنالی بنانے کے سوا کچھ نہیں آتا مجھے بھی صفحہ قرطاس پر لفظ اتارنے کے سوا کوئی کام نہیں آتا۔

نوجوانی میں یہ کام میں روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور لوگوں سے وقت نکال کر بہ احسن کر لیا کرتا تھا۔ اب زندگی وقت کے ساتھ ساتھ مجھ پر ایک ہلکی سی تھکن کے طور پر وارد ہونے لگی ہے۔ میری قوّتِ برداشت بھی پہلے سے کم ہو چکی ہے۔ اب میں زیادہ وقت اپنے آپ کو زندگی کے پانیوں پر اس پودے کے طور پر چھوڑ دینا چاہتا ہوں، جو تازہ ہوا کے کندھوں پر از خود جھومتا رہے۔ گھر چھوڑ کر اپنی زندگی ایک نئے موڑ سے شروع کرنے میں میرا سب سے بڑا مددگار میرا بیسٹ فرینڈ الطاف تھا۔ ہم دونوں کی عمریں اب ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی ہیں۔ پھر بھی ہم ایک دوسرے کے ساتھ توں تڑاک سے بات کرتے ہیں۔ اسے اپنی انفرادیت اور خود مختاری سے عشق ہے۔ اس نے زندگی بھر شادی بھی اسی لئے نہیں کی کہ اپنی زندگی میں کسی دوسرے کی شراکت اسے منظور نہ تھی۔ میری طبیعت میں شروع ہی سے رومانویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب بھی وہ جوانی میں کسی دوشیزہ کے اور ے دورے گھومتے دیکھتا، اشاروں کنایوں سے سمجھاتا کہ

صنف نازک کی نازکی اور حسن ندی میں تیرتے گلابی کنول کی طرح دور دور سے اچھے لگتے ہیں۔ توڑ کر گلدان میں سجاؤ تو دو دن میں سب مندا مندا سا ہونے لگتا ہے۔ بالخصوص ایک فلمکار کی سچی کمٹ منٹ میں ان فروعی باتوں کی اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن صبوحی کے اور میرے معاملات معمول سے ہٹ کر تھے۔ اس کے اور میرے خاندان کی یاداللہ ہم دونوں کی ہوش سے پہلے کی تھی۔ میرا تعلق ایک کھلے ڈلے کھاتے پیتے زمیندار خاندان سے تھا اور صبوحی کے گھر والے نسلوں سے خصوصی ڈسپلن میں بندھے سرکاری افسر تھے۔

ہمارے ہاں جوتیاں اتار کر ادھر ادھر پھینکنا، کاغذ کتابیں، قالینوں چارپائیوں پر بکھیرنا، کھانا کھاتے وقت پلیٹیں پکڑ کر دریوں قالینوں پر چوکڑی مار کر بیٹھنا، اونچی آواز میں بات کرنا، بے تکلفی یا اپنائیت میں، گنا جاتا تھا۔ صبوحی اور لالہ کے گھر زندگی شب و روز ڈسپلن اور تکلفات کی زنجیروں میں جکڑی رہتی تھی۔ ان کے ہاں میز پر بیٹھے بنا کوئی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ شام کی چائے وہاں موسم کے مطابق برآمدے یا ڈرائنگ روم میں پی جاتی تھی۔ اگر کوئی قریبی شخص بھی ان سے ملاقات کے لئے آجاتا تو اسے کچھ دیر برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔

جذبے نئے نئے کچی کلیوں کی طرح مہکنا شروع ہوئے تھے۔ شائد یہ لالہ اور صبوحی کی جاذبیت تھی کہ مجھے اپنے گھر کی ڈھیلی ڈھالی ثقافت کے مقابلے میں ان کے گھر کا درشت جکڑا جکڑا سا ماحول اچھا لگتا تھا۔

الطاف اس وقت بھی میرے ساتھ ان کے گھر جانے سے گھبراتا تھا۔ ''ان دونوں لڑکیوں کی توجہ نے تمہیں بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ آئندہ مجھے ساتھ چلنے کو مت کہنا''۔ وہ جھنجھلا کر کہتا۔ صبوحی اور لالہ کی عمروں میں بمشکل ڈیڑھ برس کا فرق تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ چلتی پھرتی بالکل جڑواں بہنیں لگتی تھیں۔ شروع میں مجھے بات چیت اٹھنے بیٹھنے میں لگتا، لالہ میرے زیادہ قریب ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ قدرے اونچا بولنے والی، باتونی لڑکی صبوحی میرے دل پہ گہرے نقوش چھوڑ رہی تھی۔ پھر ہم دونوں پہ خود ہی خود وہ وقت آن وارد ہوا جب ہم ایک دوسرے کی شدید محبت میں مبتلا ہو گئے۔ اور شادی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ صبوحی اور لالہ کے والدین تو ہمارے اعلیٰ خاندان کی وجہ سے کب سے ہمیں ایسے ہی بازو وا کر کے ملتے تھے۔ صبوحی کی اور میری شادی دونوں خاندانوں کے لئے شدید مسرّت کا باعث تھی۔

شروع کے دنوں میں جب اس نے میرے گھر کی روایتی طور پر ڈھیلی ڈھالی ثقافت بدل کر اپنا کسا کسا وطیرہ لاگو کیا، تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوا کیونکہ ان دونوں میرا دل و دماغ اس کی گھنی زلفوں کی مہک سے معطّر تھا۔ پھر اس نے جب اس کے گھر میں آنے سے پہلے میرا جو کچھ بھی تھا ادھیڑ کر رکھ دیا تو میں نے اس کی زلف گرہ گیر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے ساتھ ایک غیر تحریری معاہدہ کر لیا کہ وہ میری بک شیلف، لکھنے والی میز اور دو کرسیوں کی سٹڈی یا لائبریری میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اس خصوصی کونے میں میرے ملنے والے یار دوست جتنی بھی دھما چوکڑی مچائیں، اس پر اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

جی میں نے کہا نا شادی کے اوّلین دور میں ہر بات ایسی ہی صلح سے ہوا کرتی ہے۔ پنکھے سے الٹا لٹک جانا بھی رومانوی ہی معلوم ہوتا ہے۔ صبوحی کے گھر میں رائج نئے نئے آرڈیننس مجھے اس لئے بھی نہیں کھلتے تھے کہ میں اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ اور وہ مجھے اس جوش و خروش سے چاہتی تھی جیسے کوئی بچہ اپنے پسندیدہ کھلونے کو چاہتا ہے۔

الطاف تو پیدا ہی سنکی ہوا تھا۔ ان دنوں بھی ایک روز جب میں اس کے سامنے صبوحی کی تعریف کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''کہ کنوارہ ہونے کے باوجود میں تم سے کہتا ہوں کہ اوپر سے فطری اور معصوم دکھائی دینے والا شادی کا رشتہ مفاد پرستی پر مبنی ہے اور متعدد اقسام میں بٹا ہوا ہے۔ بادشاہ وزیر سے لے کر ایک دوسرے پر مسلسل شک کرنے والے چور سپاہی تک اس رشتے کو کسی بھی خانے میں ڈال لو۔ کامیاب ترین شادی، میری تجربہ کار دادی ماں کے اقوال زرّیں کے مطابق اسے کہا جا سکتا ہے، جہاں کہیں نہ کہیں ممتا کا عنصر موجود ہو یا وہ جس میں شوہر یا بیوی میں سے کوئی ایک اپنے شریک حیات کو ایک چابی والے کھلونے کا درجہ دے۔ یعنی کاروبار حیات سے فارغ ہو کر آپ جب چاہیں گھر گھر راس کی چابی گھما کر اسے اپنی مرضی ناچنے پر مجبور کر دیں اور اس کے غلامانہ رقص سے اپنی انا کا غبارہ پھلائیں۔''

الطاف کا خیال تھا کہ صبوحی کی محبت میں لتھڑا میں بھی کسی حد تک اس کے اشاروں پہ ناچنے والا کھلونا بنتا جا رہا تھا۔ الطاف کی باتیں مجھے بہت حد تک فرسٹریشن سے بھری نامعقول لگ رہی تھیں۔ البتہ صبوحی کی ممتا گیری میں اک گونا درشتی کا عنصر وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ ضرور رہا تھا۔ بغور مشاہدہ نہ کرنے کے باوجود صاف دکھائی دیتا تھا کہ صبوحی کی اجازت کے بغیر گھر میں کوئی پر نہیں مار سکتا۔ ایک دوسرے کو خاموش رہنے کے اشارے کرتے اندر باہر گھومتے بچے ضمانت پہ رہائی پانے والے سیاسی نظر بند دکھائی دیتے تھے۔ بغیر استری کپڑے پہن کر کھانے کی میز پر براجمان ہونے والے شخص کو کمرے سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ جس شدید توجہ کو میں اپنے لئے صبوحی کی ممتا بھری محبت سے تعبیر کرتا تھا۔ دراصل وہ میری ذات پر مکمل قبضہ جمانے کی صبوحی کی سیاسی چال تھی۔

شروع میں مجھے میری اور صبوحی کی محبت کا انداز بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں اپنی ذات پر اس کی قبضہ جمانے کی خواہش کو ممتا سے تعبیر کرتا رہا۔ وہ تو ایک بار جب میری بیٹی، میشا کچھ بڑی ہوئی اور اس نے مجھے ہنستے ہنستے کہا ''ابو میری امّی کے گھگھو گھوڑے ہیں'' تو میں چونکا۔ مجھے لگا کسی نے میرے دماغ میں ہتھوڑا دے مارا ہے۔ تب میں نے سوچنا شروع کیا کہ میرے اور صبوحی کے ازدواجی رشتے کی نوعیت کیا تھی۔ مجھے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ صبوحی کے ڈسپلن اور دھونس کی وجہ سے میں نے اپنے دوستوں کو سٹڈی سے نکال کر ڈرائنگ روم میں لانا بند کر دیا تھا۔ میرے اپنے گھر والوں کا ہمارے گھر آنا آپ ہی آپ بے حد کم ہو گیا تھا۔ ہمارے ہاں کے فنکشنوں اور پارٹیوں میں زیادہ سے زیادہ لوگ وہی آتے تھے جو صبوحی کے رشتہ دار تھے یا دوست۔

میں نے اپنی تحریر پہ غور کیا تو وہ زیادہ تر محبت کی ان ''ٹین ایج'' کہانیوں پر مشتمل تھیں جو صبوحی کو پسند تھیں۔ ان میں پختگی بلوغت یا درد کا کوئی شائبہ تک موجود نہ تھا۔ تب مجھے اس طرح لگا جیسے میری بیٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر کسی گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ اس کے بعد میں نے ردِ عمل کے طور پہ اپنے آپ کو اپنی سٹڈی میں بند کر کے کچھ سنجیدہ کام پر توجہ دینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرا فیصلہ یہ کیا کہ صبوحی کی طرح میں بھی اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو اپنے گھر زیادہ مدعو کیا کروں گا، لیکن میری اپنی کوتاہی کی وجہ سے ایسا ہونے کا وقت گزر چکا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان تعلّق پھیکے پڑ جانے کی وجہ سے انہیں اب میری کھلی بانہوں کی کوئی زیادہ پرواہ نہ تھی۔ نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ میرے گھر آ کر وہ میری بیوی کی خواہش کے مطابق جوتیاں گھر سے باہر اتار کر کسی فوجی قسم کے ڈسپلن پر عمل کریں (آپ نے دیکھا صبوحی نے کس ہوشیاری سے مجھ تن تنہا کو اپنے قابو میں کر لیا۔ کیسی سیاسی ڈپلومیسی سے۔)

پھر آہستہ آہستہ میری چند کہانیوں کی شہرت ہوئی تو میرے اندر خود مختاری اور آزادی کی ایک ایسی خواہش نے سر اٹھایا کہ میں نے اگر اسے روکا تو وہ میری مکمل بغاوت پہ منتج ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ میرے اور صبوحی کے اختلافات کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے جہاں مجھے اپنا کھلونا سٹیٹس بری طرح کھلنے لگا تھا۔''

صبوحی میرے تین بچوں کی ماں تھی ایک سطح پر ہم دونوں ایک دوسرے سے خاصی محبت بھی رچا چکے تھے۔ اگر میرا ردعمل ایک حد سے زیادہ درشت ہوتا، تو شدید ٹوٹ پھوٹ کے امکانات تھے جو میرے گھر اور بچوں کی بربادی کا باعث بن سکتے تھے۔ اسی لئے شعور آ جانے کے باوجود میرا ردِعمل ایک انوکھے خوف کا روپ دھارنے لگا۔ صبوحی کی قربت اور بچ بچ کا خوف انجانے میں بھی اگر وہ اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیتی، تو میں اس طرح بدکتا جیسے کسی بچے نے اندھیرے میں کوئی پراسرار وجود دیکھ لیا ہو۔ 102 ڈگری کا بخار ہوتا تو میں چوری چھپے الطاف سے ڈسپرین منگوا کر کھالیتا لیکن صبوحی کے صدقے واری جانے اور یہ نہ کرو، وہ نہ کرو کے خوف سے اپنی بیماری کا ذکر تک نہ کرتا۔

کبھی کبھار ساون کی پھواروں میں کوئل کی کوک، جاڑے کی روح کو گرمانے والی سنہری دھوپ یا باغیچے میں دیوانہ وار پھیلی موتیا گلاب کی خوشبو مجھے صبوحی سے ملنے پر مجبور کرتی 'تو یقین کیجئے' مجھے لگتا میں کسی مجبور نوجوان کی طرح اپنی نوکری کے پہلے پہلے انٹرویو پہ جا رہا ہوں، یا کوئی بڑا افسر میرے دفتر میں دورے پر آ رہا ہے۔ ایسے میں میں بھاگ بھاگ کر پہلے اپنا کمرہ صاف کرتا، مالی کو پچھلے دروازے سے بلا کر چھت کے جالے اتر واتا، کتابیں سلیقے سے رکھتا۔ ادھ لکھی کہانیوں کو کپڑوں کی الماری میں ٹھونستا۔ پھر خانسامے کے ہاتھ بلاوے کی چٹھی صبوحی کو بھیجتا۔ بعد اہتمام دو گھنٹوں بعد بنی ٹھنی وہ میرے کمرے میں آتی، انتہائی آسودہ گفتگو کے درمیان کونے میں پڑے جوتوں یا کتابوں کے ڈھیر پر کوئی ایسی نکتہ چینی کر کے چلاّتی کہ باقی پورا دن میں غصے میں تلملاتا میزوں کرسیوں کو ٹھوکریں مارتا پھرتا۔ الطاف جس نے کبھی شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ آج صبح بھی مجھ سے یہی کہہ رہا تھا ''اس سے تو بہتر ہے کہ شادی شدہ زندگی کے آغاز ہی میں آپ ایک دوسرے کی محبت کے جھانسے میں نہ آئیں۔ ایک دوسرے پر اپنی ملکیت کے حقوق اور پابندیوں کو کم کریں۔ کسی نام نہاد باتمیز سلیقہ مند گھرانے کی لڑکی کو اپنے گھر کی کھلی ڈلی فضا درشت ڈسپلن سے مکدّر نہ کرنے دیں۔ گھونگھٹ سرکاتے ہی اسے ''جیو اور جینے دو'' کے مقولے پر عمل کرنا سکھائیں۔ اور زندگی جس کا تحفہ آپ کی جھولی میں صرف ایک دفعہ ڈالا جاتا ہے آسودگی اور خودمختاری سے گزاریں۔ ورنہ آپ کی تمام نازک حسیات پر کائی جمنے لگے گی اور محبتوں جیسے دلربا جذبے، زنجیروں میں جکڑ جائیں گے۔''

الطاف جو بھی کہے مجھے لگتا ہے کچھ عرصے سے صبوحی کی توجہ کا پینڈولم بچوں اور آنے والوں کی طرف زیادہ گھوم رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اس کی توجہ کے دائرے سے باہر ہوں۔ اونہوں! میں تو اب شائد گھر میں پہلے سے بھی زیادہ اہم ہو چکا ہوں۔ اور صبوحی بجائے اس کے کہ عمر کے ساتھ بلوغت اور دانشوری کی کچھ منزلیں پار کرتی، پہلے سے کچھ زیادہ کچی باتیں کرنے لگی ہے، دو روز پہلے مجھ سے چوری سٹڈی میں میری نئی کہانی پڑھ کر، مجھ سے کہنے لگی۔ ''میں تو زندگی بھر اس محبت کو ترستی رہی جیسی تم نے اپنے افسانے میں لکھی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی ایک حد سے آگے تم عورت کی نازک حسیات بالکل نہیں سمجھ سکتے، لیکن تم نے افسانے میں جذبوں کے ایسے لاوے بھڑکائے ہیں کہ اللہ توبہ!''

چند ناقدوں اور میڈیا کے لوگوں نے اب مجھے ایک جانے مانے ادیب کی جگہ دینا شروع کر دی ہے۔ گھر میں وہ لوگ جب بھی میرا کوئی انٹرویو یا تصویر لینے آتے ہیں تو صبوحی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ میرے ساتھ وہ بھی فوکس میں رہے۔ کوئی اگر اسے نظرانداز کرے تو ان کے جانے کے بعد وہ انہیں گھنٹوں صلواتیں سناتی ہے۔ صبوحی کی یہ چھوٹی چھوٹی تمام باتیں حرکات وسکنات جمع ہو کر میرے اعصاب کو شل کئے دے رہی تھیں۔ پھر اسی دوران دیر تک گھر سے باہر گھومتے رہنے کی وجہ سے مجھے ہلکا سا نمونیہ ہو گیا۔ اس کے بعد صبوحی نے میری

زندگی بالکل حرام کردی ہے۔ میری سٹڈی اب ایک مطب میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ڈاکٹری دوائی سے لے کر ہومیوپیتھی اور حکیموں کے سفوف تک ایسی کوئی دوائی نہیں جو میرے سرہانے نہ پڑی ہو۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں دروازے کال کوٹھڑی کی طرح بند ہیں اور کئی طرح کے کمبل میرے بدن کو ڈھکے ہوئے ہیں۔

آپ تو سمجھتے ہونگے کہ وہ مجھ سے شدید محبت کرنے والی میری خیر خواہ بیوی ہے۔ نہیں جناب دراصل وہ ایک انتہائی تھانیدار قسم کی خاتون ہے۔ اس کے دائرہ کار میں آنے والے کسی شخص کی کوئی مجال نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے زندگی گزار سکے۔ اس میں اب وقت کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی انتہائی درشت ساس کی جھلک بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ اسکی محبتوں کے رنگ بھی اب مزید قبضہ گیری میں ضم ہوتے ہیں۔

میرے بچے بھی اپنی ماں کی پابندیوں میں گرفتار آزادی سے جینے کی حس سے محروم ہیں۔ آزادی اور بے تکلفی کے جس مزے سے وہ واقف نہیں اس کی وہ خواہش بھی بالکل نہیں کرتے۔ میں جو ایک ادیب ہوں اپنے قلم اور اپنے مختلف پس منظر کی وجہ سے جانتا ہوں کہ اپنی مرضی سے جینے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب صبوحی کی دی ہوئی زندگی نہیں جیوں گا۔ میں اب اپنی کل جائیداد صبوحی کے حق میں لکھ کر کسی ایسی جگہ بھاگ رہا ہوں جہاں میں اپنی مرضی سے جی سکوں۔ میں صبوحی سے نفرت نہیں کرتا۔ اس کی محبت میرے دل کی گہرائیوں میں کہیں آج بھی موجزن ہے۔ پھر بھی میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ باقی ماندہ زندگی میں اس سے الگ تھلگ کسی ایسی جگہ رہوں، جہاں وہ میرے روزمرہ پر قبضہ نہ جما سکے۔

صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ باغیچے کے پار درختوں میں میرا دوست الطاف احمد اپنی کار لئے کھڑا ہے۔ وہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے اور میرے دل کی کیفیت سے بخوبی آگاہ۔ اب میں جہاں بھی جاؤں گا۔ اسے اپنے گردونواح اور حالات سے آگاہ رکھوں گا۔ صبوحی اور بچوں کو میں نے معذرت کا طویل خط لکھ دیا ہے۔ جو الطاف انہیں دوپہر کے وقت بھیجے گا۔ جب میں ان سب سے بہت دور جا چکا ہوں گا۔ میں نے خط میں لکھا ہے کہ چند ماہ بعد میں ان سے ملنے خود ہی آجاؤں گا۔ وہ مجھے بالکل تلاش نہ کریں، نہ میری گمشدگی کا واویلا ڈال کر مجھے بدنام کرنے کی کوشش کریں۔ باقی زندگی اپنی مرضی اور خودمختاری سے جینا ہے۔ میں اپنے خاندان سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا جائیداد میں سے اپنے لئے میں نے انتہائی قلیل حصہ رکھا ہے۔ میں ان سب کو ملنے خود ہی آجایا کروں گا۔ میرا تخلیق کار ذہن اڑانیں بھرنا چاہتا ہے۔ مفرور محمد مختار۔

◆◆◆

ڈاکٹر خلیق انجم (بھارت)

''آج صبح کی ڈاک سے ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ بہت کم ایسے ادبی رسالے ہیں جنہیں ملتے ہی میں اپنی مصروفیات کے باوجود شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتا ہوں۔ ''تخلیق'' بھی ان ہی چند رسالوں میں ہے جنہیں میں شوق سے پڑھتا ہوں۔''

جنازہ

عطیہ سید

وہ انوکھا دن بھی ایک عام دن کی طرح طلوع ہوا۔ عافیت صبح سات بجے اٹھی، منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا اور کپڑے بدلے۔ اس روٹین کے بعد وہ سوچنے لگی کہ کیا کیا جائے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی جھنجھنا اٹھی۔ عافیت گھنٹی کی آواز سن کر ٹی۔ وی لاؤنج کی طرف لپکی؛ جس کے ایک کونے میں ٹیلی فون رکھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا، مگر اس کی توجہ ٹیلی فون پر ثبت انگلیوں کے سیاہ نشانات پر تھی۔

''ہیلو!''

''ہیلو! عافیت میں محمودہ بول رہی ہوں''

''اوہ محمودہ! تم کیسی ہو؟''

''عافیت! ایک خبر ہے۔ نہایت افسوسناک''۔

محمودہ کی زبان میں کپکپاہٹ تھی۔ پھر اس نے ہمت کر کے وہ بات کہہ ڈالی جو خود اس پر بجلی کی طرح گری تھی۔

''تمکین۔ تمکین کی۔ لاش دو بجے دوپہر کراچی سے ہوائی جہاز کے ذریعے سے لائی جا رہی ہے۔''

''تمکین۔ تمکین کی لاش؟''

عافیت نے یہ الفاظ دہرائے، مگر بے سوچے سمجھے محض روبوٹ کی مانند جسے کئی معلومات فیڈ کر دی گئی ہوں۔

''ہاں۔ تم 4 بجے تک اس کے والدین کے ہاں پہنچ جانا''۔

''تمکین کی لاش.....''

عافیت نے میکانکی انداز میں دوبارہ ان الفاظ کی تکرار کی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا ذہن اس خبر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کی توجہ اب بھی ٹیلی فون پر ثبت انگلیوں کے سیاہ نشانات پر مرکوز تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس محلول سے ان دھبوں کو صاف کیا جائے تا کہ ٹیلی فون کی نارنجی سطح دمک اٹھے۔

اور جب بالآخر اسے محمودہ کے الفاظ کا مطلب سمجھ میں آیا تو ان کی سنگینی سے اس کی زبان گنگ ہو گی، ذہن ماؤف ہو گیا۔ اس نے ریسیور جھٹکے سے آپریٹس پر رکھ دیا۔ گھر میں گہرا سکوت چھا گیا جیسے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں لہروں کی حرکت رک گئی ہو۔ کھڑکی سے چمٹی بوگن ویلیا کی گھنی شاخوں میں کوئی پرندہ الاپ رہا تھا۔

''پی، پی..... پی، پی۔''

کیا یہ سپنا تھا یا اس کا تخیل؟ لیکن اس کی پرسوز آواز نے عافیت کے سکتے میں شگاف ڈال دیئے۔ درد آنسوؤں کی صورت رسنے لگا۔ دنیا اور اس کے سارے جھمیلے.....تمام جھنجھٹ کہیں پس منظر میں چلے گئے۔ تمام سوچیں، احساسات و جذبات فیڈ آؤٹ ہو گئے۔ صرف ایک خیال ہر چیز پر چھا گیا.....ایک تصور جو انگارہ بن کر سلگنے لگا۔

''تمکین جا چکی ہے.....رخصت ہو چکی ہے.....ہمیشہ کے لئے.....اب وہ کبھی پلٹ کر نہ آئے گی۔''

یہ سوچ اس کے وجود کو دھیرے دھیرے بلیڈ کی طرح کاٹنے لگی۔ عافیت کو چکر سا آ گیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نزدیک رکھی گئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ قیامت کی اس گھڑی میں اسے یوں لگا کہ اب کچھ بھی نہیں۔

''مہتاب، نہ سورج، نہ اندھیرا، نہ سویرا''

جب عافیت 4 بجے تمکین کے والدین کے گھر پہنچی تو وہاں لوگوں کا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ کسی کی زندگی دوسروں کے لئے ناٹک سے زیادہ کچھ نہیں.....اور اس کی موت ڈرامے کے ڈراپ سین کا تمام تر تجسس اپنے اندر سمیٹے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تمکین کی موت تو سنسنی خیز تھی، اس لئے اور بھی زیادہ توجہ کا مرکز تھی، مگر یہ توجہ کسی قدر زہر آلود تھی۔ عافیت ہجوم کا سینہ چیرتی ہوئی گھر کے اندر پہنچی جہاں تمکین کے ماں باپ، بہن بھائی اور عزیز رشتہ دار نوحہ کناں تھے۔ کوئی عورت بین کر رہی تھی، کوئی مرنے والی کی خوبیاں بیان کر رہی تھی اور کوئی افسوس کا اظہار۔ عافیت اس نقار خانے میں تنہا کھڑی تھی اور اس کے ذہن میں بار بار یونانی المیوں کی سٹیج پر سیاہ ملبوس میں ماتمی کورس گانے والیوں کی تمثال ابھر رہی تھی۔

عافیت کو غم کی اس نمائش سے.....دکھ کے اس شوکیس سے.....اس تھیٹریکل ماتمی کورس سے تنفر سا محسوس ہوا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ ساتھ والے کمرے کی طرف بھاگی جس میں تمکین کی سٹڈی تھی۔ وہاں قد آدم کھڑکی لان کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی پر چمکیلے پتوں والے ربڑ پلانٹ کا سایہ تھا جس سے آگے لان کے پرانے درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔

عافیت ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں اسے احساس ہوا کہ اس کے علاوہ کمرے میں اور خواتین بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک عافیت سے مخاطب ہوئی۔

''عافیت! تمکین کی موت کا بے حد افسوس ہوا۔''

''بڑی عمر کی شادی.....اور یہ انجام.....'' ململ کی ساڑھی پہنے ہوئے دوسری خاتون نے لقمہ دیا۔

عافیت نے ململ کی ساڑھی والی خاتون کے لہجے کی کمینگی کو شدت سے محسوس کیا۔ اسے یاد تھا کہ اسی خاتون نے کسی زمانے میں اپنی محبت اور خلوص کے اظہار کے طور پر تمکین کو تحفے میں ایک مشہور شاعر کا دیوان دیا تھا اور اس کے اندر اپنی پوسٹ کارڈ سائز تصویر چھپا دی تھی۔ اس خاتون کو کیا علم کہ تمکین اس بچگانہ حرکت پر کس قدر ہنسی تھی۔ مگر آج وہی خاتون نشتروں سے لیس تھی۔ گیند اچھالنے کے لئے یقیناً اس کے ہاتھ میں تھا۔ تمکین تو گیند واپس پھینکنے کے لئے موجود ہی نہ تھی۔ اس صورت میں کسی غیر موجود شخص کی طرف گیند اچھالنا سادیت پسندی (Sadism) کے اظہار کے سوا کیا تھا۔

''عمر بڑی تو نہیں تھی۔ یہی کوئی تیس برس کی ہو گی تمکین''۔ ایک نیک دل دراز قامت کرسچن خاتون نے جواب میں کہا وہ تمکین کی

سکول ٹیچر تھیں۔

''کیا تمکین وگ لگاتی تھی؟'' ایک اور تیرانداز خاتون بولی۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' آبدیدہ عافیت نے جواب دیا۔

تمکین کی سٹڈی کی الماریوں میں رکھی انگریزی ادب کی کتابیں حیرت سے ساکت تھیں۔ ایک الماری کا پٹ کھول میکبتھ کی آواز آئی:

Its a tale

Told by an idiot, full of sound and fury,

Signifying nothing."

ایک اور الماری کے اندر سے ہملٹ نے افسوس سے چہ میگوئیاں کرتی خواتین کی طرف دیکھا اور کہا:

"To be, or not to be: that is the question."

پھر وہ بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں کتاب کے صفحات میں روپوش ہو گیا۔

''بھئی عافیت! کیا تمکین سچ مچ وِگ لگاتی تھی؟''

''مجھے کیا پتہ..... عافیت نے تنک کر جواب دیا۔

عافیت نے منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ سبزہ پر زرد زرد دھوپ بے بسی سے لیٹی تھی۔ باہر شاید بہار کا موسم تھا۔ لِلّی کے سرخ پھول سبز لانبے پتوں میں خون کے دھبوں کی طرح دمک رہے تھے۔

ڈرائینگ روم اور ڈائینگ روم کے سامنے پھیلے لمبے برآمدے کے آخری سرے پر وہ خالی کمرہ تھا جس کی شکستہ چھت کی وجہ سے اسے کبھی استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ آج اسی میں تمکین کے سرد لاشے کو ڈال دیا گیا تھا تا کہ لوگ اس کا آخری دیدار کر سکیں۔

ماتم میں شریک خواتین قطار کی شکل میں لمبے پتلے برآمدے میں کھڑی تھیں تا کہ شکستہ کمرے میں رکھی لاش کو دیکھ سکیں۔ عافیت بھی اسی قطار میں کھڑی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ برآمدے کو شیشوں سے محفوظ بنا دیا گیا تھا اور جگہ جگہ کتابوں سے بھری الماریاں رکھی تھیں۔ انہی کے پاس کھڑی عافیت سوچ رہی تھی کہ سب کچھ کتنا علامتی تھا۔ کتابوں سے بھرا برآمدہ تمکین کی زندگی کا راستہ تھا جس کے آخر سرے پر ٹوٹا پھوٹا کمرہ..... شکست و ریخت..... ناگزیر موت تھی۔ تمکین برآمدے میں چلتے چلتے شکستہ کمرے تک پہنچ گئی تھی جہاں سے واپسی محال تھی۔

لوگوں کی قطار آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ بالآخر عافیت کی باری آ گئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور تمکین کے سرد جسم کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں تھلوں کی مانند خشک تھیں، لیکن اس کی سوجیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ تمکین کا سانولا چہرہ نیلا تھا۔

''سانپ نے ڈس لیا ہے؟'' عافیت نے سوچا۔

پھر عافیت نے ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اپنے اِردگرد کے ٹھوس ماحول کی طرف واپس آنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی نظر لوٹ کر..... پلٹ کر تمکین کے سوجے ہوئے چہرے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے معلوم تھا کہ دیدار کو اس ساعت کے بعد وقت جدائی ہے.....

نہ ختم ہونے والی..... بے انت..... بے انجام.....ابدی جدائی۔

عافیت نے موتیے کی کچی کلیوں بھرے ہاتھ پھیلا دیئے۔ تمکین کے مردہ جسم پر تنی چادر کلیوں کی بارش میں نہا گئی۔ جانے یہ ایک دوست کا اظہارِ محبت تھا یا کسی معرکے میں کام آنے والے جنگجو شہید کو ہدیہ عقیدت۔

عافیت صرف چند لمحے شکستہ کمرے میں نیلی لاش کے سرہانے کھڑی رہی، لیکن اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک صدی سے کسی اہرام میں ممی کے ساتھ بند تھی۔ کمرے میں ایسی بندسی بو پھیل رہی تھی جیسے صندوق میں رکھے کپڑوں سے اٹھتی ہے جنہیں عرصہ دراز سے ہوا نے چھوا نہ ہو۔

اس کے سر میں درد کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھنے لگیں۔ دم گھٹنے لگا..... کمرے میں بساند تھی ٹھہرے ہوئے پانیوں کی۔ وہ گھبرا کر صحن میں نکل آئی۔ باہر زیادہ تر مرد کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ موت کے اچانک پن سے حیرت زدہ تھے۔ بعض سوگوار تھے اور چند ایک خالی الذہن۔ ایک تعطل کی کیفیت تھی۔ تمکین کا شوہر لوگوں سے الگ تھلگ اس جگہ کھڑا تھا جہاں بیلیں دیوار سے لپٹی تھیں۔ سانولے رنگ اور ناٹے قد کا یہ دبلا پتلا آدمی صدمے سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے ساون کی جھڑی برس رہی تھی۔ وہ بار بار رومال سے چہرہ پونچھتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ اسے نظر انداز کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ چند لوگ اسے ظالم اور دوسرے اسے مظلوم تصور کرتے تھے۔

مگر اصل میں وہ کیا تھا..... ظالم یا مظلوم؟ کیا اس کے ہاتھ تمکین کے خون سے رنگ ہوئے تھے یا وہ کسی سازش کا شکار تھا؟ یہ سارے سوال بچھو کی طرح ڈس رہے تھے۔

ناٹے قد کے سانولے آدمی نے اپنے اصل سائز سے بہت بڑے بوٹ پہن رکھے تھے۔ عافیت کو وہ اپنے ناٹے قد اور بڑے بوٹوں کے سبب مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب سے بے خبر اپنے بڑے بڑے بوٹوں کی نوک پر آنسوؤں کے قطرے گرتے دیکھ رہا تھا۔

چند عورتیں اور مرد پھاٹک کے قریب کھڑے تھے۔ وہ تمکین کے شوہر کے بجائے عافیت کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک لمبی تڑنگی خاتون عافیت کی طرف بڑھی۔

''عافیت! تمہاری دوست کی بے وقت موت کا بے حد دکھ ہوا۔''

لمبی تڑنگی خاتون کے لہجے میں رحم کی نرماہٹ نمایاں تھی، لیکن اس کے باوجود عافیت بھڑک اٹھی۔

''اب افسوس کا کیا فائدہ؟ آپ سب اس کے قتل میں برابر کے شریک ہیں۔ جب وہ مر رہی تھی تو آپ کو خبر تک نہیں تھی۔ آپ چاہتے ہیں کہ انحراف نہ ہو۔ لڑکی پر شادی کا لیبل لگ جائے، آپ چاول کھائیں..... شادیانے بجائیں۔ اس کے بعد کسی پر کیا بیت جائے گی..... اس سے آپ کو کیا غرض۔''

لمبی تڑنگی خاتون ہکا بکا رہ گئی۔ وہ یوں گھبرا کر بھاگی جیسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو اور واپس اس گروہ میں شامل ہو گئی جو پھاٹک کے قریب جنازے کی رخصتی کا منتظر تھا۔

عافیت خود اپنے تند ردِعمل پر حیران تھی۔ نجانے اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس قدر درشتی سے لمبی تڑنگی خاتون سے مخاطب ہوئی۔ اس کے اندر کہیں گہرائی میں غصہ پھنکارنے لگا تھا۔ اس سے پہلے اس کی زندگی پرسکون پانیوں جیسی تھی جس میں کبھی کسی جذبے کی کنکری سے

چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھتی تھیں اور دائرے بنتے تھے، لیکن کبھی کوئی طوفان نہیں آتا تھا۔ تمکین کی موت نے اس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

جنازہ رخصت ہو چکا تھا۔ عافیت سب سے آخر میں تمکین کے گھر سے نکلی۔ باہر سڑک سنسان پڑی تھی۔ لوگ بکھر چکے تھے۔ عافیت اپنی کار میں بیٹھ گئی اور چھوٹی سڑک سے بڑی سڑک پر پہنچ گئی۔ بڑی سڑک پر وہی چیختا چلاتا رش، دھاڑتا ٹریفک، اپنی اپنی دھن میں بھاگتے لوگ.....وہی تیزی.....وہی جنون سب کچھ ویسا ہی تھا۔ دنیا کو خبر ہی نہ تھی کہ کوئی رخصت ہو چکا تھا۔ کہانی ختم ہو چکی تھی.....مگر زندگی جاری و ساری تھی۔

عافیت گھر پہنچی تو بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ صحن میں ننھی منی بوندوں کے تسلسل میں سنبل کی جھاڑیاں نکھر سی گئیں تھیں۔ ان سے پرے گلچیں کے درخت مہک رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔

''آسمان بھی رو رہا ہے۔'' عافیت نے سوچا۔ ''لیکن اس ربط میں کتنی بے ربطی ہے۔ ربط اور ہم آہنگی خیال کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

اس نے سینڈل اتار کر بے دردی سے پٹخ دیئے۔ جوڑا کھول کر بال بکھیر دئے۔ میز پر قرینے سے چکنی کتابوں کو الٹ پلٹ دیا۔ وہ ننگے پاؤں قالین پر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی جیسے کوئی شیرنی پنجرے میں.....

چکر لگاتے ہوئے اس نے پلنگ پر جست لگائی اور سلیقے سے رکھے تکیوں اور کشنوں کو توڑ موڑ کر پھینک دیا۔ سفید چادر کو ہاتھوں اور پاؤں سے مسل دیا۔

''سلیقہ بے معنی اور قرینہ بے ضرورت ہے''۔

وہ بڑبڑا رہی تھی۔ آخر وہ ہانپتے ہوئے بیڈ پر گر گئی اور نمناک آنکھوں سے سوچنے لگی۔

''کیا تمکین وِگ لگاتی تھی؟ کیا اس کی عمر بڑی تھی۔ کیا عورت تیس سال کی عمر میں ہی بوڑھی ہو جاتی ہے؟ کیا اس کے شوہر نے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا یا اس نے خودکشی کی تھی؟ کیا.....کیا.....کیا اور کیا؟ ان سوالات کے گرد تلے تمکین کا.....ایک انسان کا..... ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا المیہ اور اس کی سنگینی کس طرح دب کر رہ گئی تھی۔ سب کو اپنے تجسس کی تشفی چاہیے تھی اور تمکین.....تمکین.....ایک انسان.....ایک شخص کی رخصتی کا نوحہ کون پڑھے گا؟''

◆◆◆

سیّد ضمیر جعفری

''اظہر جی! ہم خود خواہ کسی ترتیب (بلکہ بے ترتیبی) میں مبتلا ہوں۔ ''تخلیق'' کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہے کہ اس رشتے میں اک عمر بیت گئی اور اگر دوسری مل جائے تو وہ بھی اس کی نذر کر دیں۔ ''تخلیق'' کے ہر شمارے کے ساتھ آپ کو آخر میں کہتا ہوں کہ معلوم نہیں آپ خود کس طرح زندہ رہیں، مگر ''تخلیق'' کے سوتے جگائے رکھتے ہیں۔ آپ وہ فصل کاشت کر رہے ہیں جو عموماً سروں کی فصل کٹ جانے کے بعد کٹا کرتی ہے۔''

وقت تتلی تھا

عذرا اصغر

وہ بہت رغبت اور انہماک سے کھانے میں مصروف تھی۔ بے دھیانی سے گزرتے ہوئے چتکبری کی نظر اس پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی اور توّجہ سے بھوری کو دیکھنے لگی جو فربہ ہو کر خاصی خوبصورت نکل آئی تھی۔ ''یقیناً کوئی خاص کھانا ہے۔ تبھی تو پلیٹ میں ہے'' چتکبری نے تعجب سے سوچا اور پھر دیوار سے کود کر نیچے اتر آئی۔

بھوری اتنی دیر میں چاٹ کے پلیٹ صاف کر چکی تھی۔ چتکبری کو دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

''بڑے دن بعد نظر آئی ہو۔ کہاں رہیں؟ کیا کہیں دور چلی گئی تھیں؟''

''ہاں! بس، کچھ زیادہ دور تو نہیں تھی۔ مگر پیٹ کی آگ سے مجبور ہو کر گھر گھر جھانکنا پڑتا ہے نا''۔

چتکبری نے ایسی حسرت سے کہا کہ بھوری کو اس پر بڑا ترس آیا ''بچاری''

''تم بہت لاغر ہو رہی ہو؟'' وہ بولی

''چار بچے پیدا کر کے آ رہی ہوں''۔ چتکبری نے ایسے کہا جیسے وہ کوئی بڑا معرکہ سر کر کے آئی ہو۔

''کہاں چھوڑا انہیں؟'' بھوری نے جیسے معلومات حاصل کرنا چاہیں۔

''وہیں، اسی علاقے میں ہیں'' چتکبری نے ایک آہ سی بھری۔

''مگر جہاں تمہیں کچھ نہ مل سکا انہیں کیا ملے گا۔ تم کتنی کمزور ہوگئی ہو''۔ بھوری فکرمندی سے بولی۔

''اب میں کیا کروں؟'' چتکبری نے تنک کر کہا۔ ''اپنا کچھ نہ کچھ بندوبست کر ہی لیں گے۔''

''بہت چھوٹے ہیں نا ابھی'' بھوری نے کہا

''ان سے پہلے بھی تو ہیں .....، جانے کہاں کہاں ہوں گے، میں کس کس کی خبر رکھتی پھروں''۔ چتکبری نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''مگر تمہیں اب بچے پیدا نہیں کرنے چاہئیں تھے''۔ بھوری نے قدرے ناراضی سے کہا۔

''دیکھو نا ہماری نسل پھیلتی چلی جا رہی ہے اور آدم زاد میں اتنی ہی خست بڑھ گئی ہے۔ مجال ہے کہ کبھی کچھ کھانے کو پیٹ بھر دے دیں۔ ایک آدھ سوکھا ٹکڑا بھی ایسے پھینکتے ہیں جیسے پتہ نہیں سخاوت کا قلعہ ڈھا دیا ہو''۔

''تم کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔مگر مجھے تو لگتا ہے کہ تم بہت مزے میں ہو اور آسودہ زندگی گزار رہی ہو''۔چتکبری کے لہجے میں رشک نمایاں تھا۔

''ہاں یہ صحیح ہے مگر مت پوچھو کہ کتنی جدوجہد سے یہ جگہ ملی ہے مجھے''۔بھوری مسکرائی۔

''ہاں میں دیکھ رہی ہوں۔تمہیں تو باقاعدہ پلیٹ میں کھانا ملتا ہے۔ریڈی میڈ ہے شاید''۔

''ڈبّے کا ہے'' بھوری نے مختصراً کہا۔

''تبھی تو تمہاری صحت اتنی اچھی ہو رہی ہے''۔چتکبری لپچا کر بولی۔

''تمہیں پتہ ہے نا چتکبری۔اس گھر کی مالکہ نے کالی کو پالا ہوا تھا۔کالی ماں سے ولایتی اور باپ سے دیسی تھی۔اس لئے اس کا مزاج ہم سے کچھ مختلف تھا۔گھر گھر جھانکتی پھرتی تھی۔کہنے کو تو وہ مالکوں کی پالتو تھی مگر کھانے کو بس بچا کھچا ہی ملتا تھا۔گھر کے اندر وہ کالی کو گھسنے نہیں دیتے تھے۔باہر ہی ڈال جاتے تھے۔اسی میں سے ہم لوگ بھی چھینا جھپٹی کر لیتے تھے۔بس کچھ پیٹ بھرتا کچھ نہ بھرتا۔اوپر سے بلّے دیواریں کود کے بچاری کالی پر جھپٹتے۔بچے پیدا کرانے کے علاوہ انہیں کچھ آتا ہی نہیں۔کالی بچاری بیمار رہنے لگی تھی۔پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ نیچے پڑے خالی گھر میں کرائے دار آئے۔بڑے بھلے مانس لوگ ہیں۔ان کے ساتھ ایک غیر ملکی بلّا بھی تھا۔میں تو اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ایسا حسین، وجیہ، چمکدار آنکھیں، گھپے دار دم اور سفید، چٹا، جیسے دودھ میدہ، اللہ! ایسا لاڈلا ہے پفی۔ان لوگوں کا کہ کیا بتاؤں تجھے چتکبری۔خود جیسے مرضی گزارہ کریں مگر پفی کے لئے روز کھانے کا بندڈبہ آتا ہے، کبھی بسکٹ، کبھی کلیجی اور کبھی کچھ اور۔اس پر بھی پفی کو ایسا نخرہ ہے کہ چند منٹ بھی کھانا پلیٹ میں پڑا رہے تو کیا مجال کہ وہ منہ لگا لے۔مائیکرو اوون میں گرم کر کے تازہ کھانا مالکن چمچ سے کھلائیں تو کھائے گا۔ترکی نسل کا ہے۔میں تو چتکبری اس پر عاشق ہوگئی ہوں۔چال بھی اس کی ایسی متوالی کہ بس دیکھتے ہی رہو۔تو دیکھے گی تو تو بھی مر مٹے گی سچ''۔

''یہ بتا کچھ راہ ورسم بھی ہوئی تیری؟ کوئی میل ملاپ.....؟''

چتکبری نے شرارت سے بھوری کو آنکھ ماری۔

''ارے توبہ کر۔ایسا نٹ کھٹ کنھیا ہے۔ہم دیسیوں کو تو خاطر میں ہی نہیں لاتا وہ۔اس میں شاید وہ مردانہ حس ہے ہی نہیں یا مالکان نے ختم کروادی ہے۔تبھی تو بس ٹکر ٹکر بیٹھا دیکھتا رہتا ہے مجھے۔ورنہ دل تو میرا بھی بڑا مچلتا ہے اس کے لئے''۔بھوری نے گہری اداسی سے کہا تو چتکبری ہمدردی سے بولی۔

''ہاں!,اس سے کچھ بچے پیدا کر لیتی تو ہماری نسل بھی تھوڑی سنور جاتی،مگر خیر!اب بتا یہ سب تجھے پتہ کیسے چلا۔اتنی اندر کی باتیں؟''چتکبری نے تجسس سے کہا۔''اری میں کچن کی جالی سے اس طرف لگی بیٹھی جو رہتی ہوں۔باتیں سنتی رہتی ہوں۔جب پفی کھانا نہیں کھاتا یا پلیٹ میں کافی سا چھوڑ دیتا ہے تو اس کا وہ کھانا مالکان باہر میری پلیٹ میں ڈال دیتے ہیں۔چتکبری! تجھے کی بتاؤں، کیسا مزے کا ذائقہ دار کھانا ہوتا ہے۔سچ پوچھے تو اب چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے سوکھے ٹکرے میرے حلق سے نیچے اترتے ہی نہیں''۔بھوری نے گھمنڈ سے کہا۔''بڑی خوش قسمت ہے تو''۔چتکبری نے آہ کھینچی۔''مگر کیا کوئی اور برادری کا بھی ادھر نہیں آتا؟''

''یہ گھر کا پچھلا حصہ ہے نا اور ادھر پیچھے بھی کوئی گھر نہیں ہے۔کبھی کوئی آ بھی نکلا تو پفی کی غراہٹ سے ڈر کے بھاگ گیا یا میں

نے مار بھگایا۔ مجھ سے پہلے اس جگہ پر کالی قابض تھی۔ اس سے میرا بہنا پا تھا۔ وہ بیمار رہتی تھی۔ بہت تھوڑا کھاتی تھی۔ اس کا بچہ ہوا میرے حصے میں آ جاتا تھا۔ اس بیماری میں بھی بچاری بچے جنے جاتی تھی۔ بلّے بہت تنگ کرتے تھے اسے۔ وہ ٹھہری ایک نازک مزاج۔ پفی کے مالکوں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا۔ علاج کرایا۔ پھر اپنے کسی دوست کو تحفہ میں دے دیا مگر کالی وہاں سے بھاگ آئی۔ آخر کار مر گئی بچاری۔ چار بچے جنے تھے اس نے''۔

''اوہو.....'' چتکبری نے ملال سے آواز نکالی۔

''مگر یہ جو پفی ہے نا۔ بہت لگتا تھا کالی سے۔ کچھ حاسد بھی ہے اور مغرور تو بہت ہے۔ مجھ پر بھی کبھی کبھی غرانے لگتا ہے۔ حالانکہ میں کبھی کچن کے اندر داخل نہیں ہوئی۔ جالی کے ادھر ہی بیٹھ کے کھا پی لیتی ہوں۔ یہ کیا کم ہے کہ اچھی اور پیٹ بھر غذا مل تو جاتی ہے۔ شکر ہے خدا کا''۔ بھوری چپ ہوئی تو چتکبری نے کہا۔

''واقعی بھوری تو ایک دو بچے پیدا کر لیتی ہے پفی سے تو.....'' بھوری نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اری توبہ کر چتکبری، پفی کو تو نے دیکھا نہیں۔ کیسا غرّہ ہے اسے اپنی نسلی برتری کا۔ مگر لگتا ہے وہ مجھے پسند ضرور کرتا ہے''۔ بھوری نے پر یقین انداز میں کہا۔

''کیسے پتہ چلا تجھے؟'' چتکبری نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ایک دن میں کلوا کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ موسم بھی بہت رومینٹک سا ہو رہا تھا۔ میری اپنی طبیعت بھی کچھ مائل تھی اور کلوا تو .....توبہ ہے بھئی۔ پوری طرح مستی میں تھا مگر میں مسلسل اسے طرح دے رہی تھی۔ خاصی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی، ہم دونوں کے درمیان۔ اتنے میں پفی اندر سے نکل آیا۔ بس! کلوا کو دیکھتے ہی جیسے اس کے تن بدن میں تو آگ بھڑک اٹھی۔ غرا کے کلوا پر جھپٹا۔ کلوا بھی اس پر حملہ آور ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ گالیاں بک رہے تھے۔ وہ خی خار مچی ہوئی تھی کہ توبہ بھلی۔ میں انہیں چھڑانے کیلئے کبھی ایک کو پکڑتی کبھی دوسرے کو۔ مگر وہ تو دونوں بپھرے ہوئے تھے۔ پریشان ہو کر میں بھی مدد کیلئے چلّانے لگی۔ ہماری آوازیں سن کر پفی کا مالک باہر نکل آیا اور اس نے پفی کو کلوا کے خونخوارہ پنجوں سے بچانے کیلئے یکدم اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ مگر پفی اتنے غصے اور جنون میں تھا کہ اس نے اپنے مالک کے ہاتھوں کو بے دردی سے بھنبھوڑ ڈالا۔ لہولہان ہو گیا بچارا۔ پفی کو تو اندر چھوڑا اور خود ہسپتال چلا گیا۔ کئی دن غریب کے ہاتھوں پر پٹیاں بندھی رہیں''۔ خود بھی دو تین دن چپ چپ رہا۔ جیسے پشیمان ہو رہا ہو۔

''افوہ! ایسا جنونی ہے پفی؟ اور یہ سب اس نے تیری چاہت میں کیا؟'' چتکبری نے افسوس کیا۔

''پتہ نہیں'' بھوری تاسف سے بولی۔ ''چاہت کا کبھی اظہار تو نہیں کیا۔ البتہ کبھی کبھی جالی کے ادھر آ کر بیٹھ رہتا ہے اور بس چپ چاپ مجھے دیکھتا رہتا ہے''۔

اگر چاہتا نہ ہوتا تو کلوا پہ کیوں جھپٹتا؟'' چتکبری نے قیاس آرائی کی۔

''چتکبری! سچ پوچھو تو مجھے تو محبت کا پتہ ہی نہیں کیسی ہوتی ہے۔ تو خود سوچ! ہمیں تو بس ہر جگہ سے دھتکار اور پھٹکار ہی ملی ہے سدا۔ عیش تو ان غیر ملکیوں کے ہیں، ایسے ٹھاٹ سے رہتے ہیں جیسے کہیں کے نواب ہوں۔ گدے دار بستر، صاف پانی، اعلیٰ درجے کا کھانا، سیر و تفریح، علاج معالجہ اور گودوں میں اٹھنا پھرنا۔ ایک ہم ہیں کہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے در در جھانکنا پڑتا ہے۔ اگر کسی کو ترس

آ گیا تو چھوڑی ہوئی ہڈیاں ہمارے آگے پھینک دیں۔ ریزہ ریزہ بوٹی نوچی ہوئی۔ ورنہ ہشت ہشت کر کے بھگا دیا۔ سچ چتکبری مجھے تو اپنی اس ہتک پر رونا آتا ہے''۔ بھوری کا گلا رندھ سا گیا۔ چتکبری نے اسے دلاسا دیا۔ بولی۔

''چل بھوری دل چھوٹا نہ کر۔ شکر کر کہ تجھے تو کچھ اچھے لوگ مل گئے ہیں'' پھر بولی۔ ''لے تو اب میں چلتی ہوں۔ رب راکھا''۔

''اچھا خدا حافظ چتکبری۔ مجھے افسوس ہے میں تیری خاطر نہیں کر سکی۔ تھوڑا پہلے آ جاتی تو مل جل کر کھا لیتے۔ خیر! پھر بھی آنا کبھی!''

چتکبری نے چھلانگ لگائی اور دیوار پر چڑھ گئی۔ بھوری نے اسے نحیف قدموں چلتے دیکھا اور آنکھیں موند کے چنبیلی کی جڑ میں سکڑ کر لیٹ گئی۔

پھر موسم بدلے۔ دن اپنی رفتار سے گزرتے چلے گئے۔ پھی کے مالکان نے گھر بدل لیا۔ وہ کہیں اور چلے گئے۔ پھی کو وہ گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ کچن کے دروازے کے باہر جالی کے سامنے رکھی خالی پلیٹ پر مکھیاں بھنکتی رہیں اور پھر وہ بھی اڑ گئیں۔ بھوری سارا سارا دن بند دروازے کے سامنے امید و بیم کے سہارے اکیلی بیٹھی رہی۔ بھوک سے نڈھال ہوتی تو کسی چوہے کا شکار کر لیتی اور اس کے ہلکے، لجلجے گوشت کو اگل نگل لیتی۔ پھی کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور پھر گردن نہوڑا کے پڑی رہتی۔ یوں ہی ایک دن چتکبری کا گزر ادھر سے ہوا تو وہ گھر کی ویرانی اور بھوری کی حالت دیکھ کر دہل گئی۔ دیوار سے کود کر نیچے آئی۔ بھوری نے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا اور گردن نہوڑ ڈالی۔ چتکبری سارا معاملہ آناً فاناً سمجھ گئی۔ بھوری کے پاس بیٹھ کے رسان سے بولی۔

''چل اٹھ بھوری! کب تک یوں پڑی رہے گی۔ کہیں اور چل کر قسمت آزماتے ہیں۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے اور رزق کا ذمہ اس نے لیا ہے کہیں نہ کہیں تو ہمارا دانا پانی لکھا گیا ہوگا نا''۔

''ہاں یہ بات تو خیر ہے مگر چتکبری میں اسی گھر میں پیدا ہوئی یا یوں کہو کہ پہلی آنکھ میں نے اسی گھر میں کھولی۔ یہاں سے اب کہاں جاؤں؟ یوں بھی ہماری فطرت کے خلاف ہے یہ بات'' بھوری نے آنکھیں کھولیں اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''دیکھ چتکبری! روٹی تو بیشک مل ہی جائے گی جیسی تیسی مگر وہ.....پھی۔ اری اس کی خوشبو ہے اس گھر میں.....''۔

اری چھوڑ پگلی! ذرا سوچ کبھی کسی نے ہمارے ساتھ وفا کی ہے جو تو پھی کی یاد کو سینے سے لگائے یہاں پڑی ہے۔ کیا وہ کبھی یہاں آئے گا تجھے ملنے؟ باؤلی نہ بن، کب تک پڑی رہے گی اس ڈھنڈار گھر میں بھوکی پیاسی۔ اس زمانے میں سب روائتیں بدل گئی ہیں۔ ہماری مائیں بھی ہمیں سات گھر شاید اسی لیے جھنکواتی ہیں۔ چل اٹھ کھڑی ہو''۔ چتکبری نے ناصحانہ انداز میں کہا تو بھوری اٹھ کھڑی ہوئی۔ حسرت سے اس نے گھر پر نظر ڈالی۔ ایک طویل انگڑائی لی اور پھر وہ دونوں درختوں سے جھڑے سوکھے پتوں اور دھول مٹی سے اٹے راستے پر بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اس خواب نگر سے باہر نکل آئیں۔

دھوپ اونچے گھروں کی منڈیروں سے نیچے اتر آئی تھی اور دن نکھر انکھرا سا تھا۔

◆◆◆

تہ سنگ

خاقان ساجد

اسکول یونیفارم میں ملبوس مغموم اور اداس پپو خاصی دیر سے سیڑھیوں والے پُل پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ بائیں رخسار پر تھپڑ کا نشان تھا جسے وہ بار بار سہلاتا، گاہے دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنی ناک رگڑتا اور آنکھوں میں امنڈنے والے آنسو پونچھنے لگتا۔ اس کی پشت پر بھاری بستہ جھول رہا تھا جس میں تیسری جماعت کی کتابیں اور کاپیاں ٹھنسی ہوئی تھیں۔

جاڑوں کے دن تھے اور صبح کا وقت۔ اردگرد کی ہر چیز ٹھٹھری ہوئی تھی۔ اسٹیشن کی عمارت، کالونی کے کوارٹر، شیشم کے درخت، بجلی کے کھمبے، ریل کے سگنل، وہ بے شمار پٹڑیاں جو پُل کے نیچے کھلے میدان میں بچھی ہوئی تھیں، اور ان پر خاموش کھڑے ڈبّے، سب سکڑے سکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ مشرقی کیبن کے قریب بھاپ سے چلنے والا ایک مہیب کالا انجن، جو غالباً شنٹنگ کے لئے آیا تھا، اپنی چمنی سے گاڑھا گاڑھا دھواں اگل رہا تھا۔ یہ دھواں عجیب عجیب شکلیں بناتا ہوا آہستہ آہستہ کہر کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ ماحول میں بے نام سی اداسی گھلی ہوئی تھی۔

یہ ایک بڑا ریلوے جنکشن تھا، جہاں سے چھ سات لائینیں مختلف سمتوں میں نکلتی تھیں۔ دن رات کے مختلف اوقات میں بیسیوں مسافر گاڑیاں اور ایکسپریس ٹرینیں اس کے کشادہ اور طویل پلیٹ فارموں پر رکتیں اور سینکڑوں مسافروں کو اگلتی اور نگلتی ہوئی نئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہو جاتیں۔ مال گودام کے آہنی شیڈ کے نیچے غلّے کی بوریوں، کپاس کی گانٹھوں، فروٹ کی پیٹیوں اور نوع بہ نوع مال اسباب کے انبار لگے رہتے۔ لوکو شیڈ سے لے کر ریلوے یارڈ تک اور مال گودام کے اطراف سارا دن شنٹنگ میں مصروف انجنوں کی چھک چھک سنائی دیتی۔ آتشی اینٹیں بنانے والی فیکٹری کی چمنیوں سے ہمہ وقت سیاہ دھواں نکلتا رہتا۔

جنکشن پر کام کرنیوالے ملازمین کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ ان کی رہائش کے لئے اسٹیشن کے شمال اور جنوب میں دو بڑی کالونیاں تعمیر کی گئی تھیں جنہیں سیڑھیوں والا ایک آہنی پل آپس میں ملاتا تھا۔

پپو اسی پل پر کھڑا تھا۔ وہ اپنے کُتّے کے غم میں آنسو بہا رہا تھا جسے اس کے باپ نے، جو مال گودام کی واچ اینڈ وارڈ فورس میں وارڈن تھا، نجس گردانتے ہوئے غائب کر دیا تھا۔ یہ کتا اسے پلیٹر صاحب نے دیا تھا۔ وہ اس کے دوست اور ہم جماعت شیری کے ابو تھے۔ اسٹیل گرے کلر کے سوٹ، نکٹائی اور ہیٹ میں ملبوس گورے چٹے اور قد آور پلیٹر صاحب پپو کو بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کی پتلی کمانی والی گول شیشوں کی عینک، اس کے عقب سے جھانکتی ہوئی چمکدار آنکھیں، کرسٹل کے دستے والی خوشنما چھڑی، جسے وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ بجاتے بجاتے ہوئے پیدل دفتر جاتے اور بچوں کی طرح معصوم اور گول مٹول چہرے پر رونق افروز ان کی دوستانہ مسکراہٹ، اس کے دل کو بھا گئی

تھی۔ وہ جب انہیں سڑک سے گزرتے دیکھتا تو کھیل کود چھوڑ کر ادب سے سلام کرتا۔ جواباً وہ شفقت آمیز گرم جوشی سے قدرے بلند آہنگ میں الفاظ کو کھینچ کر ''بیٹا وعلیکم السّلام'' کہتے۔ اکثر وہ اس سے ہاتھ بھی ملاتے۔ وہ ایک شفیق اور مہربان انسان تھے۔ افسرانہ اکڑفوں ان میں نام کو نہیں تھی۔ پپو حسرت سے سوچتا۔ کاش! پلیٹر صاحب ہی اس کے ابّو ہوتے۔

اپنا لڑاکا اور ہتھ چھٹ ابا اسے قطعاً پسند نہیں تھا۔ وہ بیوی اور بچوں سے نہایت درشتی سے پیش آتا اور ذرا سی بات پر تھپڑ جڑ دیتا۔ نرمی اور گداز پن اسے چھو کر نہیں گزرا تھا۔ جب سے اس نے ایک متشدد مذہبی تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی، گھر والوں پر ایک نئی قسم کا قہر ٹوٹنے لگا تھا۔ ''یہ غلط ہے، وہ ممنوع ہے، یہ حرام ہے، وہ ناجائز ہے۔'' گھر میں ہر وقت یہی لیکچر چلا کرتا۔ بیوی شاہ پور کے ایک پیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ادبی زبان میں شریعت میں دی گئی آسانیوں اور رخصتوں کا ذکر کرتی تو اسے بُری طرح جھڑک دیتا۔ زور دے کہ کہتا کہ شریعت میں کوئی چیز یا تو غلط ہوتی ہے یا صحیح۔ درمیانی راستہ کوئی نہیں ہوتا۔ اٹھتے بیٹھتے اسے یاد دلاتا کہ وہ غیرت مند نیازی گھرانے میں بیاہی ہوئی ہے جس کی عورتیں آواز کا بھی پردہ کرتی ہیں۔ انہیں بخار چڑھے تو مرد ڈاکٹر کو اپنی نبض پر ہاتھ رکھنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ کالا فیشنی برقعہ پہننا نری بے غیرتی ہے۔ اصل پردہ ٹوپی والا سفید برقعہ ہے۔ لیکن خبردار! اس پر بھی کوئی بیل، بوٹا یا گل کاری نہیں ہونی چاہیے۔ یہ سب مردوں کو لبھانے کے حیلے ہیں۔ ویسے جب کپڑا، لتہ اور جوتی گھر بیٹھے مل رہی ہو تو عورت کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

دو کمروں کے چھوٹے سے کوارٹر میں بیوی عملاً ایک قیدی کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ قیدیوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس کے سرے سے کوئی حقوق نہیں تھے۔ حق زوجیت البتہ وہ باقاعدگی سے ادا کرتا۔ قدرت اس فرض شناسی پر ہر سال مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے اسے ایک اور فرزند بطور انعام عطا کر دیتی۔ پپو کو ملا کر سات بیٹے کوارٹر کی رونق بڑھا رہے تھے۔ سوائے پپو کے، سب کے سب باپ کی ڈِٹو کاپی تھے۔

عید کی آمد آمد تھی۔ پانچوں بڑے بچے ساتھ لئے وہ جوتوں کی دکان پر گیا۔ دکاندار سے اچھی بھلی شناسائی تھی۔ وہ جوتے پہناتے ہوئے سادگی اور بھولپن میں یہ کہہ بیٹھا ''نیازی صاحب! باقی بچے تو ہو بہو آپ کی تصویر ہیں۔ مگر یہ بچہ (پپو) آپ پر نہیں ہے۔ اپنی ماں پر گیا ہوگا؟'' یہ سننا تھا کہ موصوف کا پارہ چڑھ گیا۔ حالتِ غضب میں اسے فرش پر پٹخا اور سینے پر چڑھ کر گلا دبوچ لیا۔

''سچ سچ بتا بے غیرت انسان! تم نے اس کی ماں کو کب اور کہاں دیکھا ہے؟''

اپنے مخصوص علاقائی اور سماجی پسِ منظر کی بدولت بہت انا پرست واقع ہوا تھا۔ وہ بغیر مطلب کے کسی سے سلام بھی نہ لیتا تھا۔ ایک دفعہ ٹرین پر سفر کرنا مقصود تھا۔ گاڑی کے قریب پلیٹ فارم پر ایس۔ ٹی۔ ای (اسپیشل ٹکٹ ایگزیمینر) کو کھڑے دیکھا تو اس کے پاس چلا گیا۔

''السّلام علیکم۔ باؤ ایس گڈی نال تو ایں؟'' (باؤ صاحب! اس گاڑی کے ساتھ آپ ہیں؟)

جب اس نے نفی میں جواب دیا تو تاسف سے بولا:

''وت میں تن ہنجے پا سلام کریناں!'' (پھر میں تجھے بلاوجہ سلام کر رہا ہوں!)

ٹرین پر چڑھا تو ایک سیٹ خالی نظر آئی۔ اس پر کسی مسافر کا رومال پڑا تھا۔ اسے ہٹا کر بیٹھنے لگا تو ساتھ والے مسافر نے کہا:

''جناب! یہاں بندہ بیٹھا ہے۔''

''تا میں بندہ ناں؟'' اسے گھورتے ہوئے الٹا سوال کر دیا۔

وہ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

ہر شخص اس سے کنّیکترا تا۔ گھر میں داخل ہوتا تو بچے اِدھر اُدھر چھپ جاتے۔ پپو گھر کے ماحول سے اس قدر بد دل تھا کہ زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزار دیتا۔

کوارٹروں سے تھوڑے فاصلے پر ریلوے کے افسروں کی کوٹھیاں تھیں۔ پلیٹر صاحب اپنی فیملی کے ساتھ وہیں مقیم تھے۔ درختوں، پھولوں، پنجروں اور جھولوں سے سجی ان کی خوبصورت کوٹھی اسے جنت سے کم نہ لگتی۔ وہ شیری کے ساتھ اس کے سبزہ زاروں میں کھیلتا۔ کھانے کے لئے اسے اچھی اچھی چیزیں مل جاتیں۔ شیری کی دونوں بہنیں اس سے بہت پیار کرتیں۔ شیری کی امّی بھی محبت سے پیش آتیں۔ اس کی دادی جان سے وہ مزیدار کہانیاں سنتا۔ کوٹھی کے سبھی مکین اس کی نظروں میں طلسم ہوشربا کی کہانیوں کے جادوئی کردار تھے۔ ہر ایک کا اپنا منفرد شوق تھا۔ پلیٹر صاحب پرندوں سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے پنجروں میں طرح طرح کے خوبصورت پرندے پال رکھے تھے۔ ایک بڑے تالاب میں بطخیں، راج ہنس اور پیلیکان تیرتے رہتے۔ ان کی ایک پالتو کتیا بھی تھی جس کا نام ایلس تھا۔ روسی نسل کی لمبے سفید بالوں والی کتیا حیرت انگیز کرتب دکھاتی تھی۔ پھینکا ہوا گیند بھاگ کر اٹھا لانا، جمپ لگا کر رنگ کے اندر سے گزر جانا۔ ہوا میں اُچھالے ہوئے روئی کے ٹکڑے کو چٹاخ کی آواز سے منہ میں پکڑ لینا، کرسی پر انسان کی طرح بیٹھ جانا۔ وہ سبز ساٹن کے جھالر دار غلاف والی ٹوکری میں آرام دہ گدیلوں پر سوئی رہتی یا نجمی باجی کے پاؤں میں لوٹتی نظر آتی۔ نجمی باجی مصوّرہ بھی تھیں۔ ڈرائنگ روم، بیڈ رومز اور کوٹھی کے برآمدوں میں جگہ جگہ ان کی بنائی ہوئی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ جب وہ لان میں رکھے ایزل پر کینوس چڑھائے رنگوں اور برشوں سے تصویر بنانے میں مشغول ہوتیں تو وہ پاس کھڑا ہو کر بڑے غور سے سارے عمل کا جائزہ لیتا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر وہ بھی تصویریں بنانا سیکھ گیا تھا۔ صلاحیت تو اس میں پہلے ہی تھی۔ کوارٹروں کی دیواروں پر کوئلے اور چاک سے تصویریں بنایا کرتا۔ باجی نے حوصلہ افزائی کی تو اس میں نکھار پیدا ہو گیا۔ ایک روز اس نے باجی کو بہت اچھی تصویر بنا کر دکھائی تو انہوں نے شاباش دی اور انعام میں رنگوں کی ڈبیا اور پنسلیں دیں۔ وہ چہکتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور ماں کو دکھائیں۔ وہ خوش تو ہوئی مگر اسے منع کیا کہ باپ کہ ہرگز نہ دکھائے۔ وہ تصویر کشی کے سخت خلاف تھا۔

سلمٰی کو موسیقی سے لگاؤ تھا۔ وہ سارا دن ڈیک پر گانے سنا کرتی۔ وہ ستار بجانا بھی سیکھ رہی تھی۔ آبنوسی رنگت کا ایک ادھیڑ عمر استاد ہفتے میں تین بار سبق دینے آتا۔ لان میں بچھے تخت پوش پر ستار کندھے سے لگائے، غلافی آنکھیں موندے، اپنی مخروطی انگلیوں سے تاریں چھیڑتی ہوئیں سلمٰی باجی پپو کو بہت پیاری لگتیں۔ ایک دفعہ اس نے یونہی گھر میں کہہ دیا کہ وہ سلمٰی باجی سے ستار بجانا سیکھ رہا ہے۔ اس پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب یہ میراثی بنے گا۔'' باپ پپو کی ماں سے مخاطب ہوا ''اس کا قصور نہیں۔ جب شکل نائکوں پر ہے تو کام بھی انہی جیسے کرے گا۔ کہلاتے تم لوگ بھی نیازی ہو مگر مجھے یقین ہے کہیں نہ کہیں پیوند کاری ضروری ہوئی ہے.....''

بیوی کا چہرہ غیرت سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگی:

''وہ لوک فنکار جس کی کیسٹیں تم بڑے شوق سے سنتے تھے، تمہارا رشتہ دار ہے میرا نہیں۔ تم نے ایک بار مجھے خود بتایا تھا!''

''وہ تو میں نے یونہی کہا تھا۔ ٹوہر بنانے کے لئے۔'' وہ کھسیانا ہو گیا ''خیر چھوڑو۔ وہ میرا زمانہ جاہلیت تھا۔ تم بچو کو سمجھاؤ کہ موسیقی

ہمارے مذہب میں حرام ہے۔''

اچھا! جن ولیوں اور صوفیوں نے قوالی ایجاد کی، اسے دین کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا، انہوں نے حرام فعل کیا؟ بتاؤ اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت داؤدؑ کو سریلی آواز کیوں عطا کی تھی.....؟''

''بس بس! زیادہ بقراطیاں نہ جھاڑ۔ یہ دین شریعت کے معاملے ہیں جو تیری عقل میں نہیں آ سکتے۔ بجائے اسے سمجھانے کے فضول بحث کر رہی ہے۔''

''چلو میں ہی فضول بحث کر رہی ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو بات تم خود پینتیس سال میں سمجھے، وہ اس معصوم کو آٹھ سال کی عمر میں سمجھانا چاہتے ہو؟''

جب اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ پپو کو جھاڑنے لگا۔

''مت جایا کر، ان دوزخیوں کی کوٹھی میں۔ وہ خود تو گمراہ ہیں، تمہیں بھی کر دیں گے۔ کان کھول کر سن لے، دوبارہ ادھر گیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

پپو جانتا تھا کہ باپ یونہی بولتا رہتا ہے۔ اس نے اس کی بات ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑا دی۔

پلیٹر صاحب کی کتیا پورے دنوں پر آئی تھی۔ اس لئے اس کی خوب خدمت ہو رہی تھی۔ کوٹھی کے پچھواڑے ڈربے میں فورسڈ ریسٹ (Forced Rest) پر تھی۔ اس کے چیک اَپ کے لئے ایک نوجوان ویٹرنری ڈاکٹر باقاعدگی سے آتا تھا۔ چند روز بعد اس نے چھ بچوں کو جنم دیا۔ ماں کے وجود سے لپٹے تھنوں سے لپر لپر دودھ پی رہے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں بڑے ہو گئے اور لان میں دوڑنے لگے۔ ان کے جسم پر ریشم جیسے سفید لمبے بال اگ آئے۔ جب پلیٹر صاحب ان پلّوں کو دوست احباب میں بانٹنے لگے تو پپو نے بھی ایک پلّے کی فرمائش کر دی۔ جو پلیٹر صاحب نے اسے دے دیا۔

چونکہ پپو نے دادی جان سے اصحاب کہف کا قصّہ سن رکھا تھا اس لئے اس نے کتے کا نام قطمیر رکھ دیا۔ وہ اسے کاندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرتا۔ اپنے ہاتھ سے اسے دودھ پلاتا اور اس سے بہت پیار کرتا۔

اس کا باپ ایک ماہ کی پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے والٹن چلا گیا تھا۔ جب وہ لوٹا تو اس نے صحن کے کونے میں مٹی اور اینٹوں سے بنا کھڈا دیکھا۔ اس میں ایک پلّا سو رہا تھا.....

''یہ کتورا گھر میں کون لایا ہے؟'' اس نے درشت لہجے میں سوال کیا

''پپو کو پلیٹر صاحب نے دیا ہے۔'' بیوی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''کدھر ہے وہ خبیث؟''

''ذرا باہر نکلا ہے''۔

''تم نے اسے یہ نجس جانور رکھنے کی اجازت کیوں دی؟ جانتی نہیں ہو جس گھر میں کتا ہو وہاں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا۔''

''رحمت کا فرشتہ تو پہلے بھی اس گھر میں کبھی نہیں آیا.....'' وہ بُڑبڑائی۔ پھر کسی موہوم امید پر لجاجت آمیز لہجے میں کہنے لگی:

''پپو دے پیئو! کبھی تو بچوں کا دل رکھنے کے لئے تھوڑی سی نرمی دکھا دیا کرو۔ شکار اور رکھوالی کے لیے کتا رکھنے کی اجازت ہے۔''

''تم اپنی بک بک بند کرو۔ یہاں کون سا خزانہ ہے جس کی رکھوالی کرے گا۔''

وہ اسے جھاڑ پلا کر بڑے بیٹے کی طرف مڑا ''ظاہری! یہ کتا غائب کردو۔ دو منٹ کے اندر۔ دوبارہ مجھے یہ پلید یہاں نظر نہ آئے۔''

پھر اسے قریب بلا کر کان میں کچھ کہا۔ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور پلّے کو اٹھا کر کوارٹر سے باہر نکل گیا۔

کتا کل سے غائب تھا۔ پپو اسے دیوانوں کی طرح تلاش کر رہا تھا۔ کل سے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ آج صبح جب وہ اسکول جانے سے بھی انکاری ہو گیا تو باپ بپھر گیا۔ اس کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ مار کر اسے اسکول کے راستے پر چھوڑا اور خود بکتا جھکتا ڈیوٹی پر چلا گیا۔

مشرقی سمت سے اسٹیشن کی حدود میں ایک ایکسپریس ٹرین داخل ہو رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر ایک عجیب سی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

بھاگتے ہوئے قلی، بولائے ہوئے خوانچہ فروش، گھبرائے ہوئے مسافر۔ مرد، عورتیں اور بچے۔ پل کے اوپر بھی لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔

پڑوسیوں کا بچہ ٹیڈی ادھر سے گزرا تو پپو کو دیکھ کر رک گیا:

''میں بتاؤں تمہارے ابّے نے کتا کدھر کیا ہے؟ مال گاڑی کے ڈبے میں ڈالویا ہے جو کراچی جا رہی تھی!'' اس نے پپو پر جیسے کوئی بم گرا دیا۔

''جھوٹ مت بولو'' پپو نے بے یقینی سے کہا

''سچ کہہ رہا ہوں۔ اللہ کی قسم۔''

اس کی قسم سن کر پپو نے اسٹیشن کی طرف دوڑ لگا دی۔ دو منٹ بعد وہ اس پلیٹ فارم پر تھا جہاں کراچی جانے والی ایکسپریس ٹرین کھڑی تھی۔

اب پپو کا باپ مدت سے عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر بیٹھا دھاڑیں مار مار کر ایک ہی دعا مانگتا ہے:

''میکو ہک واری مینڈا پپو ملاؤ ہا۔ میں اس کوں داہ کتے گھن دیساں!''

(مجھے ایک بار میرے پپو سے ملا دو۔ میں اسے دس کتے لے دوں گا)

◆◆◆

"مجھے لوگوں میں
مُنفرد بنائے...
میری نرم و ملائم
اور شگفتہ جِلد"
تبت سنو کے تازگی بخش اجزاء
جلد کو ریشم کی طرح نرم و ملائم بنائے۔
چھائیاں، داغ دھبے دور کرے۔
چہرے کی زائد چکنائی کو جذب کرے۔
جلد کو گرد و غبار سے بچائے۔
جلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھے۔
Rs. 3/-
Tibet
Keeps skin soft and smooth
Tibet
Tibet
Tibet
Tibet
تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
TS/03/33/2K5

میرا کنبہ

ڈاکٹر زین السالکین سالک

مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کبھی یہ سوچا ہو کہ میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میرے لئے یہ خیال بے معنی سا ہے۔ شاید اس لئے کہ میں ہر روز ہر لمحہ مرتا اور مر مر کر جیتا ہوں۔ میں کسی خودکار آٹے کی چکی کی طرح زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے اس کی یا کسی بھی پن چکی کی آواز کسی کوئیل کی کوک کی طرح کبھی نہیں لگتی۔

آج میرے گامے اور بالے کتنے دنوں بعد ایک ساتھ سوئے ہیں۔ پوری ایک ایک روٹی کھا کر اور رج کر پانی پی کر۔ اللہ بھلا کرے چودھری نور کا۔ میں نے بھی پوری روٹی کھائی ہے۔ ایک خیال ابھی مجھ سے ہو گزرا ہے کہ میری زندگی اور مجھ سے جڑی میرے مختصر سے اس عجوبہ روزگار کنبے کی عبرت آموز زندگی کی مثال اب کون سا پیغمبر اپنے پیروکاروں کو خدا کے قہر سے ڈرانے کے لئے دے گا۔

نصیحت کے دو بول بولنے کے دوران.....!

آج مجھے نصیباں بہت یاد آ رہی ہے۔ اسی جھلنگی پلنگ منجی پر بیٹھے بیٹھے اور کڑھتے کڑھتے اس نے اپنی زندگی گزاری ہے۔ اسی پر اس نے گامے، بالے اور کامی کو جنم دیا تھا..... مائی سکنی نے یہ جا چے کرائے تھے۔ گامے اور بالے اس کی زندگی کے مشکل ترین کیس تھے..... میں آج سوچتا ہوں کہ کامی کی ماں کے اگر اسقاط حمل ہو گئے ہوتے تو شاید ہم کسی آنے والے دنوں کے طوفانوں کے عذاب سے بچ جاتے۔ اور میں آج دنیا کے سامنے اتنا بے بس اور خدا کے سامنے یوں مقابل نہ کھڑا ہوتا۔ اور چوہدریوں، ملکوں، پٹواریوں جیسے انسانوں کے آگے جھولی پھیلا کر انصاف کی بھیک مانگنے والوں کے سے انداز میں ''چاہے زبان سے مانگو نہ مانگو اگر نیک نیتی ہو گی تو جائیز مراد ضرور پوری ہو گی۔'' میں نے گاؤں کے مولوی کے قصّے میں اکثر سنا ہوا تھا۔ اور مجھے اس پر پورا یقین بھی تھا۔ لیکن یہ جب کی بات ہے جب گاؤں کی خوبصورت ترین لڑکی سے شادی کی خواہش میرے دل میں پہلی بار جاگی تھی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ میں کل اس خوبصورت لڑکی کو ایسے کسی جہنم کی طرف لے جاؤں گا جس میں اپنے حسن سے بے پرواہ وہ صبر و شکر کی پُتلی دن رات میری سکھ کی جنت کے ساتھ جھلسے گی۔ انسان جب دنیا کی خوبصورتی میں الجھ رہا ہوتا ہے۔ تو دور پرے ساتوں آسمانوں کے اوپر بیٹھا شاید کوئی زیرِ لب ہنس رہا ہوتا ہے۔

مجھے یہ آج بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہ سب انجام اسے کرنا ہوتا ہے تو وہ یہ کھیل رچاتا ہی کیوں ہے؟ ہم سے کیوں کھیلتا ہے؟ ہماری قسمت ایسی کیوں بناتا ہے کہ ہم اپنے وجود کو اپنی روح کو نوچ بھی نہ سکیں۔ لیکن میں سہتے سہتے بے بس ہو چکا ہوں۔ اور اتنا ڈھیٹ ہوں کہ جئے جا رہا ہوں۔ کہتے ہیں کہ درد جب حد سے گزر جاتا ہے تو کبھی ہنسی بھی آ جاتی ہے۔ ہاں میں بھی ہنستا ہوں کبھی ویرانے میں جا کر زور زور سے اپنے آپ کو تمام بندھنوں سے آزاد کر کے میں رونا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھ سے رویا نہیں جاتا۔ شاید میرے آنسو میرے بڑھاپے کی

دیگر رطوبتوں کی طرح سوکھ چکے ہیں۔ میرے حلق میں پیاس سے کانٹے چبھتے رہتے ہیں لیکن میں اس میں پانی کے دو بوند نہیں ٹپکا تا..... تا کہ پیاس کا احساس زندہ رہے۔ شاید میں کسی دن شدت پیاس سے رو دوں۔ میرے چہرے کی جھریوں نے آنکھوں کے کنوؤں سے خشک ہوتی جلد کی نہریں کھود رکھی ہیں۔ بہتے آنسوؤں کی نہروں کے استقبال کیلئے.....لیکن کوئی نمکین پانی انہیں سیراب نہیں کرتا۔

مجھے یاد ہے کہ کیسا کال پڑا تھا۔ ان دنوں جب گاؤں کا گاؤں خالی ہو گیا۔ لوگ ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ صرف میرا کنبہ بچا تھا۔ جو اتنا بے حس اور بے بس تھا کہ یہاں سے جانے کا تصور تک نہ کر سکا۔ اگر وہ کرموں جلی اتنی صابر نہ ہوتی تو میرے پاؤں بھی اس دھرتی ماں کو چھوڑ چکے ہوتے۔ ہم جانے کہاں جا کر برباد ہوتے لیکن نہ جانے وہ زندگی بھی کون سی ایسی اچھی زندگی ہوتی کہ اسے ہم نامعلوم زندگی پر ترجیح دیتے۔ ہمارے لئے یہاں وہاں زمین آسمان ہر طرف جہنم ہی جہنم تھا۔ اسکے دن پورے ہو چکے تھے۔ اس شام اچانک اسے دردِزہ اٹھا میں لالٹین لیئے تہبند سنبھالتا، گرتا پڑتا تقریباً ہوا گیا تھا ماسی سُکی کو بلانے۔ وہ سخت سراسیمگی کے عالم میں کہیں قافلہ نہ چھوٹ جائے۔ پرانے دکھ سکھ کی یادوں کے دھاگوں سے بندھی چلی آئی تھی۔ سخت گھبراہٹ کے عالم میں اس نے زچہ کی مدد کی۔ لیکن پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اور پھر ان کیسز میں جیسے ہوتا ہے بچہ کو آکسیجن کی کمی کا سامنا ہوا۔ وہ بہت دیر سے رویا۔ سُکی سنبھال نہ سکی۔ شاید اسکے یہ حالات نہ ہوتے تو وہ زیادہ بہتر انداز میں اپنا کام کرتی۔ لیکن اس طرح سے شاید قسمت کا لکھا پورا نہ ہوتا۔ بچہ آخر کار جب رویا تو ہم سب نے سکھ کا سانس لیا۔ بچہ کا منہ، ہونٹ، چہرہ، زبان سب نیلے ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ گلابی ہونے شروع ہوئے۔ سُکی چند ہدایات دے کر اور صفائی کر کے نال اور آلائش کو زمین میں گاڑنے کی ہدایات دے کر چلی گئی۔ کیونکہ اس کا سمے نکلا جا رہا تھا۔ صبح صادق ہونے والی تھی۔ ابھی پو پھوٹی تھی اس نے ابھی کچھ اور تیاری کرنی تھی۔ آخری سمیٹا سماٹی کرنی تھی۔ میرے پاس اسے دینے کیلئے ایک انڈہ دینے والی دیسی مرغی بچی تھی۔ میں نے اسے کچھ گڑ بھی دیا۔ ہمارے پاس زچہ کی خصوصی تو کجا محض پیٹ بھر خوراک دینے کیلئے بھی حسبِ معمول کچھ نہ تھا۔

میں کچھ حاصل کرنے کیلئے سوچ رہا تھا آنے والے ہمارے دن کچھ بھی اچھے نہ تھے۔ ننھا کھلونا ہمیں بند مٹھی کا جگنو لگتا۔ اور ہماری خوشیوں کا محور.....وہ بڑھتا گیا۔ جو چند محلے والیاں رہ گئی تھیں ان کی اس پر نظر رہتی۔ اسکی نشو ونما کے ہر سنگِ میل کا موازنہ اپنے بچوں سے کرتیں۔ دوسرے بچوں کے مقابلے میں وہ ہر چیز آہستہ کر رہا تھا۔ اور پھر ایک دن اچانک ہماری زندگی میں اس وقت بھونچال آیا جب گامے کو تیز بخار نے یکا یک آ لیا۔ اور اسے جھٹکا لگا۔ ہماری دنیا پیروں سے نکلتی محسوس ہوئی۔ کسی طرح تانگے میں لے کر ہم سرکاری ڈسپنسری کی طرف بھاگے۔ ڈاکٹر نے فوری طبی امداد دے کر جھٹکوں کو تو قابو کر لیا مگر ہماری زندگی میں یہ کہہ کر آگ لگا دی کہ بچے کو ذہنی فالج ہے۔ ہماری دنیا تاریک ہوتی چلی گئی.....اسے جھٹکے زیادہ قلیل عرصے سے متواتر لگنے لگے اور پھر بخار کے بغیر بھی اسے جھٹکے لگے جاتے۔ شہر کے ہسپتالوں کے کئی چکر گاؤں والوں کی مدد سے ہم نے لگائے اور آخر کار تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اور اسے بیٹھے تکتے رہتے۔

ہمارا برا وقت اگر کوئی تھا تو یہی تھا۔ لیکن جب برے دن مقدر بن جائیں تو ان کی شدت اور ایک سے بڑھ کر ایک برے واقعات و حالات اور مصیبتیں اپنے معنی کھونے لگتیں ہیں۔ ہمارے دل پتھر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ صبر آتا گیا اور ہم کسی معجزے کے ہونے کے انتظار میں زندگی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے گئے۔ لیکن ابھی قسمت کے امتحان ختم نہیں شروع ہوئے تھے۔ یہ ہم نے کچھ عرصے بعد جانا۔ لگتا تھا کہ گامے کی بیماری سے میں نے کچھ نہیں سیکھا اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا اور جب گامے کی ماں کو الٹیاں آنی شروع ہوئیں تو میں نے

اپنے ایک اور گناہ سرزد ہو جانے پر اپنے آپ کو کوسنے دینے شروع کیئے۔ جب پیٹ کی آگ بجھانے کو کچھ نہ ہو تو گاؤں کے مرد کی تفریح کا واحد ذریعہ یہی رہ گیا تھا۔ جس میں کوئی خرچہ نہ تھا۔ میں حقہ پینے کے قابل بھی نہ تھا۔ کبھی چوپال میں کسی اور کا ایک آدھ کش لگا لیا تو لگا لیا۔ اللہ اللہ خیر سلا..... تمباکو کوئی مفت تو نہیں ملتا تھا میں جان توڑ کر جو محنت کر سکتا تھا کرتا تھا۔ چکی پیسنے، چارہ ڈالنے، مویشی چرانے لے جانے، کھیتوں کی فصلوں میں کام کرنے، باغ سے پھل توڑنے، نالیاں، کنویں کھودنے سے لے کر اپلے تھوپنے تک مجھے عورتوں والے کام میں بھی عار نہ تھی۔ لیکن گاؤں والوں کے پاس اجرت دینے کے لئے پیسے سے زیادہ چیزیں ہوتی تھیں۔

شہر کمانے میں گامے اور اسکی ماں کو چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ کر پاتا۔ میں نے کئی بار سا ہوکار سے بیاج پر قرضہ بھی لیا۔ اور راتوں کو بھی کام نمٹائے تا کہ دن میں دوسرے کام کرنے کا وقت نکل آئے۔ لیکن یہ سب میرے کنبے کی ضروریات کیلئے قطعاً ناکافی ثابت ہوتا۔ اولاد ماں باپ کیلئے قدرت کا تحفہ ہوتی ہے جس کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے لیکن کچھ تحفے انسان کی حیثیت سے بہت بڑھ کر ہوتے ہیں۔ جن کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تحفے مانگے بغیر مل بھی جاتے ہیں۔ ہم نے بھی یہی جانا تھا۔ یہ ہمارے صبر کی انتہا تھی یا نہیں۔ بہر حال ہم دوسرے تحفے کے انتظار میں دست بستہ تھے کہ قدرت ہمیں کیسا نوازتی ہے۔ پہلا بیٹا تھا۔ ہم بیٹی کی آس میں تھے اپنے تئیں سمجھتے تھے کہ لڑکی ہونے کے ناطے پیدائش کی مشکلات شاید آسانی سے جھیل لے گی۔ اور اگر بیٹا صحت مند ہو گیا تو ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔ خدا کا کرنا بیٹا ہوا۔ اور پیدائش میں کوئی پیچیدگی اس دفعہ نہ ہوئی۔ اس کی وجہ کافی حد تک ہسپتال کی ڈلیوری تھی۔ ہمارے ذہن میں ڈاکٹر کی سمجھائی باتیں گھر کر گئیں تھیں۔ اب کی دفعہ میں نے پیشگی ہسپتال لے جانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ میں ایک کاشتکار، ہاری، یا پھر کام کرنے کے لحاظ سے ہرفن مولا تھا۔ جب دماغ میں کوئی دھن سوار ہو تو نہ کمزوری نہ بڑھاپا آڑے آتا ہے۔ میں نے شادی بھی دیر میں کی تھی۔ جس کی وجہ آپ خود ہی سمجھ جائیں گے.....

بالے کی بخیر و عافیت پیدائش سے ہم قدرت کے انصاف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ اس بیٹے کو خدا کی سچی نعمت سمجھنے لگتے تھے۔ پہلے کے ساتھ جو پیش آیا۔ کم از کم دوسرا تو صحت مند تھا۔ ہم نے اپنے مستقبل کے حسین خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ اور اسکی پرورش میں اپنے حیثیت سے بڑھ کر کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بالا اپنی نشو ونما ٹھیک کر رہا تھا۔ ہاں ایک بات ہم نے نظر انداز کی تھی کہ وہ اپنی ماں سے نگاہیں نہ ملاتا تھا۔ اور عام بچوں کی طرح شاذ و نادر ہی مسکراتا۔ بہت زیادہ روتا بھی نہیں تھا۔ لیکن ان چیزوں پر بیکار کا غور کرنے کے خیال کو وہم سمجھ کر جھٹک کر پرے کر دیتا۔ وہ بیشتر ماں کے دودھ پر زندہ تھا۔ لیکن ماں کی غذا پر مناسب توجہ نہ دی جا سکی۔ اور وہ کرموں والی سوکھتی جا رہی تھی۔ میں حتیٰ کہ المقدور کمانے کی کوشش کرتا اور جو غذا اجناس یا بیر، پھل، دودھ میسر آتے اسے کھلانے کی کوشش میں لگا رہتا۔ اور حسبِ گنجائش اسے دینے کی کوشش کرتا۔ اس کے میکے سے پنجیری، مکھانے بھی ناشتہ دان بھر کر آیا تھا۔ ہماری ہموار زندگی میں پھر تہوار چپکے سے آتے گزر جاتے رمضان اچھا گزرتا اڑوس پڑوس سے کچھ نہ کچھ کھانا افطاری آ جاتا۔ دن تو خیر روزے میں گزرتا۔ اسے گزرانے کیلئے تگ ودو کی ضرورت نہ پڑتی۔ وقت نے اپنے ساتھ بالے کو کھینچ کر لمبا کرنا شروع کر دیا تھا.....

البتہ وہ بھی کوئی خاص وزن نہ بڑھا سکا۔ دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بہت زیادہ گھلتا اور کھیلتا نہیں تھا۔ ہم نے اسے شرمیلا جانا اور اس پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اور پھر جیسے ڈیڑھ سال کی عمر میں ایک روز اچانک بہت زور کی بجلی کڑکی طوفان آیا اور اسے دیوانگی کا دورہ پڑا۔

ہم نے موسم سے خوفزدہ ہونے پر اس کا ردِعمل سمجھا۔ پہلے اس کی ماں نے پھر میں نے اسے سینے سے لگا کر چمٹایا اور بہت زور سے بھینچا بھی لیکن اس پر اس کا الٹا اثر ہوا اور اس نے تشدد اختیار کیا۔ کبھی سر کو دیوار سے ٹکرانا کبھی چیزیں ہم پر اٹھا کر پھینکنا۔ مٹی کے آدھے سے زیادہ برتن جو اس کے ہاتھ لگے توڑ ڈالے۔ ماں کا آئینہ بھی چکنا چور کر دیا اور کنگھی توڑ دی۔ اور میری قمیض اور ماں ڈوپٹہ پھاڑ ڈالا۔ محلے والوں نے مشورہ دیا کہ مولوی صاحب سے دم کرایا جائے وہ بھی ایک آدھ بار کے بعد آنے سے ہچکچانے لگے۔ شہر بروقت لے جا کر اس کا علاج کرانے کا خیال مجھے بار بار آتا۔ لیکن اسے لے جانا محال تھا۔ اور جب ہسپتال میں ذہنی امراض کے ڈاکٹر نے قیمتی ادویات تجویز کیں تو وہ گنجائش سے باہر تھیں۔ ان کے مطابق مرض لاعلاج تھا۔ ہاں البتہ مسکّن ادویات سے کنٹرول قابلِ قبول حد تک ممکن تھا۔ لیکن بار بار مریض کو ہسپتال لانا جب تک کہ دوا موافق نہ آ جائے میرے ذرائع اور استعداد سے باہر تھا۔ اور آخر کار مجھے مجبوراً اسے زنجیر اور کڑے کا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

گاؤں کے لوہار نے ترس کھا کر بنا دیا۔ اپنے اور محلے والوں کو اس کے تشدد سے روکنے کا دوسرا طریقہ سوائے ادویہ کے جو کھلانا بھی تقریباً ناممکن تھا۔ اس کی حوائج ضروریہ میرے ذمہ تھیں۔ ہمارا مستقبل ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ خوابوں کی ایسی بھیانک تصویر شاید ہی کسی نے دیکھی ہو۔ پہلی بار سمجھ میں آیا کہ اولاد کی خوشیوں کی جگہ اگر دکھ لے لیں تو جہنم کا عذاب کیا ہوتا ہے۔ یہ کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے ہم میں اسے سہنے کی سکت مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ ہم چلتی پھرتی زندہ لاشیں بن گئے تھے۔ کٹھ پتلی کھیل کے دو کردار جو اپنی ڈوری سے بے اختیار ہیں، مسلسل حرکت میں تھے۔ یہ ڈیڑھ دو سال بھی گزرے۔ اب زندگی مسلسل کسی گناہ کا نام ہی رہ گئی تھی۔ لیکن انسان بہت ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔ حد سے زیادہ پریشانیوں میں اپنے عقل و شعور کو کھڑکیاں زیادہ زور سے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔ ہاں ٹھیک دو سال بعد کامی کی پیدائش ہوئی تھی۔ اسے کرماں والی نے پیٹ کی کھرچن کہا تھا۔ اس کی حسن و جوانی کو صرف تین بچوں نے گھن لگا دیا تھا۔ میر کمر بھی جھک گئی تھی۔ وقت سے پہلے میں سٹھیا گیا تھا۔ کوئی بھی جسمانی کام اس پھرتی سے کہاں ہوتا۔ سن رسیدگی اپنی حد تک آ چلی تھی۔ اور میں ابھی تک زندہ تھا۔ خود اپنی زندگی کے بارے میں مجھے سوچنے کا موقع دیا ہی نہیں گیا تھا۔ حالات اپنی رو میں مجھے روندتے چلے گئے تھے۔ اور حالات کی چکی جب لمبی چلے تو خوشی خوشی کی طرح محسوس نہیں ہوتی۔ بس ایسے ہی زندگی میں در آتی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہم بھی قسمت کے مختصر خوشی اور پھر طویل غم کے کھیل میں بالکل بے حس ہو چکے تھے۔ ہمارے جذبات و احساسات کند تھے۔ ہم ایک طرح سے گامے کی پیدائش سے ڈرے ڈرے سے تھے کہ کہیں یہ خوشی منانے کے جرم میں دکھوں کے متواتر موسم ہماری زندگیوں میں پھر سے گھس آئیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا۔ ہم اپنی خوشی کے اظہار کو یونہی بھینچتے دباتے رہے اور لٹّو کی سی گردش سے موسم اور فصلیں گزرتی رہیں۔ بہار، بھاگ، ساون بھادوں اور پت جھڑ..... کامی نے بھی بچپنے، لڑکپن، نوعمری گزاری اس کی مسیں بھیگنے لگیں۔ تو اسے قالین بنانے کے کارخانے میں کام پر لگا دیا اور جلد ترقی کرنے لگا..... ہماری زندگی میں بہار کا جھونکا سا آیا تھا..... محلے والوں نے لڑکی پر لڑکی کی پیشکش شروع کی ہوئی تھی۔

کرماں والی کے چہرے پر کچھ رونق آنی شروع ہوئی تھی۔ اب گھر میں مرغی بھی پکتی تھی۔ انڈا بھی ہم کبھی کبھار کھا لیتے۔ ایک بکری دودھ دینے والی لے لی تھی۔ مردوں کو صبح پراٹھا ملنے لگا۔ گامے اور بالے کے علاج دوبارہ ہسپتال سے شروع کرانے کی باتیں ہونے لگیں تھیں۔ لیکن ہم نے کھل کر ابھی مسکرانا شروع نہیں کیا تھا۔ ماضی کے کاری زخم اب بھی کسی نہ کسی یاد سے ہرے ہو جاتے۔ ہر اچھی

تبدیلی سے۔ان پر بھی جیسے پھائے سے رکھے جاتے محسوس ہوتے..... پھر جب ایک دن کامی بہت سے قالینوں کی اچھے داموں بیرونِ ملک بکری پر اپنے حصے کی رقم لے کر آیا تو ہمیں بھی حنا پسند آ گئی۔ پڑوسی گاؤں کے نمبردار کی بیٹی تھی۔ چٹ منگنی تو ہوگئی پر بیاہ کے لئے ابھی کچھ کرنا باقی تھا۔

کامی کی آنکھوں میں چمک سی نظر آنے لگی اور وہ شاندار طریقے سے کندھے اٹھا کر چلنے لگا تھا۔اسے اپنے خاندان شروع کرنا تھا۔اب شاید وہ اپنے باپ کے کنبے سے نکل کر ایک اور کنبے کی بنیاد ڈالنے والا تھا۔لیکن ہمیں اس سے اتنی تشویش اور وسوسے نہیں تھے جتنی کہ خوشی اور اطمینان۔ یہ وقت تو ہر خاندان پر آتا ہی ہے۔ جب اس کا کوئی مرد اپنے کنبہ کی بنیاد ڈالنے کے لئے باہر نکلتا ہے۔نسلِ انسانی اگر ایسے نہ پھیلتی تو میرا کنبہ کہاں سے وجود میں آتا۔ کہتے ہیں کہ مسرت کی صبا جب چلنی شروع ہوتی ہے تو آسمان پر کلبلاتی بلائیں اور آفتیں سر اٹھا کر نیچے ضرور دیکھتی ہیں۔مگر انسان کو انہیں دیکھنے کی فرصت ذرا کم ہوتی ہے۔ایک شام جب کامی گھر واپس آیا تو اسے بخار سا تھا۔پھر بخار انتہائی تیزی سے اچانک اتنا بڑھا کہ وہ آگ کی طرح تپنے لگا۔اس پر سرسامی کیفیت طاری ہوگئی اور آہستہ آہستہ وہ بے ہوش ہونے لگا۔آواز دینے پر بمشکل چونک کر ایک لمحے کو آنکھیں کھولتا اور بس۔ ہماری زندگیاں پھر قسمت کے منجدھار میں چکر کھانے لگیں۔اور ہم نامعلوم انجانے خوف سے لرزنے لگے۔قدرت کا چاک چکر پھر سے چلنے لگا اور ہم سوچنے لگے کہ اب نہ جانے وہ ہماری قسمت کو کیا شکل دے۔ہم بے یقینی کی اس کیفیت میں مبتلا تھے کہ اسے الٹیاں آنی شروع ہوگئی۔ہمارے ٹوٹکے بیکار نکلے۔ چند گھنٹوں میں ہماری قسمت اڑ گئی۔اب ہسپتال لے جانے کا بھی ٹائم نہیں تھا۔ وید کے اندازے میں گردن توڑ بخار کا حملہ ہوا تھا۔ جو پہلے بھی چند ایک گاؤں والوں کی جان لے چکا تھا۔ ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں شل ہوگئی تھیں اور ہم گویا قدرت کا لکھا پڑھ رہے تھے۔کسی معجزے کے انتظار میں جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ہمارا چاند کا ٹکڑا، ہمارا اکلوتا کماؤ پوت ہماری آنکھوں کے سامنے اتنی خاموشی سے چل بسا کہ ہم صبر و شکر اور تسلیم و رضا کی مثال بن گئے۔ ہمارے آنسو تو پہلے ہی خشک ہو چکے تھے شاید اسلئے، آج بھی کسی معجزے کسی چمتکار کے انتظار میں اپنے اس مسکن سے جڑے دیکھتا ہوں کہ ہمارے کنبہ کا مستقبل سنور جائے گا۔ میں اکثر اکیلے میں منہ اٹھا کر تاروں بھرے آسمان کو تکتا ہوں۔ پورے چاند کی رات اپنے چاند کے ٹکڑے کو اس میں تلاش کرتا تکتا رہتا ہوں۔ جب بادلوں کی اوٹ ہو جاتی ہے تو مجھے لگتا ہے اس میں سے نکل کر واپس آ جائے گا۔اسی خاموش سے جیسے وہ پہلی بار کل کلاں میرے کنبے کا فرد بنا تھا.....!

◆◆◆

''انجمن خیال'' کے خطوط نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ بے جا تعریف و توصیف کے بجائے ''تخلیق'' کے مندرجات پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار فرمائیں۔ (ادارہ تخلیق)

روح افزا
اور کیا چاہیئے!

خوف کے سایے

شفیع ہمدم

عدیل ایک محتاط آدمی تھا۔ وہ ہر کام نہایت احتیاط اور خوش اسلوبی سے انجام دیتا تھا۔ بعض اوقات اس کی احتیاط پسندی چھلانگ لگا کر وہم کے منطقے میں داخل ہو جاتی تھی۔ انکم ٹیکس میں وہ ایک اعلیٰ پوسٹ پر تعینات تھا۔ وہ دفتر کا ہر کام بروقت انجام دینے کا عادی تھا۔ اس کا باس اس کی احتیاط پسندی اور ایمانداری سے بہت خوش تھا۔ یہ بات دفتر کے عملے کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ بہت سے لوگ اسے نقصان پہنچانے کی سرتوڑ کوششیں کرتے تھے مگر اس کی احتیاط پسندی اور بروقت کام انجام دینے کی عادت نے ہمیشہ ایک ڈھال کا فریضہ انجام دیا جو اس کی طرف سے آنے والے تیروں کو روکتی رہی اور وہ بڑے اطمنان سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔

دفتر سے باہر بھی وہ احتیاط پسندی کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھتا تھا۔ چائے یا پانی پیتے وقت برتن کی صفائی کا خاص خیال رکھتا تھا۔ ایک دفعہ دفتر کے ایک نئے ملازم نے چائے پیش کرتے ہوئے چمچ کو اپنی قمیض کے دامن سے صاف کیا تو وہ ملازم پر بری طرح برس پڑا اور چمچ کو اچھی طرح دھلوایا۔ اس کی بیوی اسے شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ وہ ہر کام سلیقے اور قرینے سے انجام دیتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھار بھول چوک ہو جاتی تو وہ فوراً اسے ٹوک دیتا تھا اور وہ محتاط ہو جاتی تھی۔ اس کے بچے بھی اپنے والد کی عادت سے پوری طرح باخبر تھے چنانچہ وہ بھی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ عدیل اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ باقاعدگی سے قریبی پارک میں واک اور ورزش کیا کرتا تھا۔ جسم میں معمولی سی تبدیلی محسوس ہونے پر فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرتا تھا۔ وہ صرف اپنا ہی نہیں اپنے بیوی بچوں کی صحت کا بھی خاص خیال رکھتا تھا۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہونے سے قبل ہی ڈینگی مچھر نے ملک کے اکثر حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لوگوں کے دلوں کو اس کے خوف نے جکڑ لیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی خوف زدہ تھا۔ اسے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ نجانے ڈینگی مچھر کب کہاں اور کس مقام پر اپنا زہر اس کے جسم میں داخل کر دے۔ ٹی وی پر خبریں سنتا تو اس خطرناک مچھر کے بارے میں ضرور کوئی خبر ہوتی تھی۔ خبروں سے معلوم ہوتا کہ اس کا دائرہ کار آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اور ڈینگی کے مریضوں کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی یہ شرح عوام اور ارباب بست و کشاد کے لیے تشویش ناک تھی۔ اس کے تدارک کے انتظامات کیے جا رہے تھے مگر ڈینگی کا پلڑا بھاری تھا۔ جن شہروں میں اس کا زور زیادہ تھا وہاں کے لوگ زیادہ خوف زدہ تھے۔ اخبارات میں بھی اس مچھر کے بارے میں نت نئی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ ٹی وی پر ڈاکٹر حضرات لیکچرز بھی دے رہے تھے مگر اس کے باوجود مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں سپرے کروایا اور پانی کو ڈھانپ کر رکھنے لگا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی بچے پوری آستینوں کے کپڑے پہننے لگے۔ ڈینگی بخار سے روز تین چار

آدمی موت کی آغوش میں پہنچ جاتے تھے۔ٹی وی پر ایسی خبریں سن کر وہ خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

ایک رات اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو کروٹیں بدلتے بدلتے رات کے بارہ بج گئے۔اس نے محسوس کیا کہ اسے حرارت ہو رہی تھی۔اپنی پیشانی کو چھوا تو وہ گرم تھی۔اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا کہ اسے مچھر نے تو نہیں کاٹا تھا۔پھر پانچ چھ روز پہلے مچھر کے کاٹنے کا واقعہ اس کے ذہن کے صحرا میں گردش کرنے لگا۔اس نے سن رکھا تھا کہ ڈینگی مچھر کے کاٹنے کے اثرات پانچ چھ روز کے بعد رونما ہوتے ہیں۔جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ ہلاکت خیز مچھر کی زد میں آ گیا ہے تو اس کی پیشانی پسینے سے عرق آلود ہو گئی۔اس نے بستر سے اٹھ کر پیراسٹامول کی ایک گولی کھائی اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا مگر بخار ہلکا ہونے کی بجائے اور تیز ہو گیا۔اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو اس کے ڈائیل پر کچھوے کی رفتار سے رینگتی ہوئی سوئیاں رات کے ایک بجے کا اعلان کر رہی تھیں۔صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی اور اس وقت ڈاکٹر کا دستیاب ہونا بہت مشکل تھا۔طرح طرح کے خدشات وسوسوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔اسے معلوم تھا کہ ڈینگی ان دنوں سانپ سے بھی زیادہ خطرناک بن گیا تھا۔سانپ کو دیکھ کر اس سے تو بچا جا سکتا ہے مگر ڈینگی مچھر سے خود کو بچانا ممکن نہیں ہے۔وہ دیر تک خدشات اور وہمات کے چنگل ہی کھلتا رہا۔اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو وہ دو بجا رہا تھا۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دو صدیوں سے بستر پر لیٹا رہا ہے۔اسے بڑی شدت سے صبح ہونے کا انتظار تھا مگر رات تھی کہ بیتنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔اسے ایسے محسوس ہوا جیسے رات ایک نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہو۔وہ بار بار ہاتھ لگا کر بخار چیک کرتا رہا جو کم ہونے کی بجائے اور تیز ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کے پلنگ کی طرف دیکھا تو وہ اس کی پریشانی سے بے خبر میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔اس نے اپنی بیوی کو جگانا چاہا مگر یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ جاگنے کے بعد وہ پریشان ہونے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہے۔اس نے دوسرے کمرے میں جا کر بچوں پر ایک نظر ڈالی کہ وہ بھی گہری نیند میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔وہ یہ سوچ کر بہت پریشان ہو گیا کہ اگر ڈینگی مچھر کے کاٹنے سے وہ موت کی آغوش میں پہنچ گیا تو اس کے بیوی بچے بے سہارا ہو جائیں گے۔ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔وہ نہایت خشوع و خضوع سے ربِّ قدیر کے حضور اپنی صحت کی دعائیں مانگنے لگا۔''یا الٰہی! مجھے اس ڈینگی مچھر سے بچائے رکھ۔یہ غرور و تکبر سے بھرا انسان اندر سے بے حد کمزور ہے۔ایک معمولی سا مچھر بھی اس کی زندگی کا چراغ گل کر دینے کی لیے کافی ہے۔یارب! میرے بچوں کے سروں پر میرے سایے کو سدا سلامت رکھ ورنہ اس بھری دنیا میں انہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوگا۔'' دعائیں مانگتے مانگتے نجانے وہ کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ڈینگی مچھر کا شکار ہو کر ہسپتال پہنچ گیا تھا،اسے سر،جسم اور آنکھوں کے پچھلے حصے پر شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔وہ ہسپتال کے ایک بستر پر لیٹا ہوا ہے۔اس کے بیوی بچے،عزیز و اقربا اور دوست بنچوں پر بیٹھے فکرمند نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔اس کی بیوی نے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کر کے اس پر دم کیا۔اس کی بیوی بچوں،عزیزوں اور دوستوں کی آنکھوں سے آنسو بہنا چاہتے تھے مگر صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے۔ان لوگوں کے چہروں پر چھائی ہوئی مایوسی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا آخری وقت آ گیا ہو۔اس کے جسم پر سرخ نشانات نمودار ہو رہے تھے اور وہ متلی اور قے کی زد میں آ گیا تھا۔اسے معلوم تھا کہ یہ سب نشانات ڈینگی مچھر کے کاٹنے ہی سے نمودار ہوتے ہیں۔وہ حسرت بھری نظروں سے اپنی بیوی بچوں کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ڈاکٹر کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے آفاقہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ موت کا فرشتہ اس پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں

مصروف تھا۔اس کی بیوی جواب تک صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئی تھی اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اس کے رونے کی آواز سے عدیل کی آنکھ کھل گئی۔اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ ہسپتال کی بجائے اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو پونے پانچ بج رہے تھے۔تھوڑی دیر کے بعد دور کسی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔اب وہ اس وہم میں گرفتار ہو گیا تھا کہ صبح کہ دیکھے ہوئے اکثر خواب سچے ہوتے ہیں۔وہ کچھ دیر تو خواب کے بھنور میں پھنسا رہا، پھر کلمہ پڑھ کر بستر سے اٹھا اور وضو کر کے نماز پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔نماز پڑھ کر اس نے نہایت عاجزی سے اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی سلامتی کی دعا مانگی۔ وہ نماز کے بعد واک کرنے کا عادی تھا مگر جب سے ڈینگی نے تباہی مچائی تھی تو اس نے صبح کی واک چھوڑ دی تھی۔اس کو معلوم تھا کہ ڈینگی مچھر صبح سویرے اور شام کو حملہ آور ہوتا ہے۔وہ بڑی بے چینی سے نو بجے کا انتظار کرنے لگا۔تھوڑی دیر کے بعد اس کے بیوی بچے بھی بیدار ہو گئے۔ بچے سکول جانے کی تیاری کرنے لگے اور اس کی بیوی ان کے لیے ناشتہ بنانے میں مصروف ہو گئی۔ جب اس کی بیوی کو بخار کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بہت فکر مند ہوئی اور شکایت بھی کی کہ ساری رات اکیلے جاگتے رہے اسے کیوں نہیں اٹھایا۔فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔معمولی سا بخار ہے دوا لینے سے اتر جائے گا مگر وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا۔اسے نو بجے کا شدت سے انتظار تھا۔اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ابھی لیبارٹری پہنچ جائے مگر نو بجے سے پہلے لیبارٹری پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔وہ بار بار وال کلاک کی طرف دیکھ رہا تھا۔آج اس کی سوئیاں رفتار میں کچھوے کو بھی پیچھے چھوڑ رہی تھی۔دفتر کی تیاری کرتے وقت یہ ہی سوئیاں چیتے کی رفتار سے دوڑتی تھیں اور وہ بمشکل دفتر کے لیے تیار ہوتا تھا۔

خدا خدا کر کے گھڑی نے نو بجائے اس نے فوراً گیراج سے اپنی گاڑی نکالی اور لیبارٹری کی طرف چل پڑا۔راستے میں مختلف قسم کے وسوسوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔لیبارٹری پہنچنے کے بعد ڈاکٹر نے اس کا خون لیا اور ٹیسٹ کے لیے دے دیا۔جب تک رپورٹ نہیں آئی وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔اسے نقاہت اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔جب ڈاکٹر نے اس کی رپورٹ دیکھ کر بتایا کہ اسے عام بخار ہے دوا دینے کے بعد آرام آ جائے گا تو اسے ایسے محسوس ہوا جیسے ملک الموت کا پنجہ جو اس کی گردن کے گرد تنگ ہو رہا تھا معاً ڈھیلا ہو گیا اور پھر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔اب وہ خود کو ہلکا پھلکا اور ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔

◆◆◆

صحافی اظہر جاوید کی کتب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو عطیہ کر دی گئیں

لاہور (سپیشل رپورٹر) پنجاب یونیورسٹی مین لائبریری کو صدارتی ایوارڈ یافتہ معروف شاعر و ادیب، صحافی اور ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید (مرحوم) کے ورثاء کی جانب سے اُن کا ذاتی ذخیرۂ کتب عطیہ کر دیا گیا ہے، جس میں ہندو پاک سے چھپنے والی نایاب کتب اور نادر رسائل کی تعداد تقریباً 2 ہزار ہے۔ چیف لائبریرین چوہدری محمد حنیف کے مطابق پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو ملنے والا یہ 28 واں بڑا ذاتی ذخیرۂ کتب ہے جبکہ چھوٹے ذخائر کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ (روزنامہ ''نوائے وقت''/''نئی بات'' لاہور، 30 جون 2012ء)

نیل کی واپسی

نجیب عمر

''دیکھو بیٹی! یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اس سال تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ ہم سب نیل سے محبت کرتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں تاہم اس اُلفت اور محبت کا عوض ہم سے کتنے ادا کر پاتے ہیں؟ آج یہ خوش نصیبی تمہارے حصے میں آئی ہے۔ تمہارے آگے پیچھے بستی کے لوگ دیوانہ وار رقص کر رہے ہیں، طبل، تاشے اور دف بج رہے ہیں، یہ سب ہماری جانب سے نیل کے لیے تحفہ ہے۔ نیل ہماری زندگی کی علامت ہے۔ یہ خشک ہو جائے تو ہماری زندگی کی ڈور ٹوٹنے لگتی ہے۔ سارا سال یہ ہماری خدمت کرتا ہے لیکن سال دو سال میں ایک مرتبہ اس پر دیوانگی طاری ہوتی ہے اور یہ اپنے کناروں سے ابل ابل کر ساتھ بسنے والی آبادی کے دروں پر دستک دیتا ہے کہ اس کے لیے قربانی کی تیاری کی جائے۔ ہم سب نیل کے غضب سے خوب واقف ہیں''..... ''بشائر میری بیٹی! ہم تمہیں نیل کے حوالے کر رہے ہیں۔ وہ تمہیں اپنی جنت میں لے جائے گا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ ہم سب اس کے گواہ ہیں۔ تمہیں قطعی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہیں اپنی آغوش میں لیتے ہی، تمہارے دکھ درد سب دور کر دے گا اور تمہیں ابدی خوشی حاصل ہوگی۔ وہ دیکھو دوسری جانب سے بھی لوگ پُل پر دیوانہ وار تمہارے استقبال کو آ رہے ہیں۔ ان کا جوش دیکھنے کے قابل ہے۔ آج بشائر تمہاری وجہ سے میری عزت، توقیر میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ لوگ مجھے مبارکباد دے رہے ہیں۔ پل کے درمیانی حصے میں پہنچ کر نیچے ٹھاٹھیں مارتے نیل کے حوالے کر دیا جائے گا۔

الوداع میری بشائر، میری لختِ جگر الوداع!''

''میں کیسے بھول سکتی ہوں وہ دن جب میری پیاری سہیلی بشائر کو چنگھاڑتے نیل کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ لوگ خوشی خوشی گھر کو لوٹ رہے تھے۔ انہیں اطمینان تھا کہ اب نیل کا غضب ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہوا بھی ایسا ہی کہ طغیانی کا زور ٹوٹ گیا اور نیل شانت ہو گیا۔ لیکن طاہرہ تم ہی بتاؤ کیا یہ بشائر کا صریح قتل نہیں؟''

''حمیرا میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتی ہوں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔ جب نیل پر طغیانی آتی ہے تو وہ کنواری دوشیزہ کی قربانی سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔ خود بشائر اس قربانی کے لیے بخوشی تیار تھی۔ اس کے والدین اس اعزاز پر سرشار اور مطمئن کہ وہ نیل کے کسی طور کام آئے۔''

چار ہزار میل سے زیادہ طول رکھنے والا غالباً دنیا کا طویل ترین دریا اسے تمام افریقی دریاؤں کا جدامجد بھی کہا جاتا ہے۔ تنزانیہ،

برونڈی کانگو، کینیا، یوگانڈا، سوڈان، ایتھوپیا سے ہوتا ہوا مصر میں داخل ہوتا ہے اس کی تہہ کی مٹی کے بدلتے رنگ کی بنا پر افریقہ میں یہ نیل الازرق ہمارے پاس نیل السمو داور کہیں یہ نیل الصغر بھی ہوتا ہے۔ یونانی شاعر ہومر نے اس پر نظم لکھی اور اس نے نیل کو مذکر اور مصر کو مونث جمایا۔

''حمیرا! نیل کی طلسمانی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگاؤ کہ آج تک اس کی ابتداء معلوم نہیں کی جاسکی جہاں سے اس کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یونانیوں اور رومیوں نے کئی مہم جورانہ کیے لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ افریقہ میں خطِ استوا کے قریب سے اس کی ابتداء ہوتی ہے''۔

''تمہاری طرح میں بھی انسانی جان کی قربانی کو اچھا نہیں جانتی لیکن یہ جو ہماری پشت پر اہرام کھڑے ہیں فراعنہ اپنے مُردوں کی ممی بنا کر ان کے ساتھ زندہ کنیزوں کو درگور کر دیا کرتے تھے۔ یہ رسمِ بد تو صدیوں سے جاری ہے اور اس کی بنیادی وجہ ہماری خاموشی ہے۔ ہمیں اس کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔''

''لیکن طاہرہ اب ہوا کا رخ بدلنے لگا ہے۔ ہمارے حکمران جو خلیج عرب سے آئے ہیں نے مصر کو اپنے قلمرو میں شامل کر لیا ہے اور خود کو مسلم کہتے ہیں اور خالقِ کائنات۔ صرف خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے فاتح جرنیل نے اعلان کر دیا کہ اس رسم قبیح کی اجازت نہیں دی جاسکتی''۔

''حمیرا! میں جانتی ہوں اس کا نام عمرو بن العاص ہے جو مدینہ کی ریاست کا نمائندہ ہے۔ وہ جس دین کے پیروکار ہیں وہ حق و انصاف پر مبنی ہے اور خدائے وحید کی حکمرانی کے قائل ہیں۔ اس نے ہمارے سرداروں کو سختی سے تنبیہ کی ہے کہ اگر کسی نے ایسی جرأت کی تو اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی اور ساتھ ہی اس نے مہلت مانگی ہے کہ ایک تیز رفتار قاصد مدینہ روانہ کر رہا ہے جہاں ان کا بادشاہ رہتا ہے۔ اس سے مشورہ طلب کیا ہے وہ اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر کے بعد اس بادشاہ کو جسے وہ خلیفہ کہتے ہیں جس کا لقب امیر المومنین ہے۔ اس کے حکم کے پابند ہیں''۔

''طاہرہ! میں اس بات سے خوش ہوں کہ فاتح جرنیل نے فی الحال اس رسم بد کو روک دیا ہے۔ نیل پھر زوروں پر ہے۔ اس کی چنگھاڑتی لہریں آبادی کا سکون تلپٹ کیے ہوئے ہیں۔ دوسری جانب ساری آبادی راضی ہے کہ حسبِ روایت پھر کسی دوشیزہ کو نیل کی بھینٹ چڑھا دیا جائے اس طرح نیل راضی ہو جائے گا۔''

''لیکن حمیرا اس جرنیل کے سامنے کسی کی مجال نہیں کہ زبان کھولے اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟''

''طاہرہ! کیا تم ان کے دین اور عقیدے کے متعلق جانتی ہو۔ یہ خود کو مسلم کہتے ہیں۔ خالقِ کائنات کی مرضی کے آگے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ یہ خدا کی کتاب اور اپنے پیغمبر کی سنت سے ہدایت لیتے ہیں۔ ان کی زبان عربی ہے جو ایک فصیح و بلیغ زبان ہے۔ وہ کہتے ہیں، ان کا دین انسانوں کی آزادی اور مساوات کا علمبردار ہے۔ اس میں انسانی قربانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دیکھتے ہیں قاصد ان کے امیر کا کیا پیغام لاتا ہے۔''

''ایک اور انوکھی بات طاہرہ۔ تم نے سنا کہ مسلمانوں کے امیر نے نیل کے نام خط لکھا اور اس کا حکم ہے کہ اسے نیل میں ڈال دیا جائے اور انتظار کریں کہ نیل کی طغیانی اور جوش ٹھنڈا پڑتا ہے یا نہیں۔''

امیر جیش، عمرو بن العاص نے کل ہزاروں لوگوں کے سامنے وہ خط دریا میں ڈال دیا اور دیکھتے دیکھتے نیل کی تندی اور تیزی کم ہونے لگی اور شام ہونے تک نیل کی رفتار معمول کے مطابق ہوگئی۔

سارے لوگ بہت خوش ہیں اور خاص کر میں۔ حمیرا! چونکہ میری خواہش تھی کہ یہ ظالمانہ رسم ختم کی جائے۔ مصر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی انسانی بھینٹ اور وہ بھی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کی قربانی کے بغیر نیل کو قابو کرلیا گیا۔

''طاہرہ! خلیج سے آئے ہوئے لوگ تو جادوگر لگتے ہیں ہم نے فرعوں کے دربار کے جادوگروں کا حال سنا تھا یہ تو ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔''

''کچھ اس کی بھی خبر ہے حمیرا کہ مسلمانوں کے امیر نے خط میں لکھا کیا تھا؟''

''طاہر! میرے والد بتا رہے تھے کہ خط کے مندرجات کچھ یوں تھے۔

''اے نیل! اگر تو خالقِ کائنات کی مخلوق ہے تو اس کا بندہ اور خلیفہ عمر بن خطاب تجھے حکم دیتا ہے کہ اپنی روش بدل اور مخلوقِ خدا کو ستانا چھوڑ دے۔''

◆◆◆

ممتاز ادیب، نامور شاعر اور معروف ادبی کالم نگار

عزیز جبرآن انصاری کی نئی کتاب

بے لاگ (انتقادی کالم)

شائع ہوگئی ہے

رابطہ

جبران اشاعت گھر، 102۔ عائشہ منزل، مقدس مسجد اُردو بازار۔ کراچی (پاکستان)

فون: 021-35461804۔ موبائل: 03009312919

مستحق

محمد عباس ثاقب

''اجی سنتے ہو؟''

''ہاں بولو.....لیکن مختصر الفاظ میں! نیند سے آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں۔''

''وہ اپنے قمرو بھائی کو تو جانتے ہوناں؟.....میرے بہنوئی کے سمدھی کے بھائی!''

''وہی ناں جن کی ہوزری کی دکان ہے لالوکھیت میں؟.....خیریت؟ کیا ہوا انہیں؟''

''ہونا کیا تھا؟ بس یوں سمجھو کہ جیتے جی مرگئے بے چارے.....ان کی منجھلی بیٹی بھاگ گئی کسی لونڈے کے ساتھ!''

''اوہ.....یہ تو بہت افسوس ناک خبر ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا شریف آدمی۔''

''ہاں.....دل کی تکلیف ہوگئی تھی.....تین دن تک کارڈیو میں رہ کے آئے ہیں۔ بڑے لونڈے کی طرف سے الگ پریشان ہیں۔ سنا ہے بھری ٹی ٹی لے کے ڈھونڈتا پھر رہا ہے چھوکری اور اس کے یار کو۔''

''اب کیا ہوسکتا ہے؟ جو قیامت ٹوٹنی تھی، وہ تو ٹوٹ چکی.....لیکن کیا کسی نے نہیں بھانپے اس لونڈیا کے لچھن؟.....

''اللہ جانے کب سے ہنڈیا پک رہی تھی.....سنا ہے موئے کمپیوٹر.....وہ کیا کہتے ہیں انٹرنیٹ پہ کوئی یاری دوستی کی جگہ ہے.....اس پر سیٹنگ ہوئی تھی دونوں کی.....''

''فیس بک کی بات کررہی ہو شاید؟''

''ہاں، ہاں.....وہیں پہ.....پھر موبائل فون پر چکر چلتا رہا.....وہ گھنٹا پیکج ہوتا ہے ناں!''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن وہ لڑکا رشتہ بھیج کر عزت سے بھی بیاہ کرلے جاسکتا تھا ناں لڑکی؟''

''یہی تو اصل فساد کی جڑ ہے.....اور میں تو کہوں اپنے عزت کا جنازہ نکالنے میں خود قمرو بھائی کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اپنی ذات برادری سے باہر بچیوں کی شادی کا ذکر بھی سننے کو تیار بھی نہیں ہوتے۔ ادھر اپنی برادری میں بھی کوئی رشتہ انہیں اپنے جوڑ کا نہیں لگتا۔ اسی چکر میں بڑی والی بیٹی کی عمر نکال دی انہوں نے۔ منجھلی کو بھی اپنا یہی انجام نظر آرہا ہوگا۔ وہ چھوکرا یقیناً کسی اور ذات کا ہوگا۔''

''یہ تو واقعی ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے۔ میں دو کالم لکھ چکا ہوں اس موضوع پر، جنہیں بہت پزیرائی بھی ملی ہے۔''

''آپ دس بیس کالم اور لکھ کے دیکھ لیں۔ یہاں کسی کے کان پر جوں نہیں رینگے گی۔ قصور تو قمرو بھائی کا بھی ہے لیکن اللہ ایسی

اولاد بھی کسی کو نہ دے۔شکر ہے، ہماری اسما ایسی نہیں ہے۔''

''ہم بھی تو ایسی فضولیات میں نہیں پڑتے۔شاید اسی لیے اللہ نے اتنی اچھی جگہ رشتہ کرایا ہے ہماری بیٹی کا۔''

''یہ بات تو سولہ آنے سچ ہے۔منگنی کے فوراً بعد ترقی ہوگئی شیراز بیٹے کی، گھر بھی اچھا بنوالیا ہے۔''

''اللہ اسے مزید کامیابیاں دے۔بہت فرماں بردار بچہ ہے۔اچھا اب سونے کی کرو، دوبارہ دفتر جانا ہے۔''

''وہ اپنی رحمت خالہ آئی تھیں۔میری مرحومہ ساس کی سب سے پکّی سہیلی۔''

''خدا خیر کرے.....ان کی آمد کسی نہ کسی الجھن کا پیغام ہی ہوا کرتی ہے۔کیا کہہ رہی تھیں؟''

''عید کے بعد ان کی پوتی کی شادی ہے۔مالی امداد کی امید لے کر آئی تھیں۔''

''لیکن ہمارے پاس کسی کو دینے کے لیے ہے کہاں؟ ادھار سدھار لے کر مہینہ پورا کرتے ہیں ہر بار۔''

''یہ تو صرف ہمیں پتا ہے ناں؟ لوگوں میں تو بہت بھرم ہے ہمارا۔آخر اتنے بڑے اخبار میں کام کرتے ہیں آپ۔لاکھوں لوگ آپ کا کالم پڑھتے ہیں۔''

''یہ بھرم قائم رکھنے کی جدوجہد میں ہی ساری زندگی گزر گئی بی بی۔''

''تو پھر کیا کہوں رحمت خالہ کو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا انہیں یوں دردر بھٹکنے کی ضرورت کیا ہے؟ تین تین بیٹے ہیں ان کے؟''

''سدا کی دکھیاری ہیں بے چاری۔اس بچی کا باپ تو نشے کا مارا ہوا ہے، بس کُپی سے دل چسپی ہے اسے۔باقی دونوں بیٹے اچھا کماتے ہیں لیکن صرف اپنی بیوی بچوں کے لیے، بڑھیا کو دینے لیے ایک دھیلا نہیں ان کے پاس۔''

''اس مہنگائی کے دور میں لوگ اپنے خاندان کا پیٹ پال لیں تو غنیمت ہے۔بہرحال خالہ سے کہنا ہم سے جو کچھ بنا، ضرور کریں گے، لیکن زیادہ امید نہ باندھیں۔''

''آپ اپنے کالم میں غریب بچی کی شادی کے لیے مدد کی درخواست کریں ناں، جیسے دو سال پہلے کی تھی، جگنو ماموں کے علاج کے لیے!''

''وہ تو ٹھیک ہے۔میں اپنے فیس بک پیج پر اپنے دوستوں سے بھی اپیل کردوں گا لیکن زیادہ رقم ملنے کی امید نہیں۔کسی کو جیب میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور کرنا آسان نہیں ہوتا۔جگنو ماموں کے لیے بھی بمشکل تیس ہزار اکٹھے ہوئے تھے جب کہ ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔''

''چلو کچھ تو آئے تھے ناں؟ ان کے علاج میں نہ سہی، کفن دفن میں کام آ گئے۔رحمت خالہ کو تو بیس پچیس ہزار بھی مل گئے تو عزت سے بچی رخصت کردیں گی۔''

''لیکن مجھے بہت الجھن ہوتی ہے ایسے چکروں سے۔کہیں لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ ان صاحب نے تو دھندا ہی بنالیا ہے۔''

''سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔ہماری نیت تو صاف ہے ناں؟ کسی غریب بچی کی شادی میں تعاون کریں گے تو اللہ ہماری بچی کے

نصیب بھی اچھے کرے گا۔''

''آمین۔اچھا میں کسی قریبی کالم میں اپیل کرتا ہوں۔''

''خیریت؟ آج کچھ بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے ہیں۔''

''آج پھر ایڈیٹر صاحب کے ذریعے تنخواہ بڑھانے کی درخواست اخبار مالک تک بھجوائی تھی۔''

''انکار کر دیا؟''

''ہاں، کہتے ہیں فی الحال گنجائش نہیں۔کالم کے لیے علیحدہ اعزازیہ جاری کرنے سے بھی معذرت کر لی ہے۔''

''آخر آپ کہیں اور کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں جان بوجھ کر یہاں پھنسا ہوا ہوں؟ تمہارا شوہر کوئی تیس مار خان قسم کا صحافی نہیں ہے بی بی۔ میرے سے کہیں زیادہ باصلاحیت اور تجربے کار لوگ دھکے کھاتے پھر رہے ہیں اخبارات میں۔نیوز چینلز نے اخبارات کو اضافی خرچہ بنا کر رکھ دیا لوگوں کے لیے۔اشتہارات کا سہارا نہ ہو تو ایک دن بھی شائع نہ ہو کوئی اخبار۔''

''کسی چینل پر کوشش کر کے دیکھ لو۔یہ سارے ٹی وی اخبار والے ہی تو کرتے ہیں۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میں اتنا مشہور اور مقبول کالم نگار ہوتا تو منہ مانگی تنخواہ پر کبھی کی آفر آ چکی ہوتی کسی نیوز چینل سے۔ویسے بھی قلم چلانا اور کیمرے کے سامنے سنسنی خیز نیوز پروگرام کرنا بالکل مختلف باتیں ہیں۔نہ میری شخصیت اس کے لیے موزوں ہے، اور نہ مجھ میں الزام اور بہتان تراشی سے لوگوں کی عزت اتارنے کی جرأت اور صلاحیت ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس طرح کیسے گزارا ہوگا؟ مکان مالک چار ماہ سے کرایا بڑھانے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ادھر پوری کوشش کے باوجود اسما کے جہیز کے نام پر ایک چادر تک نہیں خرید پائے۔گھر کا خرچا پورا ہو، تبھی کچھ کروں ناں؟''

''میں ترجمے وغیرہ کے کام کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔شاید اضافی آمدنی کا کوئی سلسلہ بن جائے۔''

''جو کچھ کرنا ہے جلدی سے کرو۔ہمارے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔''

''اللہ مالک ہے۔''

''اجی کچھ سنا آپ نے؟''

''جلدی سے سنا دو کیا سنانا ہے۔مجھے نئے کالم پر کام شروع کرنا ہے۔''

''وہ میں یہ بتا رہی تھی کہ قمرو بھائی کی منجھلی بیٹی اپنے شوہر سمیت ماں باپ سے ملنے آئی تھی۔''

''اوہ.....وہی جو بھاگ گئی تھی؟''

''ہاں، ان دونوں نے لاہور میں لڑکے کی خالہ کے گھر پہنچ کر شادی کر لی تھی اور کراچی واپس آ گئے ہیں۔''

''اچھا؟.....پھر قمرو بھائی اور باقی گھر والوں نے کیا حشر کیا بھگوڑوں کا؟''

''کچھ بھی نہیں۔چھوکری کو باپ نے دو چار طمانچے مارے، ماں نے چٹیا پکڑ کے جھنجھوڑا، گالی گلوچ، لعنت ملامت کی۔چھوکری کا بھائی اچھل اچھل کے بہنوئی کا گلا دبوچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن باپ نے اسے دل کی حسرت نکالنے کا موقع نہیں دیا کیوں کہ داماد آتے ہی سسر کے پیروں میں گر گیا تھا.....''

''ظاہر ہے معاف کرنا پڑا ہوگا.....اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔''

''ہاں، پھر بیٹی نے ماں کو خوش خبری سنائی کہ وہ پیٹ سے ہے، تو رہی سہی ناراضی بھی دور ہوگئی۔قمرو بھائی کے لیے یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ لڑکا بینک میں ملازم ہے۔''

''چلو جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔نئے دور کی نئی روش ہے بی بی۔''

''میں نے کالم میں رحمت خالہ کی پوتی کی شادی کے لیے مالی تعاون کی اپیل کی ہے۔سُنیے گی؟''

''دوستو! کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں گناہ کمانا آسان سے آسان تر اور نیکی کمانا انتہائی مشکل ہوتا جارہا ہے۔لہٰذا ہمارے لیے از حد ضروری ہے کہ نیکی کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔میں آج یکم رمضان کے مبارک دن آپ کو ایک عظیم نیکی سے حصہ دار بننے کی دعوت دیتا ہوں۔عید کے بعد ایک ایسی بچی کی شادی کرانے کے لیے آپ سب کا ہر ممکن مالی تعاون درکار ہے جس کے والدین اپنے اس فریضے کی ادائیگی کی قطعاً استطاعت نہیں رکھتے۔آپ اپنے عطیات درج ذیل اکاؤنٹ میں جمع کرا سکتے ہیں۔''

''آپ نے واقعی بہت دردمندانہ اپیل کی ہے۔اللہ کرے یہ لوگوں کے دلوں پر بھرپور اثر کرے۔''

''انشااللہ ضرور اثر ہوگا۔میں اپنے فیس بک پیج پر بھی یہ اپیل کروں گا۔''

''خیریت تو ہے بی بی؟ کچھ فکر مند نظر آرہی ہو۔''

''اسما کی ہونے والی ساس عیدی دینے آئی تھی آج۔''

''اچھا؟.....اتوار کو ہم بھی چلیں گے شیراز بیٹا کا جوڑا لے کر۔کیا کہہ رہی تھیں ثمینہ بہن؟''

''وہ باتوں باتوں میں جتا رہی تھیں کہ اب ان سے کام نہیں سنبھلتا۔گھر بڑا ہونے سے کام بھی بڑھ گیا ہے۔شاید شیراز نے بھی شادی کے حوالے سے معاملات آگے بڑھانے کی فرمائش کی ہے۔''

''اگر وہ کھل کر کچھ کہیں تو صاف صاف بتا دینا کہ ہمیں ان کے وعدے کے مطابق کم از کم ڈیڑھ سال کی مہلت درکار ہوگی۔''

''ہم بیٹی والے ہیں، یہ صاف صاف کہہ دینے والی بات ہمیں زیب نہیں ہے۔ہاں عاجزی سے یہ بات کان میں ڈالی جاسکتی ہے۔''

''چلو ایسے ہی سہی۔شیراز بہت اچھا لڑکا ہے، میں اسے سمجھاؤں گا تو ضرور میری بات مان لے گا۔''

''سنو بی بی، رحمت خالہ کو بلا لو۔''

''اچھا، کچھ رقم اکٹھی ہوئی کیا؟''

''ہاں، اللہ نے اپنے کچھ پیارے بندوں کے دلوں میں نیکی ڈالی ہے۔''

''خالہ رحمت تو بہت دعائیں دیں گی۔ صرف پندرہ دن بعد تو شادی ہے۔ کتنے جمع ہوئے؟''

''تیس ہزار''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس نے ہمارا بھرم رکھا اور خالہ رحمت کا کام بھی ہو جائے گا۔ باسی عید کو تو شیراز اور اس کی امی آئیں گے۔ میں عید کے تیسرے دن بلا لیتی ہوں خالہ رحمت کو۔''

''ایسا کرو تم خود جا کر دے آنا۔ اچھا نہیں لگتا انہیں یہاں بلا کر دینا۔ وہ احسان مندی کا اظہار کر کے خواہ مخواہ شرمندہ کریں گی۔''

''اجی سنتے ہو، میرا تو دل ہول کھا رہا ہے۔ اب کیا بنے گا؟ ثمینہ بیگم نے تو تقریباً صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ انہیں بقر عید کے فوراً بعد شادی کی تاریخ چاہیے۔''

''معاملہ تو واقعی بہت سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ ان کا لہجہ تو دھمکی والا نہیں تھا لیکن سب باتوں کا مفہوم یہی نکلتا ہے۔ شیراز سے بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اگر یہ سب اس کی رضامندی کے بغیر ہو رہا تھا تو وہ ضرور مداخلت کرتا۔ سب سے بڑا مسئلہ وہی ہمارا نام نہاد بھرم ہے۔ یہ صاحب زادے اور ان کی والدہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے مشہور و معروف سسر کے لیے چند دنوں کے نوٹس پر بیٹی کی شادی کرنا بھی کوئی مسئلہ نہیں اور ہم نے اسی لیے پیشگی تیاری کرنے کی زحمت نہیں کی۔''

''ہم ان کو بتا بھی نہیں سکتے کہ ہمارے پاس تو سرے سے وسائل ہی نہیں ہیں۔ پتہ ہے، شیراز کا عید کا جوڑا لیتے ہوئے ثمینہ بھابی کی باتوں کا مطلب یہ تھا کہ شیراز کے بڑی کمپنی میں جانے اور دفتر کی طرف سے گاڑی ملنے کے بعد سے ان کی کروڑ پتی نند بار بار چکر لگانے لگی ہے، جب کہ اس نے شیراز کی بیروزگاری کے دور میں اپنی بیٹی کے لیے اس کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ ثمینہ بھابی نے جتایا تھا کہ اس حوالے سے ان کی ساس بھی دباؤ ڈال رہی ہے۔ ثمینہ بھابی خود بھی ڈگ مگا رہی ہیں مگر اکلوتے بیٹے کی مرضی کے آگے مجبور ہیں۔''

''یہ تو بے حد تشویش ناک صورتِ حال ہے۔ ہم نے مزید مہلت مانگی تو انہیں منگنی توڑنے کا بہانہ مل جائے گا۔ ایسے میں شاید شیراز بھی مزاحمت نہ کر پائے۔''

''ہمیں شادی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ چاہے ہمیں جان پر کھیلنا پڑے۔ یہ منگنی ٹوٹ گئی تو صرف ہمارا بھرم ہی ختم نہیں ہوگا، میری بیٹی کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔''

''ایک مسئلہ اور بھی ہے بی بی۔ بالفرض ہم اپنی خواہش کے مطابق ڈیڑھ سال کی مہلت حاصل کر لیں تب بھی کیا ضمانت ہے کہ ہمیں ایک بار پھر یہی صورتِ حال درپیش نہیں ہوگی؟''

''بات تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سال میں کون سا ہمیں قارون کا خزانہ ملنے والا ہے۔ لیکن پھر کریں کیا؟''

''جب آگ میں کودنا ہی ہے تو پھر انتظار کیسا؟ ہم یہ رشتہ ٹوٹنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم کس کس کو یقین دلائیں گے کہ یہ منگنی

ہماری بیٹی کے کسی عیب کی وجہ سے نہیں ٹوٹی۔ شیراز جیسا رشتہ ملنا بھی محال ہے۔ اسما بیٹا بھی جذباتی اور نفسیاتی کرب میں مبتلا ہو جائے گی۔''

''تو پھر کیا کریں؟''

''ثمینہ بہن کو پیغام بھجوا دو کہ پندرہ دن بعد آ کر شادی کی تاریخ لے جائیں۔''

''لیکن ہم اتنی جلدی.....''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اپنی بیٹی کو اچھی زندگی دینے کے لیے میں کسی بھی حد جا سکتا ہوں۔''

''مبارک ہو بی بی۔ اللہ نے ہمارا بھرم قائم رکھا۔''

''آپ کو بھی مبارک ہو..... اللہ سب والدین کو اپنی بیٹیوں کو ایسے ہی عزت سے رخصت کرنے کے قابل بنائے۔''

''تمھارے لہجے میں گرم جوشی کچھ کم ہے.....''

''ایسی کوئی بات نہیں..... بس ایک ہلکی سی خلش ہے۔ آپ نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے پوری طرح اعتماد میں نہیں لیا۔ اس سوال کا جواب ابھی تک آپ پر ادھار ہے۔''

''وہی ناں..... اتنی رقم کہاں سے میرے پاس آئی؟.....''

''شاید آپ نے قرض لیا ہے دفتر سے؟''

''بس یوں سمجھو اللہ نے بندوبست کر دیا۔''

''اگر آپ بتانا نہیں چاہتے تو میں آپ پر زور نہیں ڈالوں گی۔''

''میں تم سے بھلا کیسے کوئی بات چھپا سکتا ہوں؟ یہ بھی بتا دیتا ہوں، خواہ زبان کھول کر میں تمھاری نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر جاؤں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہرگز یقین نہیں کر سکتی کہ آپ کوئی ناجائز کام کر سکتے ہیں۔''

''مجبوری کے عالم میں مردار بھی جائز ہو جاتا ہے..... اور یہ تو میری بیٹی کی زندگی کا سوال تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے رحمت خالہ کی پوتی کی شادی کے حوالے سے اپیل کی تھی.....''

''ہاں، ہاں..... آپ کے جمع کیے تیس ہزار روپوں سے اچھی طرح بچی کی شادی ہو گئی تھی۔''

''اصل جمع شدہ رقم اس سے کئی گنا تھی..... میں نے عہد کیا تھا کہ یہ رقم کسی اور مستحق کو بیٹی کی شادی کے لیے عطیہ کر دوں گا..... لیکن مجھے اپنی بیٹی کی شادی کے حوالے سے جس کڑی آزمائش کا سامنا تھا، اس میں مجھے اپنے آپ سے زیادہ مستحق کوئی نظر نہ آیا۔''

''اوہ..... تو یہ سب انتظام آپ نے.....؟''

''ہاں..... میری اپیل کے الفاظ یاد کرو..... ایک ایسی بچی کی شادی کرانے کے لیے آپ سب کا ہر ممکن مالی تعاون درکار ہے جس کے والدین اپنے اس فریضے کی ادائیگی کی قطعاً استطاعت نہیں رکھتے۔ میں نے کم از کم کسی کو دھوکا تو نہیں دیا ناں!''

◆◆◆

گھر! کون سا گھر.....؟

اظہر جاوید

پنجابی سے ترجمہ : حنیف باوا

بیرونی دروازے کی گھنٹی بجتی ہے تو میں سوچوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں۔ گیارہ بجے ہیں۔ ''کون آ سکتا ہے.....کون آیا ہے''؟

عید کا دن ہے۔ اس روز بھلا مجھے غموں اور یادوں کے سوا کون ملنے آتا ہے؟ شہر میں میرے جاننے والے بہت ہیں لیکن کسی کے ساتھ کوئی سانجھ نہیں۔ یہ سب ہنستے بستے گھروں کے باسی ہیں۔ میں بیچارا اجڑا پجڑا بندہ ہوں۔ عید کے روز بھلا کس کے پاس اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ اپنے رنگوں اور امنگوں بھرے ماحول سے نکلے اور میری خستہ حال دنیا میں آئے؟ میں بھی تو کسی کے ہاں نہیں جاتا۔ میں نے ویسے ہی دل کو سمجھا دیا ہے کہ اگر میں کسی کے ہاں چلا بھی گیا تو ان کے اجنبی سوالوں کا کیا جواب دوں گا؟ تنہا ہی خاموشی سے تھوڑا سا رو لیا اور چارپائی پر لیٹے ہی ادھر ادھر پہلو بدل لئے۔

میں بجھے ہوئے دل کے ساتھ اٹھا، دروازہ کھولا، دیکھا باہر صفائی کرنے والا کھڑا ہے۔

''سلام صاحب جی.....عید مبارک''.....میں نے اسے قدرے بے رُخیسے دیکھا اور اس کے سلام کا بھی آہستہ سے جواب دیا۔

''صاحب جی! عید پر گھر نہیں گئے''؟۔ اس نے ایک اور سوال داغ دیا۔ میں نے دھیمے سے ''نہیں'' کہا اور جلدی سے پیچھے مڑ گیا تا کہ وہ مزید سوالوں کی بوچھاڑ نہ کر دے۔ اندر جا کر میز پر سے کچھ پیسے اٹھائے واپس دروازے کی طرف مڑا اور اسے عیدی دیتے ہوئے فوراً کہا۔ ''صفائی کے لئے کل آ جانا''۔ اس نے نوٹ پکڑے، ایک اور سلام کیا اور ''اچھا جی'' کہتا ہوا فلیٹ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ میں نے دروازے کی کنڈی لگائی اور دوبارہ چارپائی پر دراز ہو گیا اور سوچوں کے بھنور میں گھر گیا۔ گھر، کس کا گھر.....؟ عید مبارک، کیسی عید مبارک؟ یہ باتیں تو خوشحال لوگوں کی ہوتی ہیں۔ میں کیا؟ مجھے خود سے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں کسی سے کیا پوچھوں اور کیسے بتاؤں کہ اس شہر میں میری بڑی تعلق داری ہے۔ دو سگے والدین کے علاوہ خالہ کے بیٹے، بیٹیاں اور ایک چچا زاد بہن بھی وہاں رہتی ہے۔ ان لوگوں کے سوا نزدیکی رشتے دار اور کون ہوتے ہیں۔ لیکن وہ تمام لوگ تو آسودہ حال اور بڑے بڑے عہدوں والے ہیں۔ عید کے روز میں اگر ان کے ہاں چلا بھی جاؤں اور ان کے ملنے والے ان جیسے ہی بڑے لوگ آ جائیں تو وہ ان سے میرا تعارف کیسے کرائیں گے وہ مجھے ان کے ساتھ احترام سے کس طرح بٹھائیں گے؟

کل، عید سے ایک روز پہلے میں دفتر میں تھا تو جاوید منظور اور ان کی شریک حیات لبنیٰ آ گئے۔ ان کے ساتھ میری نئی نئی جان پہچان ہوئی تھی۔ لیکن وہ بہت جلد اپنے پیار و محبت کے جذبات کے ساتھ میرے دل کے نہاں خانے میں رچ بس گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ان سے صدیوں کی جان پہچان ہو۔ وہ تو کیا ان کے گھر کے دوسرے افراد اور بچے بھی مجھے اتنی عزت اور پیار دیتے کہ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ یہ تمام لوگ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ لیکن وہ میرا اس قدر خیال رکھتے ہیں جیسے میں ابھی نومولود بچہ ہوں۔

یہ لوگ سرگودھے عید منانے کے لئے جا رہے تھے۔ ہر عید پر جاوید صاحب اور ان کے تمام بھائیوں کے اہلِ خانہ ماں باپ کے گھر جاتے ہیں۔ کتنی اچھی اور جیتی جاگتی زندگی کی کتنی خوبصورت رِیت ہے۔ لیکن رِیت رواج تمام گھر والوں کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ بے گھروں کو کسی بات کا مان؟

جاوید جی نے کہا۔ ''اظہر چلو آپ کو بھی سرگودھا لئے چلتے ہیں''.....؟۔ انھیں معلوم تھا کہ میرے ننھیال سرگودھا ہی میں تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے سرگودھا کے ذکر سے میرے اندر لاکھوں خوشیاں اور غم امنڈ آئے ہوں۔ کیا کیا نہ یاد آنے لگا۔ پل ہی پل میں گزرے سالوں کے قصے کہانیاں یاد آ گئیں۔ سرسبز و شاداب کھیتوں سے گزرتی پگڈنڈیاں، بُھٹا لے کر جاتی ہوئی عورتیں..... بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں، گائیوں بھینسوں کا ڈکارنا۔ جوہڑوں میں نہاتے بچے اور نہر سے پانی لے جانے والی دوشیزائیں۔ سلو، پھاپھی، زہری اور صفراں..... نہ جانے کون کونسی چمک دمک اپنا نظارا دکھا رہی تھی کہ جاوید نے پوچھا۔ ''آپ نے جواب نہیں دیا''؟

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔ ''آپ بھی بادشاہ ہیں.....'' میں نے ٹالنے کے لئے کہا۔ حالانکہ مجھے پتا تھا کہ سرگودھا میں نے کس کے پاس جانا ہے اور کن ہواؤں ان فضاؤں میں سانس لینا اور پیار کرنا ہے۔ دیگر یہ کہ میں اب گاؤں کس کے پاس جاؤں گا۔ بلاشبہ وہاں میرا ایک ماما اور مامی رہتے ہیں لیکن کیا وہ مجھے خندہ پیشانی سے ملیں گے؟ ماما.....! میں کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ ایک کہاوت ہے۔ ''اگر دو بار ماں ماں کہو تو ماما بنتا ہے میری بھاگوان ماں ایک کہانی سنایا کرتی تھی۔

کہتے ہیں کہ سالوں پہلے کسی گاؤں میں ماما بھانجا رہتے تھے جو ایک روز کسی قتل کے شبہ میں ایک جرگے کے سامنے لائے گئے۔ پنچایت والوں نے بڑے غور و فکر کے بعد فیصلہ دیا کہ دونوں میں سے ایک بری ہو سکتا ہے۔ آخری فیصلہ قاتل کی ماں اور قاتل کی بہن کے سپرد کیا گیا۔ اس عورت نے چند لمحوں کے لئے سوچا اور کہا۔ ''میرے بھائی کو چھوڑ دو'' لوگ بہت حیران ہوئے اور پوچھا۔ ''آپ نے یہ کیسا فیصلہ کیا ہے؟''۔ اس بیچاری نے کہا ''بات یہ ہے کہ میرے والدین مر چکے ہیں، مجھے بھائی اور نہیں مل سکتا۔ لیکن میں ابھی جوان ہوں اور بیٹا پیدا کر سکتی ہوں'' میں نے اس شہر اور اس گاؤں کے رہنے والے والدین کے بارے میں سوچا تو دل میں ایک چبھن سی اٹھی۔ لبنیٰ کہہ رہی تھی۔ ''آپ کو کونسی تیاری کی ضرورت ہے۔ یا پھر آپ نے کونسی کسی سے اجازت لینی ہے۔ اسی طرح اٹھ کر ہمارے ساتھ ہولو''۔ میں نے اب کوئی جواب نہ دیا بس ایک لمبی آہ بھر کر رہ گیا۔

عید چھوٹی ہو یا بڑی۔ میں ایک روز پیشتر کتنے ہی گھروں میں مٹھائی اور کیک تقسیم کر کے آتا ہوں۔ وہ کبھی پیار کبھی مذاق میں میرے گھر کا پتا پوچھتے ہیں کیونکہ وہ بھی راہ و رسم بڑھانا چاہتے ہیں۔ پر میں ہر بار ٹال دیتا ہوں۔ اور ہر بار ان کے طنز اور مزاح کا بوجھ اٹھا کر اپنے اس کھولی نما خستہ حال گھر میں آ جاتا ہوں۔ جسے خاکروب بھی گھر نہیں سمجھتا۔ پوچھتا ہے۔ ''صاحب جی گھر نہیں گئے؟'' اسے میں کیا

بتاؤں کہ گھر تو دلوں کی رونقوں سے آباد ہوتے ہیں۔ گھر میں چاہے جتنے ہی افراد ہوں منہا کیا ہوا انسان پھر بھی تنہا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر دل پرسکون اور سکھی ہو تو اکیلے ہونے کے باوجود موج میں ہوتا ہے۔ گزشتہ عید سے تین روز بعد مجھے چنداں نے پوچھا تھا۔ ''عید کیسی گزری تھی'' میں نے کہا۔ ''کچھ رو کر اور کچھ سو کر''۔ اکیلے بندے کی عید کا کیا ہے''۔ اس نے بڑا گہرا سوال کیا ''آپ اکیلے تھے؟''۔ اس کا سوال مصری کی طرح میری روح میں گھل گیا۔ میں نے جواب دیا ''نہیں تمھارے ہوتے ہوئے بھلا میں تنہا کیسے ہو سکتا ہوں۔''

لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ چنداں کو بھی معلوم ہے۔ اور مجھے بھی خوب پتا ہے کہ تنہائی کیا ہوتی ہے۔ عید کا مطلب یہ نہیں کہ تم جھوٹھ موٹھ کا گلے ملتے رہو۔ سویّاں کھاؤ۔ گوشت ہضم کرو اور یہ بھی کوئی بات نہ ہوئی کہ گھر میں قید ہو کر رہ جاؤ۔ لیکن سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ عملی دنیا اس کے برعکس ہے۔ یہاں صفائی کرنے والا بھی پوچھے گا اور اڑوس پڑوس والے بھی شک کی نظروں سے دیکھ کر کہیں گے۔ ''گھر کیوں نہیں گیا''.....؟۔ انھیں کیا بتاؤں۔ میں تو خود سے سوال کرتا ہوں کہ گھر کیوں نہیں گیا؟۔ کون سے گھر.....؟ نہ جانے کون سے گھر؟

◆◆◆

ماہنامہ **تخلیق** لاہور

تخلیق.....وہ شبنم ہے جو فطرت کی بے ساختگی کی مظہر ہے!

تخلیق.....وہ صبح کا تارا ہے جو تیرگیوں کے چھٹنے کی نوید ہے!

تخلیق.....وہ اذان ہے جو سلامتی اور تقدّس کی علامت ہے!

تخلیق.....وہ ماہنامہ ہے جو ادب و ثقافت کی نئی اقدار کا پیامبر ہے!

تخلیق.....وہ آواز، وہ تحریک ہے جو اظہر جاوید کے نام سے پہچانی جاتی ہے!

محترم لطیف احمد قریشی کی نادر تخلیقات

ممتاز شاعر، نقاد اور مترجم لطیف قریشی کی کتب

MULTI MEDIA AFFAIRS
21-Nand Street, Sham Nagar, Chowburji,
Lahore-54505, Pakistan. Tel: (92-042) 37356454
Mobile: 0333-4222998, 0322-4222998
E-Mail: multimediaaffairs@gmail.com
multimediaaffair@hotmail.com

RARE BOOKSHOP
گنجینہ نادر کتب
42-B Lower Mall Road, Lahore.
Tel: 042-37246110

حفیظ انجم کریم نگری (انڈیا)

حمد

تیری زمیں ہے، اَور ہے تیرا ہی آسماں
اِس کے اک ایک ذَرّہ پہ تو ہی ہے حکمراں

مظلوم کے لئے تُو سہارا ہے بالیقیں
پھیلائے ہاتھ مانگ رہا ہے اماں اماں

''مولا'' ولی بھی تیرے قطب اور رسول بھی
کرتے ہیں سب کے سب ترے احکام کا بیاں

تو دے رہا جینے کو سانسیں بھی بھیک میں
ہے گام زن یہ آج بھی سانسوں کا کارواں

بیشک ترا کرم ہے مرے رَبِّ ذوالجلال
تیرا ہی ذکر کرتی ہے میری سدا زباں

ہر گام امتحان ہیں راہِ حیات میں!
تُو کامیابی دے ہمیں، ہم میں ہے دم کہاں

سانسوں میں تُو ہی تو ہے مری دھڑکنوں میں تُو
ڈھونڈوں تجھے میں جا کے یہاں اور وہاں کہاں

ماں باپ بھائی بہن اولاد بھی ہے دی
اک نیک ہم سفر بھی دیا تو ہے مہرباں

توفیق آج تیری جو انجم پہ ہو گئی!
پھر سے اُگل رہا ہے قلم اِس کا کہکشاں

OOO

امین راحت چغتائی

O

جو فقط اپنے نام سے واقف
وہ رموزِ کلام سے واقف!

وہ بھی کہلائے میرِ مے خانہ
جو صراحی نہ جام سے واقف

اِک تگ و دو ہے بس مراتب کی
کون اب کس کے کام سے واقف!

دیکھ کر رزق وہ اُتر آئے
کب پرندے تھے دام سے واقف

اہلِ محفل میں کوئی تو ہوتا
گردشِ صبح و شام سے واقف

کیوں اُفق پر شفق کی سرخی ہے
کون احساسِ شام سے واقف!

بس یہی ایک جرم تھا اپنا
ہم کہ تھے اپنے کام سے واقف

ہم تو بے دام بِک گئے راحتؔ
ہم کہ تھے اپنے دام سے واقف

OOO

سیّد مشکور حسین یاؔد

O

ہم ذات کے ساتھ چل رہے ہیں
خطرات کے ساتھ چل رہے ہیں

ہم گونا گوں مگر دگر گوں
حالات کے ساتھ چل رہے ہیں

ہم گھات میں بیٹھتے نہیں ہیں
ہم گھات کے ساتھ چل رہے ہیں

خوشیوں کو لئے ہیں پریاں، اور غم
جِنّات کے ساتھ چل رہے ہیں

ہم کر کے اجل کو ٹکڑے ٹکڑے
اوقات کے ساتھ چل رہے ہیں

قِلّت کی قیامتوں کو لے کر
بُہتات کے ساتھ چل رہے ہیں

دن دوڑتا آرہا ہے پیچھے
ہم رات کے ساتھ چل رہے ہیں

خالی کبھی ہم نہیں چلے یاؔد
سوغات کے ساتھ چل رہے ہیں

OOO

انور سدید

O

روانہ ہو گئے ہیں اب وہ اپنے گھر کے لیے
یہاں جو رُک گئے تھے قافلے سحر کے لیے

وہ راستے میں دھماکے سے اُڑ گیا خود ہی
چھپا کے لایا تھا جو بم ہمارے گھر کے لیے

خبر جو لائے کہ دن آج اچھا گزرے گا
ترس رہا ہے مرا دل اسی سحر کے لیے

وفورِ شوق میں رستے پہ میری نظریں ہیں
کہ لکھ رکھا ہے یہ خط میں نے نامہ بر کے لیے

بھٹک نہ جائیں اندھیرے میں قافلے والے
چراغ لایا ہوں میں ایک راہ گزر کے لیے

میں اضطرابِ مسلسل میں اُلجھا رہتا ہوں
سکون ڈھونڈتا پھرتا ہوں لمحہ بھر کے لیے

وہ کیسی جلدی میں گزرے تھے اس طرف سے سدؔید
کہ رُک سکے نہ مرے پاس لمحہ بھر کے لیے

OOO

شاہین (کینیڈا)

O

اپنی سرشتِ خاص میں یزداں خصال ہے
دل خالقِ جہانِ فراق و وصال ہے
کن وسوسوں کے بوجھ سے تو یوں نڈھال ہے
اپنا تجھے خیال نہ میرا خیال ہے
کس سے بڑا ہے کون تقابل محال ہے
ہر باکمال آپ ہی اپنی مثال ہے
تقریب جو رہی ہو، یہ کشفِ کمال ہے
کاری ہے زخم، جی مگر آسودہ حال ہے
بادل بھری ہوا نے اگر ہاتھ رکھ دیئے
ڈھل جائے گی جبیں پہ جو گردِ ملال ہے
ہر وار کا جواب کوئی فرض تو نہیں
گاہے بگاہے چال نہ چلنا بھی چال ہے
یہ کیا کہ اشتہار شکم کا لئے پھریں
کاندھے کا بوجھ اصل میں جی کا وبال ہے
دیکھے ہیں خواب تیرے تعلق سے اس قدر
اب تو مری نگاہ میں بس اِک خیال ہے
رکھ دی ہے زندگی نے کچھ ایسی عجیب شرط
نرغے سے بے وفا کے نکلنا محال ہے
کیا دلفریب ہے پرِ پرواز کی صدا
رُخِ موسمِ بہار کا سوئے شمال ہے
باہر چہار سمت ہے وحشت ہی اک جواب
اور گھر تو جیسے کوئی برہنہ سوال ہے
ان آنسوؤں کو دیکھنے والا کوئی نہیں
اُن آنسوؤں میں تاج محل کا جمال ہے
شاہین آفریں کہ قیامت کے بعد بھی
میں ہوں شکستہ حال نہ تو ہی نڈھال ہے

OOO

مامون ایمن (نیویارک)

O

بچھڑ کے خود سے، زمانہ کو پا لیا ہم نے
ہَوا کے رُخ سے جو پردہ ہٹا لِیا ہم نے
ہمارے دِل سے شکایت تھی آئنہ کو، یوں
گذرتے وقت سے چہرہ سَجا لیا ہم نے
کبھی قیام کو منزل کا نام دے ڈالا
کبھی سَراب کو رستہ بنا لیا ہم نے
لگائی خود پہ وہ قدغن کہ خون کہلائی
خود اپنی ذات سے بھی خوں بہا لیا ہم نے
حصول جان کا درکار تھا، سو یوں خود کو
وفا کے خول میں جینا سِکھا لیا ہم نے
کبھی تھمایا ہواؤں کو اِک دِیا بجھتا
کبھی ہواؤں سے جلتا دِیا لیا ہم نے
ستم نواز تمنا کو زندگی کہہ کر
وفا میں کام خوشی سے چلا لیا ہم نے
اَنا کا زعم سفر ہی میں توڑ دے گا دَم
اگر سراب سے اپنا پَتا لِیا ہم نے
زمانہ ساز نگاہوں کا تھا خدا بھی ہدف
نہ جانے کیسی خودی کو بچا لیا ہم نے
تمام عمر تماشا بنے رہے جگ میں
ہر ایک سانس پہ اپنا مزا لِیا ہم نے
یقیں کو ہم نے جگایا تھا نیند سے، ایمنؔ!
بجھے چراغ سے ہر رَت جگا لِیا ہم نے

OOO

محمود شام

O

پھر قیامت بپا ہے شہروں میں
ننگے سر پھر حیا ہے شہروں میں

کیا کہا سندھ سے سمندر نے
آ کے بہنے لگا ہے شہروں میں

اجرکیں، ٹوپیاں، غبار آلود
سہمی سہمی انا ہے شہروں میں

مور نکلے ہیں خودکشی کرنے
کیسا میلہ سجا ہے شہروں میں

سندھ ندّی ہے شرم سے گم صم
کیسی بوجھل فضا ہے شہروں میں

کس نے جکڑے ہیں ہاشوؤں کے قدم
ہر کوئی پوچھتا ہے شہروں میں

عشق ہے تو کہاں کی مجبوری
کیوں برہنہ وفا ہے شہروں میں

گوٹھ حیرانیوں کی دھند میں ہیں
وقت ٹھہرا ہوا ہے شہروں میں

OOO

محمود شام

O

جسم انگڑائیوں کو بھول گئے
ساز اپنے سُروں کو بھول گئے

کانپتا باپ دیکھ کر بچے
اپنی فرمائشوں کو بھول گئے

اتنی لاشوں کا اہتمام کیا
لوگ سب مسئلوں کو بھول گئے

زندگی خلوتوں میں کٹنے لگی
اہلِ دل محفلوں کو بھول گئے

سائرن، گولیاں، کفن، قبریں
شہر شہنائیوں کو بھول گئے

صرف شاخوں کی ناز برداری
پیڑ اپنی جڑوں کو بھول گئے

آدمی کی درندگی دیکھی
جانور جنگلوں کو بھول گئے

OOO

ناصؔر زیدی

O

نہ کام آئی مرے کچھ مری شرافت بھی
مرے خلاف ہوئی اُس کے ساتھ خلقت بھی

وہ شخص یُوں تھا کہ جیسے دُھلا دُھلایا ہوا
تھی ختم اُس پہ ہر اک طرح کی نفاست بھی

وہ جامہ زیب تھا اِتنا کہ تکتے ہی رہیئے
یہ دل تو چاہتا تھا مستقل رفاقت بھی

مَیں اُس کے سامنے گُم صُم رہا سخن بستہ
نہ کر سکا کبھی عرضِ ہُنر کی جرأت بھی

برت نہ سکتا تھا کھل کر وہ التفات مگر
تھی اُس کی چشمِ فسُوں ساز میں مروّت بھی

مَیں کارگاہِ جہاں میں ازل سے ہوں تنہا
نہ راس آئی مجھے مَہوشوں کی قربت بھی

ہجومِ شوق میں یُوں بھی ہوا کہ مَیں ناصؔر
'چھپا' سکا نہ بہ عجلت کوئی حماقت بھی

OOO

ناصؔر زیدی

O

اب نہیں ملنے کا پھر امکان اُٹھتے بیٹھتے
ہے بپا دل میں عجب طُوفان اُٹھتے بیٹھتے

جو نہیں ہیں واقفِ آدابِ دلداری یہاں
کیا سمجھ پائیں گے وہ نادان اُٹھتے بیٹھتے

کچھ نہ کچھ تو شومئ قسمت بھی ہے اس میں ضرور
تُو مجھے ہی بے وفا مت جان! اُٹھتے بیٹھتے

تم نہیں ہو تو بہاروں کا تسلسل کس لئے
کیوں کوئی ہوتا رہے ہلکان اُٹھتے بیٹھتے

روپ میں انسان کے وحشی درندے ہیں یہاں
ہم نے دیکھے ہیں کئی انسان اُٹھتے بیٹھتے

کر رہے ہیں وہ بظاہر تو دَوائے دردِ دل
دے رہے ہیں موت کا سامان اُٹھتے بیٹھتے

گُل رُخوں کی صحبتوں سے کیا ملا ناصِر تجھے
خواہ مخواہ کی بے کلی 'خلجان' اُٹھتے بیٹھتے

OOO

انوار فیروز

O

میں آزاد پرندہ ہوں
کیسے قید میں زندہ ہوں

کس کے حکم پہ زندہ ہوں
کس کا میں کارندہ ہوں

میری قسمت میں ہیں غم
خوشیوں کا جوئندہ ہوں

میری قدر کرے گا تو
میں تیرا آئندہ ہوں

خود ہی وطن تاراج کیا
خود سے میں شرمندہ ہوں

اچھا دَور بھی آئے گا
اس اُمید پہ زندہ ہے

نام ہی میرا ہے انوار
ظلمت میں رخشندہ ہوں

OOO

نسیمِ سحر

O

لہو بکھرا ہوا ہے روشنی کا
تو کیا خنجر چلا ہے تیرگی کا؟
مجھے ہی شوق آئینہ گری کا
مجھی کو سامنا بے چہرگی کا!
اُسے کچھ اَور بھی تابندہ کرنے
''تعاقب کر رہا ہوں روشنی کا''
اثر اب بھی ہے میرے روز و شب پر
بہت اُس زلف کی پیچیدگی کا
لہو سے نام اِک لکھا تھا جس پر
وَرَق غائب وہی تھا ڈائری کا
تجھے دیکھا ہے جس عالم میں اُس نے!
عجب عالم ہے تیرے حیرتی کا
ارادہ ہی نہیں ملنے کا مجھ سے
بہانہ ہے وہی کم فرصتی کا
مَیں چاہے جِس سے بھی منسوب کر دوں
مگر یہ ذِکر ہوتا ہے اُسی کا!
ہیں روشن اب بھی سورج، چاند، تارے
وہی عالم ہے اب بھی تیرگی کا
سمندر سے تو ہم مایوس لوٹے
مگر کیا ظرف تھا سوکھی ندی کا!
بڑھایا جائے میری تشنگی کو
مُداوا ہے مِری تشنہ لبی کا
بہت مُشکل ہے کیا ترکِ تعلّق؟
مگر یہ مشورہ تھا آپ ہی کا!

OOO

سیّد ریاض حسین زیدی

O

اُترا نہیں ہے آنکھ میں گریہ کا نَم ابھی
شاید غمِ حیات کی تلخی ہے کم ابھی

اُمڈے ہوئے خیال! ذرا اور ضبط کر
طولِ شبِ فراق کا تو دیکھ دَم ابھی

دریوزہ گر نہیں ہوں کِسی دستِ غَیر کا
جامِ سفال اپنا ہی ہے جامِ جَم ابھی

دستارِ شہرِ یار کا دَم خم نہ کم ہوا
دیکھا غریبِ شہر کا ہے سَر تو خم ابھی

ہلکی سی بارشوں میں گھروندا وہ کیا گِرا
آنکھوں میں تیرتے ہیں مِرے اُس کے غم ابھی

ہر خونچکاں خبر کا تسلسل مزید ہے
حالاتِ اشکبار میں ہیں بیش و کم ابھی

طوفانِ بے اماں کا ستم جس قدر سہی
دل سے ریاضؔ ہو تو وہ جائے گا تھم ابھی

OOO

ارشد محمود ارشدؔ

O

مجھے ایسا بھی جانے کیا ہوا تھا
کھلی آنکھیں تھیں میں سویا ہوا تھا

محل کیسے بدلتے ہیں کھنڈر میں
جبینِ وقت پر لکھا ہوا تھا

فصیلِ ہجر پر آنکھیں سجا کر
کسی نے سانس تک روکا ہوا تھا

مجھے منزل صدائیں دے رہی تھی
مگر میں راہ میں اُلجھا ہوا تھا

سرِ مژگاں چمکتے موتیوں میں
کسی کا خواب بھی ٹوٹا ہوا تھا

مجھے پھر تُو نے تنہا کر دیا ہے
بڑی مشکل سے میں تیرا ہوا تھا

مجھے ارشدؔ وہ سب کچھ مل گیا ہے
ترے حصّے میں جو لکھا ہوا تھا

OOO

آصف ثاقب

O

وطن کے پھول سے بستر ہمیں بلاتے ہیں
چلیں گے لوٹ کے اب گھر ہمیں بلاتے ہیں

نظر ملاتی سی محفل تمہیں بلاتی ہے
نظر بچاتے سے پیکر ہمیں بلاتے ہیں

ہم اپنی سادہ دلی سے ہیں بے خبر اتنے
عذاب رما کے ٹھوکر ہمیں بلاتے ہیں

ہم اپنے سینے پہ تمغے سجا کے نکلیں گے
تمہارے نیزہ و خنجر ہمیں بلاتے ہیں

سنا ہے یار حساب و کتاب رکھتا ہے
سُنا ہے یار کے محشر ہمیں بلاتے ہیں

پرائے دیس کی نیندوں میں کھوئے رہتے ہو
یہ کہہ کے دیس کے منظر ہمیں بلاتے ہیں

اُچھلتے ناچتے جائیں گے اُس طرف ثاقبؔ
قلندروں کے قلندر ہمیں بلاتے ہیں

OOO

رفیع الدین ذکیؔ قریشی

O

ہر زخمِ تمنّا بھی نگینے کی طرح ہے
اُمیدوں کی کثرت بھی خزینے کی طرح ہے

ساحل پہ پہنچتی ہے کہ گرداب میں دیکھیں
یہ زیست کہ لہراتے سفینے کی طرح ہے

اے دیدۂ غمّاز نہ کھل جائے جہاں پر
غم اُس کا مرے دل میں دفینے کی طرح ہے

اے دوست بہ ہرگام ذرا سوچ سنبھل کر
یہ وقت پھسلتے ہوئے زینے کی طرح ہے

کیا جانیے طوفان چھپے اِس میں ہیں کیا کیا
اک اشک جو پلکوں پہ نگینے کی طرح ہے

بہتا ہی رہا خاک پہ زردار کے ہاتھوں
مُفلس کا لہو جیسے پسینے کی طرح ہے

اک درد کا تیشہ کہ رواں ہے رگِ جاں پر
جینا بھی ذکیؔ! کب مرا جینے کی طرح ہے

OOO

کرشن کمار طوؔر (انڈیا)

O

دلوں میں نوک سناں ہے بہت بہ خاک انداز
مرے لئے تو جہاں ہے بہت بہ خاک انداز

یہ عشق اب بھی قضا کا بنا ہوا ہے ہدف
یہ دہر اب بھی جواں ہے بہت بہ خاک انداز

نہ طنطنہ ہے لہو کا نہ روشنی کا ہے ذکر
چراغِ بزمِ جہاں ہے بہت بہ خاک انداز

جسے کہ کرنی تھی سرسبز فصل عشق صفت
وہ میرے بعد یہاں ہے بہت بہ خاک انداز

اب اس کے بندِ قبا کھول کر بھی کیا حاصل
یہ ایک کارِ زیاں ہے بہت بہ خاک انداز

نہ اس سے خوش ہے زمیں اور نہ شادِ ہفت افلاک
وہ شخص خود پہ گراں ہے بہت بہ خاک انداز

یہاں پہ کچھ بھی نہیں ہے سوائے درد کے طوؔر
یہ میرے دل کی دکاں ہے بہت بہ خاک انداز

OOO

وِشا کھُلّر (انڈیا)

O

دل کو راحت ملے تو بات چلے
تم جو آؤ تو کائنات چلے

اس گلی سے گذر کے سوچیں گے
دُور تک کس کے ساتھ سات چلے

اپنا ہونا بھی کیسا ہونا ہے
نکتہ چینی میں یوں حیات چلے

جب محبت کا رنگ اُوڑھا تو
دیر تک صبح، شام، رات چلے

اس کے آگے نہیں کسی کا بس
جیت ٹھہرے نہ کوئی مات چلے

اس کا ملنا، اسی کا ملنا ہے
اس سے مل کر اسی کی بات چلے

رُکنا لازم تھا، ڈال ڈال رُکے
چلنے بیٹھے تو پات پات چلے

منجمد تھے تو کارِ جاں تھا بند
جسم کُھلنے لگا جو ہاتھ چلے

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

O

بیٹھ کر تنہا کبھی یادوں کے منظر دیکھنا
آشیاں بکھرے ہوئے، ٹوٹے ہوئے پُر دیکھنا

خار میں بھی ڈھونڈ لینا تیری ہی کوئی ادا
اور ہر اِک پھول میں تیرا ہی پیکر دیکھنا

کیوں بچھڑنے کا کوئی وعدہ وفا کرتے نہیں
چھوڑ دو جاتے ہوئے مُڑ مُڑ کے اکثر دیکھنا

جانے کب سے ایک صحرا کی طرح ہوں تشنہ لب
ایک دن ہو جاؤں گا میں بھی سمندر دیکھنا

انقلابِ نو نہ سمجھو ہر نئی آواز کو
چھوڑو ہر آہٹ پہ یوں گھر سے نکل کر دیکھنا

گردشِ حالات میں گر ٹھوکریں کھاتے رہے
سیدھے سادے لوگ بن جائیں گے پتھر دیکھنا

کِس قدر گہری ہیں اُس کی جھیل سی آنکھیں ندیمؔ
ہو سکے تو تم کبھی اُن میں اُتر کر دیکھنا

OOO

رومانہ رومیؔ

O

زندگی میں کوئی تو ہو گا پُرفشاں لمحہ
مجھ کو کر دے جو ترے عشق میں حیراں لمحہ

وصل کہتے ہیں کسے تجھ کو بھلا کیا معلوم
تیری قسمت میں تو لکھا ہے گریزاں لمحہ

تم نے برسوں کے تعلّق کو مٹایا جس دَم
بَن گیا ہے وہی قسمت کا پریشاں لمحہ

تجھ کو معلوم نہیں ہے تو، بتائیں کیوں کر
کیسے کٹتا ہے غمِ ہجر کا ویراں لمحہ

جب تو گزرا ہی نہیں ہے کبھی اس عالم سے
کیسے سمجھے گا محبت کا گُل افشاں لمحہ

میری مانند کہاں رکھتے ہو دل سینے میں
کیسے محسوس ہو پھر آئینہ ساماں لمحہ

حوصلہ رکھّو! کِسی وقت بھی مایوس نہ ہو
سب ہی کی زیست میں ہوتا ہے فروزاں لمحہ

وصل کی شب جو، ہواؤں نے کیا رقصِ حسیں
آج بھی یاد ہے مجھ کو وہ غزل خواں لمحہ

تری یادوں کی میں چھاؤں سے نکل آؤں کیوں
تری یادوں کا تو ہے ابرِ بہاراں لمحہ

جرم ہی کوئی نہیں ہے تو سزا کیوں رومیؔ!
زندگی میں، مری پھر کیوں ہے پشیماں لمحہ

OOO

ایم زیڈ کنولؔ

O

آگ صحرا میں لگا آئی ہوں میں
یاد کا خِرمن جلا آئی ہوں میں

خوشبوؤں کو مات دینے کے لئے
بن کے گلشن میں صبا آئی ہوں میں

جیتنے کی دل میں لے کے آرزو
کشتیاں ساری جلا آئی ہوں میں

سچ نے جن کے ہونٹ بھی سِلوا دیئے
بن کے ان کی ہی نوا آئی ہوں میں

میرے کاندھے پر ہے جگنو کی رِدا
ظلمتوں کو یہ بتا آئی ہوں میں

آرزو کی چلچلاتی دھوپ میں
یاس کا آنچل بچھا آئی ہوں میں

اِک کنولؔ کا دیکھنے کو حوصلہ
آب کا آنگن بسا آئی ہوں میں

OOO

عمرانہ مشتاق

O

جیسے کہ آشنا نہ تھے ایسے نظر بدل گئے
اس پہ گلہ ہو کیوں تمھیں ہم بھی اگر بدل گئے

برسوں کی آشنائی کا قِصّہ تمام یوں ہوا
وہ بھی اُدھر بدل گئے، ہم بھی اِدھر بدل گئے

اہلِ چمن نے دیکھ لی اپنی خزاں رسیدگی
اب کے برس بہار میں کتنے شجر بدل گئے

دیکھ کر شہر خواب میں ایسا بھی واقعہ ہوا
اہلِ نظر وہی رہے، اہلِ خبر بدل گئے

جو مرے ساتھ ساتھ تھے، اُن کا لکھوں میں حال کیا
شوق سفر وہی رہا، راہِ سفر بدل گئے

جو تھیں دلوں کی ترجماں، اب وہ حقیقتیں کہاں
عکسِ فریب بن گیا، آئنہ گر بدل گئے

مانیؔ تمھی کہو کہ پھر دیکھتی کس کے خواب مَیں
اب کے تو اِس بہار میں خواب نگر بدل گئے

OOO

رشیدہ عیاں (امریکہ)

O

دشت میں سایۂ دیوار نہ ہو گا؟ ہو گا
غم یہ کیوں ہے کوئی غمخوار نہ ہو گا؟ ہو گا

کیسے ممکن ہے، ہمیں احسنِ تقویم کہیں
اور ہم سے ہی سروکار نہ ہو گا؟ ہو گا

واعظو! مجھ کو نہیں، رحمتِ حق کو دیکھو
خُلد میں کوئی گنہگار نہ ہو گا؟ ہو گا

یہ تو اِک خام خیالی ہے کہ ایذا سہہ کر
آپ کا کوئی طلبگار نہ ہو گا؟ ہو گا

منڈیاں شہر کی گر بند کرائیں بھی تو کیا
ذات میں حشر کا بازار نہ ہو گا؟ ہو گا

لاکھ ہوں خانہ بدر ساتھ ہے ہستی کا حصار
کیا ہمارا کوئی گھر بار نہ ہو گا؟ ہو گا

نااُمیدی کا یہ سورج ہے عیاں مت سوچو
راہ میں سایہ، اشجار نہ ہو گا؟ ہو گا

OOO

تاشی ظہیر (امریکہ)

O

وحشتِ عشق لکھوں، یا دمِ صحرا لکھوں
زندگی تو ہی بتا، میں تجھے کیا کیا لکھوں

مجھ سے پُرنم ہے مری عمر رواں مدّت سے
ایک پل کو، جو ٹھہر جائے تو لمحہ لکھوں

تشنگی میں بھی خدا، اتنی بصیرت مجھے دے
ریت کو ریت لکھوں، دریا کو دریا لکھوں

ہے بہت کچھ ابھی لکھنے کے لئے جانتا ہوں
خود سے فرصت کبھی پاؤں تو میں دنیا لکھوں

بس مرے لوح و قلم پہ یہ سخاوت کر دے
اپنے دشمن کو بھی لکھوں تو میں اچھا لکھوں

ظلمتِ شب کی گرانی میں جیئے جاتا ہوں
اک کرن بھی کہیں پھوٹے تو سویرا لکھوں

پوچھ لوں پہلے شجر سے میں کہانی اُس کی
پھر ہر اک شاخِ برہنہ کا میں نوحہ لکھوں

OOO

میثم علی آغا

O

ہر ایک بات پہ تلوار کھینچتا کیوں ہے
تُو میرے سر سے یہ دستار کھینچتا کیوں ہے

تُو صاف کیوں نہیں کہتا کہ چھوڑ جا مجھ کو
قدم قدم پہ یہ دیوار کھینچتا کیوں ہے

تُو جانتا ہے میں واپس پلٹ نہیں سکتا
اے عشق مجھ کو تُو بے کارِ کھینچتا کیوں ہے

اُدھر وہ دشت پکارا ہی جا رہا ہے مجھے
اِدھر یہ زیست کا بازار کھینچتا کیوں ہے

میں کوئی میثم تمّار تو نہیں میثم
میرا جنون سرِ دار کھینچتا کیوں ہے

OOO

اسداعوان

O

یار نئے یاروں کے سنگ آ جاتے ہیں
ہم بھی نت ملنے سے تنگ آ جاتے ہیں

ہجر میں جینا مشکل ہے تو حکم کرو
تخت ہزارہ چھوڑ کے جھنگ آ جاتے ہیں

تم تو سرخ گلاب تھے ویسے اِس رُت میں
پیلے پھولوں پر بھی رنگ آ جاتے ہیں

شوریدہ بختی ہے ماہی گیروں کی
جن کے جال میں روز نہنگ آ جاتے ہیں

اِس دربار پہ رونق رہتی ہے اکثر
اِس دربار پہ مست ملنگ آ جاتے ہیں

OOO

ندیم ہاشمی

O

رات اشکوں میں ڈھل گئی کیسے
دَرد کی لَے مچل گئی کیسے

اے قرارِ نظر بتا تو سہی
پھر طبیعت سنبھل گئی کیسے

اُس کے خوابوں سے میں نہیں نکلا
پھر وہ آنکھوں کو مَل گئی کیسے

اُس نے ایسا کیا ستم ڈھایا
آگ، پانی سے جَل گئی کیسے

جانے کیا معجزہ ہوا ہے ندیمؔ
جو بَلا آئی، ٹَل گئی کیسے

OOO

نجمہ شاہین کھوسہ

O

منظر تمام آج تک آنکھوں پہ بوجھ ہیں
جتنے بھی خواب ہیں مری پلکوں پہ بوجھ ہیں

اُترے گا چاند تو مری بھر آئے گی یہ آنکھ
تارے فلک سے ٹوٹ کر راتوں پہ بوجھ ہیں

سوچوں پہ نقش ہیں وہ جو پَل تھے وصال کے
دُکھ ہجر کے تمام ہی لمحوں پہ بوجھ ہیں

باتیں اُس ایک یاد کی باتوں کا حُسن ہیں
یادیں اُس ایک یاد کی یادوں پہ بوجھ ہیں

نجمہؔ کہیں بھی جھوٹ کا جن پر گمان ہو
ایسے تمام لفظ ہی شعروں پہ بوجھ ہیں

OOO

طفیل عامر (لندن)

O

رُوپ بدلتے رہیں
پھولتے پھلتے رہیں

آزماش گر نہ ہو
سلسلے چلتے رہیں

وقت کو سمجھیں کہیں
ہاتھ نہ ملتے رہیں

صدقہ و خیرات سے
دن بُرے ٹلتے رہیں

اوٹ میں تو دوستو!
سب دیئے جلتے رہیں

دُکھ سہی عامرؔ مگر
آپ تو چلتے رہیں

OOO

محمد افضال انجم

O

ذرا سی گردش دوراں کو امتحاں نہ سمجھ
گزر رہی ہے جو دل پر اسے گراں نہ سمجھ
محبتوں میں تو ہوتا ہے جانے کیا کیا کچھ
دل تباہ کے لُٹنے کو اک زیاں نہ سمجھ
ابھی تو لُٹنا تڑپنا بہت ہے قسمت میں
یہی ہے عہد بہاراں اسے خزاں نہ سمجھ
ابھی تو اور گزرنا ہے دھوپ میں جلتے
ذرا سی چھاؤں ملی ہے تو سائباں نہ سمجھ
ابھی تو کچھ بھی مسخّر نہیں کیا تو نے
جو سامنے ہے نگاہوں کے آسماں نہ سمجھ
لگی ہوئی ہے انوکھی سے آگ سینے میں
جو اُٹھ رہا ہے مرے دل سے یہ دُھواں نہ سمجھ
ابھی تو اور بھی لمبی ہے رات ظلمت کی
بدلنے والا ہے آخر کو یہ سماں، نہ سمجھ
جو لوگ اہلِ بصیرت ہیں جان لیتے ہیں
چھپی ہوئی ہے جو دل میں اسے نہاں نہ سمجھ
اُٹھا ہی لوں گا ترا بوجھ، دل کی بات تو کر
تو میرے کندھوں کو اتنا بھی ناتواں نہ سمجھ
بس اک خدا کو یہاں پر ثبات ہے انجمؔ
سو اپنی عمر گریزاں کو جاوداں نہ سمجھ

OOO

انشائیہ

رکوع میں جانے کی ادا

سیّد مشکور حسین یاد

کھڑے ہونے کی ادا میں ایک بہت بڑا خطرہ پوشیدہ ہوتا ہے اور وہ خطرہ تکبّر کا ہے یعنی کھڑے ہو کر انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز نہ سمجھنے لگے۔ اس خطرہ کو دور کرنے کیلئے انسان کے پاس رکوع میں جانے کی ادا ہے۔ رکوع یعنی جھکنے کے عمل میں انکسار کی ادا اپنا کام سرانجام دیتی ہے اور انسان کو تکبر سے محفوظ رکھتی ہے۔ رکوع میں جاتے ہی انسان اپنے آپ کو انکسار کے سایۂ عاطفیت میں محسوس کرتا ہے اور بلند ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ عجز و انکسار کی بلندی اسے عرش سے آگے تک لے جا سکتی ہے۔ رکوع ایسی کمان ہوتی ہے جس سے غرور انسانی پر پے بہ پے تیر برستے ہیں لیکن یہی تیر شعور انسانی پر کرنوں کی طرف برستے ہیں اور اسی وقت انسان کے چاروں طرف عجیب طرح کے اجالے اپنے اپنے آفاق تخلیق کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ انکسار میں انسان تخفیف اور تفریق کے عمل سے گزرتا ہے تو صفر تک پہنچ کر وہ پھر گونا گوں اضافوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ رکوع میں بظاہر بھی آدمی قوس کی صورت اختیار کرتا ہے گویا قوس قزح کی صورت جس میں کئی طرح کے رنگ اپنی بہار دکھا رہے ہوتے ہیں اور عجز و انکسار انسان کو رنگا رنگ کر دیتا ہے۔ تکبر اور غرور کے عالم میں انسان تنہا ہو جاتا ہے۔ چیزیں اسے بہت چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں اور چیزوں کا یہ چھوٹا پن اسے ایک وقت میں معدوم کی طرف لے جاتا ہے یعنی چیز میں چھوٹی ہو کر اس کی نظر سے غائب ہو جاتی ہیں لیکن عجز انکسار میں اشیا اپنے مقام پر رہتی ہیں اسی لئے انسان کو ان کے مختلف رنگ بھی نظر آتے ہیں اور یہ رنگ انسان کے عالم انکسار کو سرتاپا رنگین بنا دیتے ہیں۔

اور پھر منکسر المزاج کی شخصیت اس قدر رنگوں میں ڈوبنے کے باوجود انسان کی اپنی شناخت پر اس کا کوئی برا اثر تو کیا پڑنا تھا عجز و انکسار کے عالم میں انسان کی شخصیت مزید ابھر کر اور سنور کر سامنے آتی ہے۔ اگر آپ واقعی انسان کو بنا سنورا اور دولہا بنا دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے انکار کے عالم میں دیکھیے اور جیسا کہ میں ابتداء سے کہتا چلا آ رہا ہوں انسان کے رکوع کی، جھکنے کی ادا ایسی کافر ادا ہے کہ اس پر ایمان کے بے شمار عالم قربان کئے جا سکتے ہیں۔ وہی بات کہ جیسے ہی انسان رکوع میں جاتا ہے تکبّر کے تمام بت گرنے شروع ہو جاتے ہیں اور جیسے جیسے یہ بت گرتے ہیں حقیقت عظمیٰ کے نو بہ نو جلوے سامنے آنے لگتے ہیں اور انسان کی زندگی میں ایک نئی صبح طلوع ہونے لگتی ہے۔

اصل میں انسان جب رکوع کے لئے جھکتا ہے تو اس وقت عرفان و معرفت کے نئے نئے دروازے وا ہونے شروع ہوتے ہیں۔ جھکنے کی ادا سے پہلے انسان اپنے کھڑے ہونے کی ادا کا اس طرح شکار ہوتا ہے کہ عموماً اسے اپنی انا کے علاوہ اور کچھ مشکل سے نظر آتا ہے لیکن جھکنے کی ادا اس کی شخصیت کو کمان کی شکل دیتی ہے تو اس کی انا میں ایک لچک پیدا ہوتی ہے جو اس کی انا کو کمان بنانے کے علاوہ

وسعتوں کا احساس بھی دلاتی ہے۔ انسان جھکتا ہے تو صرف ایک طرف نہیں جھکتا اسے اس وقت اطراف عالم اپنی طرف متوجہ کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ کھڑے ہونے کی حالت میں بھی آپ ادھر ادھر اوپر نیچے دیکھ سکتے ہیں، لیکن اس دیکھنے میں لچک نہیں ہوتی..... ذات کی کڑی کمان کا تیر ہاتھ سے ادھر ادھر چھوٹتا دکھائی دیتا ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ رکوع میں انسان کے جھکنے کی ادا کا آغاز ہوتا ہے اور بظاہر اس کا اختتام سجدہ پر ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جھکنے کی ادا کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص کے اپنے اپنے ظرف پر منحصر ہے۔ جتنا آپ کا ظرف وسیع، بلند اور گہرا ہوگا اسی نسبت سے آپ جھکتے چلے جائیں گے اور اسی نسبت سے آپ کی وسعت، بلندی اور گہرائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ وہی بات کہ اصل میں آپ جھکتے نہیں بلکہ اپنی ذات کی وسعت، بلندی اور گہرائی کو چیلنج کرتے ہیں کہ یہ کتنے پانی میں ہیں اور آپ جتنا جھکتے چلے جاتے ہیں آپ کو پتہ چلتا جاتا ہے کہ آپ کی وسعتوں، بلندیوں اور گہرائیوں کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں۔ یہودیوں اور نصاریٰ کی نماز میں تو خیر رکوع ہے ہی نہیں مسلمانوں کی نماز میں رکوع ہے اور اس اللہ کی پاکیزگی یعنی پالنے والے رب کی پاکیزگی کے بعد اس کی عظمت کی حمد کی جاتی ہے۔ جس کا مطلب کم از کم میں یہ سمجھا ہوں کہ جھکنے کی ادا یعنی انکسار انسان کو پاکیزگی کے تصور سے آشنا کرتا ہے پھر پالنے والے کی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔ جھک کر آدمی پاکیزہ بھی ہوتا ہے اور عظیم بھی، پاکیزہ ہونے کا مطلب ہے اپنے آپ کو ان اشیاء میں ملوث ہونے سے بچانا جو انسان کو حقیقت، عظمیٰ کی قربت سے دور رکھتی ہیں۔ وہی بات کہ بظاہر انسان انکسار میں اپنی نفی کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اپنی ذات کی غلاظتوں سے محفوظ رکھنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا ہے، جھکنے اور رکوع کے عالم میں انسان کے قلب و نظر پر ایک عجیب کیفیت یہ طاری ہوئی کہ وہ خود کو غلاظتوں سے بچاتا تو ہے لیکن ان کی اپنی ایک اہمیت سے بھی انکاری نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں انکسار آدمی کو اعتدال میں رہنا سکھاتا ہے اور یہ بھی احساس دلاتا ہے کہ دنیا کی کسی چیز کو غیر اہم نہ سمجھو خواہ وہ بظاہر کتنی بھی حقیر کیوں نہ ہو۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ انکسار انسان کو اس کی اپنی اور دیگر مخلوقات عالم کی عظمت کا احساس بھی دلاتا ہے۔ اس طرح عجز و انکسار انسان کی نظر پر کسی چیز کو غیر اہم سمجھنے کا ذرا سی خیال بھی تصویر بنا کر پیش نہیں کرنے دیتا۔

اور جب انسان انکسار کے ساتھ پاکیزگی، عظمت اور اہمیت کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے تو اس کی شخصیت میں ایک عجیب انداز کی رعنائی پیدا ہوتی ہے۔ عاجزی انسان کی صورت اور سیرت دونوں کو خوبصورت اور جمال آفریں بناتی ہے۔ آپ منکسر المزاج آدمی کو ہر وقت طرح طرح کی زیبائیوں سے رچا بسا دیکھ سکتے ہیں۔ انکسار آدمی کو جس طرح حسن و جمال سے وابستہ کرتا ہے اس کی مثال ہمیں کسی دوسری قدر انسانی میں بہت کم نظر آتی ہے اور جس طرح عجز و انکسار انسان کی شخصیت کو زینت بخشتا ہے اس کا بھی جواب نہیں۔ ہاں یہ ایک الگ سوال ہے کہ عجز و انکسار کی خلعت سے جو لوگ مزّین اور معزز ہوتے ہیں ان کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو روشن کرنا ہر شخص کے نصیب میں نہیں ہوتا اگرچہ ہر شخص کی آنکھوں میں وہ بینائی ضرور ہوتی ہے جس کے ذریعے ہر شخص صاحبان انکسار کا پوری طرح دیدار کر سکتا ہے۔

◆◆◆

بادل

سلیم آغا قزلباش

جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں، لیکن کیا پتہ وہ کس وقت گرجنا بند کر دیں اور برسنا شروع ہو جائیں۔ اعتبار کا تو زمانہ ہی ختم ہو گیا ہے، اسی لئے موسمیاتی ادارے بادل کی متلون مزاجی کو اپنے کسی آلے کی مدد سے جاننے میں اکثر ناکام رہتے ہیں۔ بادل بظاہر آسمان کے نیلگوں سمندر میں کسی دخانی جہاز کی طرح تیرتا چلا جاتا ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ بادل نہ ٹھوس ہے، نہ مائع۔ اس چیز نے اسے ایک پر اسرار ہستی بنا دیا ہے جو اچانک کسی سمت سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے چہار دانگ اپنے پر پھیلا دیتی ہے۔ سو میں بادل کو زمین کی روح سمجھتا ہوں جو پر پھیلائے اس پر منڈلاتی رہتی ہے، بادل چونکہ سمندر کے تہ خانہ سے اٹھتا ہے اس لئے میرے نزدیک یہ سمندر کا آسمانی روپ ہے جو کسی سقّے کی طرح اپنی مشک سے زمین کی ازلی وابدی پیاس بجھانے کے لئے اس پر چھڑکاؤ کرتا رہتا ہے اور پھر ننھے منے سینکڑوں رنگوں کے نازک شگوفے زمین کی چھاتی پر ہمکنے لگتے ہیں۔ یوں بھی بادل کا وجود یکسانیت کے خلاف ایک کھلا احتجاج ہے، اگر بادل کو ہماری زندگی سے نکال دیا جائے تو پھر شاید ہم سب کی زندگیاں بالکل سپاٹ ہو کر رہ جائیں؛ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ بادل کی چلت پھرت سے ہی آسمان کے وجود کا احساس ہوتا ہے وگرنہ آسمان اپنی لامتناہی نیلاہٹ کی یکسانیت کے ہاتھوں کبھی کا اپنا رنگ روپ کھو چکا ہوتا۔ یوں بھی تبدیلی زندگی کا وصف ہے اور وہ جو تغیر کے خلاف ہیں، وہ دراصل زندگی کے حق میں نہیں ہیں، کیونکہ دیکھا جائے تو زندگی بذاتِ خود بادل کا ایک منچلا ٹکڑا ہی تو ہے، جسے کسی پہلو قرار نہیں اور جس طرح بادل آسمان پر مختلف روپ بدلتا ہے انسان بھی اپنی زندگی میں کئی بہروپ بھرتا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ انجام دونوں کا ایک جیسا ہے یعنی برستے چلے جانا، چاہے وہ بارش کی بوندوں کی صورت میں ہو یا آنسوؤں کے قطروں کی صورت میں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ جب جھڑی لگتی ہے تو دھرتی کے سینے میں کئی شگاف پڑ جاتے ہیں اور اگر آدمی کی زندگی میں شگاف پڑ جائیں تو جب تک اس کی آنکھوں کے تال جل تھل نہ ہو جائیں اسے کسی کروٹ چین نصیب نہیں ہوتا۔ خدانخواستہ غم کے بادل کھل کر نہ برسیں تو پھر یہ اندر ہی اندر چپکے چپکے برستے رہتے ہیں جس سے جسم کو کوئی نہ کوئی موذی روگ لگ جاتا ہے جو بالآخر اسے ملیامیٹ کر ڈالتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کھیتوں کی ویرانی کو دیکھ کر بادل کا چہرہ اکثر سیاہ پڑ جاتا ہے اور تب وہ بری طرح سے برس پڑتا ہے، مگر پہاڑی مقامات پر بادل کی غضب ناکی، ملائمت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں بھی وہاں بادل کی انفرادیت کو جانا نہیں جا سکتا کیونکہ اس جگہ ابرِ

کوہسار اور سیاح آپس میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں بلکہ دھند کی مہین لہر بن کر ایک دوسرے کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگتے ہیں، اس طور کہ یہ بھرت ملاپ افراد و تفریط کو یکسر مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ خصوصاً مری ایسے ہل سٹیشنوں پر تو بادل کے تنومند ابر پارے برد بار مردوں کی طرح چھڑی تھامے سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ بجلیاں ٹولیوں کی صورت میں اپنی اپنی رنگ و آواز کا جادو جگاتی چلی جاتی ہیں۔ بعض آوارہ مزاج ابر پارے بے دھڑک ان کی نقرئی آوازوں کے عقب میں بندھے چلے آتے ہیں، لیکن پہاڑوں پر بجلیاں اور ابر پارے آپس میں ٹکرا بھی جاتے ہیں اور پھر میدانوں میں آ کر ایک دوسرے کے پلو سے بندھ جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں ہر سال دو سال بعد گھر میں سات یا آٹھ کینڈل پاور کا کوئی نہ کوئی قمقمہ روشن ہو جاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو بادل ایک منجھا ہوا آرٹسٹ ہے، وہ جب موج میں آتا ہے تو آسمان کے نیلگوں کینوس پر فنونِ لطیفہ کی پوری روایت کو اپنے موقلم کی مدد سے ابھار دیتا ہے وہ کبھی تو ہیبت ناک مجمع، گول مٹول چہرہ، پھول، گرانڈیل پہاڑ یا ڈائنوسار بن بن کر مٹنے لگتا ہے تو کبھی کلاسیکی روایت کے ان عجوبوں کے ساتھ ساتھ تجریدی آرٹ کے ہر انداز کی جھلک بھی صاف دکھائی دینے لگتی ہے، شاید اسی لئے ہر فنکار کے دل میں بادل کے لئے ایک نرم گوشہ محفوظ ہے۔ بادل نہ ہو تو فن کار کے من میں فن کی مدرا کبھی اپنا اظہار ہی نہ کر سکے۔

بادل کے کئی روپ ہیں، کبھی یہ ابر کرم، ابرِ برشگال یا ابر نیساں بن جاتا ہے، تو کبھی ابر تیرہ یا ابرِ غلیظ کی صورت میں اپنا دیدار کراتا ہے، پھر یہ کہ ان کے باہمی مزاج میں فرق بھی ہے، مگر اس فرق کے باوجود وہ بادل جو ابرِ سیاہ تاب بن کر اٹھتا ہے دراصل بادل نہیں ہے کسی آفتِ سماوی کا پروانہ ہے۔ بلکہ ایک لعنت ہے جس کا مقصد دوسروں کا منہ بند کرنا ہے۔ وہ تو بس اس بات کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ اسے کسی کا جھول نظر آ جائے تا کہ وہ اس پر چھینٹے اڑا سکے۔ گویا اس کا مطمحِ نظر اہلِ زمین کو کوئی نہ کوئی سبق سکھانا ہوتا ہے۔ اصلی بادل تو ایک سائبان ہے جس کے زیرِ سایہ چیزیں محفوظ رہتی ہیں اور جب یہ برس کر کھلتا ہے تو اس میں سے دھنک ابھر آتی ہے اور پھر یوں لگتا ہے جیسے بادل نے زمین کی حالتِ زار سے باخبر رہنے کے لئے کوئی سات رنگا زینہ تیار کیا ہوتا کہ اسے ہر گھڑی کی خبر بہم پہنچتی رہے۔

بادل روئی کا گالا ہے اور سنا ہے کہ روزِ قیامت ہر چیز روئی کے گالوں میں منتقل ہو جائے گی۔ اس حوالے سے بادل روزِ حشر کی یاد بھی دلاتا ہے اور ہر ذی روح کو اس بات کا ہمہ وقت احساس بھی بخشتا ہے کہ بادل کے انجام پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ اونچی ہواؤں میں اڑنا خطر سے خالی نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی آدمی بیچارہ اس کی گرجدار آواز کو دیوتاؤں کی برہمی کا اظہار جان کر کانپتا سہمتا ہوا کھوؤں اور غاروں میں چھپ جایا کرتا تھا، ہر چند کہ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے، مگر انسان آج بھی بادل کی کڑک سن کر ماڈرن طرز کے بنے ہوئے ڈرائنگ روم یا بیڈ روم کی گپھا میں دبک جاتا ہے۔ لیکن ادھر کچھ مدت سے بادل کا برا حال ہے اس کی غیر جانبداری اور من مانی مشکوک ہو گئی ہے۔ آدمی نے ایسے حربے ایجاد کر لئے ہیں کہ وہ بادل کو اس کی مرضی کے خلاف برسنے پر مجبور کر سکتا ہے، گویا جس نے لاکھوں سال اپنی حاکمیت کو قائم رکھا تھا اب خود محکوم ہوتا جا رہا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ لیکن سدا اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا بھی تو دل گردے کا کام ہے اور ایسا دل گردہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ بجلی بادل کا اٹوٹ انگ ہے، مگر بعض اوقات مجھے بجلی ایک کیبرے ڈانسر لگتی ہے جو بادل کی بھاری پردے کے عقب سے چمک کر اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہوئی فاسٹ میوزک کے زیر و بم پر پارے کی طرح ہر طرف گھوم جاتی ہے اس کے برعکس بادل سفید یا کالے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی اچکن پہن کر آسمان کے کھلے پنڈال میں ظاہر ہوتا ہے،

پہلے جھک کر آداب بجالاتا ہے اور پھر تادیر گلے اور ستار کے سرتال کھینچ تان کر درست کرتا رہتا ہے اور پھر کہیں جا کر اس کی طبیعت ترنگ میں آتی ہے اور یوں ''میگھ ملہار'' کی رم جھم کانوں میں ٹپکنا شروع ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لئے مجھے بادل، بجلی اور ہوا ایک ہی رتھ میں سوار نظر آئے بلکہ یہ زندگی کے تین روپ ہیں اور ان تینوں کے آمیزے سے ہی زندگی کی بات بنتی ہے وگرنہ بات بگاڑنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

آج کے زمانے میں بجلی کے بغیر جینا محال ہے۔ اگر یہ تھوڑی دیر کے لئے بھی کہیں چلی جائے تو لوگ بے قابو ہو کر گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ ہر چند کہ بجلی کو جنریٹروں کے ذریعے اور تاروں کی وساطت سے گھر گھر پہنچا دیا گیا ہے۔ مگر اس کے جنگلی پن پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا ہے اور یہ آئے دن کسی نہ کسی بے قصور کی جان لے کر رہتی ہے اور اس طرح خود کو کالی دیوی کی سچی پجارن ثابت کرتی رہتی ہے۔ جبکہ سفید بادل ایک سایہ رحمت ہے جس کا مقصد انبائے روزگار کو زیادہ سے زیادہ سکھ چین مہیا کرنا ہے، بلکہ یہ تو اتنا رقیق القلب ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔ ذرا باہر نکل کر آسمان پر نظر دوڑائیے، ہوسکتا ہے کہ آپ کا یہ دیرینہ غمگسار کہیں آس پاس ہی موجود ہو۔ دیکھئے تو سہی یہ آخر آج آپ کے کون سے دکھ بٹانے آیا ہے؟

◆◆◆

معروف کالم نگار، طنز و مزاح نگار

حسین احمد شیرازی

کی طنز و مزاح پر مشتمل مضامین کی کتاب

بابو نگر

شائع ہوگئی ہے

قیمت : -/995 روپے

ملنے کا پتہ : سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

خاکہ

وزیر آغا۔ عظیم اہلِ قلم، بے مثال انسان

اظہر جاوید

میں لاہور میں وزیر آغا کا، انور سدید کے بعد سب سے پرانا جاننے والا ہوں۔ وہ مجھے دوست کا درجہ دیتے تھے۔ سرگودھا میں اور پھر یہاں لاہور میں ان سے ملاقاتوں باتوں اور یادوں کا ایک انبار ہے، بہت دنوں سے میں کوشش کر رہا تھا کہ بات کا سرا پکڑوں، ان کے بارے میں لکھوں۔ ان کی اور اپنی یادوں کو سمیٹوں، مگر مسلسل ناکام ہوتا رہا، اصل میں، بعض صدموں کے بعد دل و دماغ کو سکتہ سا ہو جاتا رہا۔ پھر وزیر آغا ہفت رنگ تھے، ان کے کس کس رخ پر بات ہو۔ ان کے علم و فضل کی سطح تک میری رسائی ناممکن ہے۔

وزیر آغا صرف شاعر، نقاد، انشائیہ نگار اور ''اوراق'' کے مدیر ہی نہیں تھے، وہ بے حد وسیع المطالعہ شخص تھے۔ ادب اور شاعری ہی نہیں، ان سے Cosmos کی بات کر لیں، سائنس کا کوئی مسئلہ چھیڑ لیں، فزکس، اکنامکس اور نفسیات، غرض کہیں بھی کورا نہیں دیتی تھی۔ یوں لگتا جیسے یہی ان کا اصل مضمون رہا ہو۔ انگریزی کی اچھی فلموں کا حوالہ آئے، تو ان کی رائے سنتے رہیے۔ رائے بھی تکنیکی اور تنقیدی نقطہ نگاہ سے۔ کرکٹ کا کہیں کوئی میچ ہو رہا ہوتا، کوئی بے خبر سوال کر بیٹھتا، تو سارا سکور بتا دیتے۔ بیٹسمین کی خوبی اور خامی کا ذکر کرتے، باؤلر کے گگلی، باؤنسر اور آف بریک کی ساری نزاکتیں بتا دیتے۔ تب تو میں باتوں میں مگن رہتا، بعد میں سوچتا، کون سا ایسا موضوع ہے، جس پر ان کی نظر نہیں اور اس کا مکمل ادراک نہیں۔

چھپن یا ستاون کی بات ہے، ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، یہ اب یاد نہیں۔ میں دسویں جماعت میں تھا۔ گھر کے ماحول کی وجہ سے ادب کا چسکا پڑ چکا تھا۔ سرگودھا سے دور چک اسّی جنوبی (بھاگٹانوالہ) میں میرے نانا کی زمین داری تھی۔ یہاں آنے سے پہلے ہم گوجرانوالہ میں تھے۔ جب میری خالاؤں کی شادیاں ہو گئیں اور ماموں برسرِ روزگار ہو گئے تو نانا نے نقل مکانی کا ارادہ کر لیا۔ نانا پہلے ہی زمینوں پر رہتے تھے۔ نانی، میری ماں اور میں..... ہم بھی گاؤں میں آ گئے۔ بھاگٹانوالہ سکول میں پڑھتا تھا۔ سرگودھا وہاں سے سولہ سترہ میل دور تھا..... مگر شہری بچے کو شہر کی للک تو رہتی ہے نا۔ سرگودھا جانا ہوا تو شاعروں ادیبوں سے ملاقات کا سلسلہ بنا۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقاتوں میں سے ایک یاد ہے..... وہ ابھی اپنے گاؤں..... وزیر کوٹ ہی میں رہتے تھے اور کبھی کبھار سرگودھا کا پھیرا لگتا تھا۔ سرگودھا کچہری بازار میں مقصود میڈیکل ہال تھا۔ مالک مقصود صاحب وضع دار اور ملنسار تھے۔ وزیر آغا وہیں آ کر بیٹھتے..... سٹور کے اوپر صاف ستھرا کمرہ تھا..... میرے استاد ممتاز الشعراء جوہر نظامی جوہر آباد (خوشاب) سے آئے ہوئے تھے۔ آغا صاحب کی سُن گُن لگی تو ان سے ملنے گئے۔ یوں یاد پڑتا ہے آغا صاحب سے یہ پہلی ملاقات نہیں تھی۔ حسبِ روایت شاعری کا دور چلا۔ میں

نے ماڑی موٹی غزل سنائی۔ وزیر آغا نے نظم (یا نظمیں) اور جوہر نظامی نے غزل سنائی۔ وقفہ یا اختتام ہوا، تو جوہر نظامی نے وزیر آغا کو مشورہ دیا، غزل بھی کہا کریں۔ یہ واقعہ ہے، وزیر آغا، ایک زمانے تک غزل نہیں کہتے تھے۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد آغا صاحب نے مجھے کہا۔ ''آپ نظم کی طرف آئیں۔ اس میں بہت امکانات ہیں اور آج کے ادب میں اس کی بہت اہمیت ہے۔''

پچاس، ساٹھ سال بیت گئے ہیں، اب سوچتا ہوں، کہاں میں اور کہاں ڈاکٹر وزیر آغا؟ وہی پرانی مثال۔ کہاں راجا بھوج، کہاں گنگوا تیلی۔! مگر ہوا یوں کہ ڈاکٹر صاحب نے غزل کہنی شروع کر دی اور میں نظم بھی لکھنے لگا۔ وزیر آغا کی غزل میں بانکپن تھا، فطرت کے اسرار و رموز کی جھلکیاں تھیں۔ جدید لہجے کا رنگ، وقت کے تقاضوں کی گھلاوٹ اور آفاق کو چھوتا ہوا خیال.....غزل کا ڈھانچا کلاسیکی مگر انداز، اظہار اور افکار میں ندرت۔ ایسا منفرد رنگ، کہ ہر شعر بولتا تھا، ''ہم کس کی بیاض سے آئے ہیں''۔ میں چوڑ ہو گیا تھا اور (گاؤں سے) سرگودھا پہنچ کر باقاعدہ صحافی بن چکا تھا۔ ہفتہ دس دن شہر میں رہنا، پھر گاؤں کھسک جاتا۔ جب ایک ہفتہ وار پرچے کا باقاعدہ ایڈیٹر ہو گیا، تو ادبی ذوق نے بھی انگڑائی لی۔ نام ہفت روزہ کا تھا ''ضربِ مجاہد'' اب اس میں ادب کا تڑکا لگا دیا۔ اس سے پہلے ایک ادھورا سا تجربہ شاعر شباب الطاف مشہدی کے ساتھ مل کر نکالے ہوئے ہفت روزہ ''خلوص'' میں کر چکا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے ملنے ان کے گاؤں گیا۔ انہوں نے اپنے عزیز اور بھری جوانی میں گم ہو جانے والے شمس آغا کا افسانہ چھپنے کیلئے دیا۔ یوں ان سے قربت بڑھنے لگی۔ عجیب اتفاق ہوا۔ شمس آغا کی شاید بہن ہمارے گاؤں کے ایک زمیندار اکمل حیدر شاہ سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ مجھ سے کافی بڑے تھے، مگر پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے انہیں شعر و ادب سے علاقہ تھا۔ میری ان سے نشست ہوتی تو اکثر ڈاکٹر وزیر آغا ہمارا موضوع رہتے۔ ان کی پراسراری گفتگو متاثر کر دیتی۔ یوں وزیر آغا میری زندگی پر چھاتے چلے گئے۔

سرگودھا میں ایک صاحب تھے غلام حسین قیصر، وہ انکم ٹیکس کے وکیل تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور خود کو علاّمہ اقبال کا بھانجہ بتاتے تھے۔ میرے ایسے نوجوان کو اُن کی کسی حیثیت پر کوئی شک نہیں تھا۔ شہر کے چھڑے شام کو مفت کی وِسکی پینے ان کے ہاں جاتے اور شعر سنانے کا جھوٹ موٹ اصرار کرتے۔ ان دنوں قیصر صاحب نے ایک غزل کہی تھی۔

زندگی کے اصول ہوتے ہیں　　بے اصول ہی ملول ہوتے ہیں

جوہر نظامی کی تربیت نے اس وقت بھی کچھ کچھ شعور دے رکھا تھا۔ میں ڈاکٹر وزیر آغا سے ملنے ان کے گاؤں گیا تو انہیں شہر کی تازہ خبروں میں یہ غزل بھی سنائی۔ مطلع کے علاوہ اس وقت ایک دو شعر اور بھی یاد تھے۔ وزیر آغا نے بے وزن مطلع سنا تو فی البدیہہ کہا۔

شعر کی پُر فریب دنیا میں　　چند ایسے بھی فُول ہوتے ہیں

انہی دنوں سرگودھا میں ایک مشاعرہ ہوا۔ منتظمین کی درخواست پر آغا صاحب نے لاہور سے شاد امرتسری اور منیر نیازی کو مدعو کیا۔ انہوں نے گاؤں (وزیر کوٹ) ہی میں ٹھہرنا تھا۔ میری ان صاحبان سے بھی نیاز مندی تھی۔ ظاہر ہے انہوں نے شراب کے بغیر شام اور مشاعرہ کیسے گزارنا تھا۔ پتا نہیں آغا صاحب نے کیسے انتظام کیا۔ وزیر آغا کے گھر میں شراب تو کیا، شرابی بھی قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ انہوں نے وضع داری اور مہمان نوازی میں یہ برداشت کر لیا۔ مجھے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''اظہر جاوید صاحب! (عمر بھر انہوں نے یہی انداز تخاطب رکھا) آپ مہربانی کریں، انہی سنبھالنے کی ذمہ داری لے لیں۔ دونوں آپ سے مانوس ہیں۔ آپ بھٹکنے نہیں دیں گے''۔

خیر، وہ مرحلہ طے ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد آغا صاحب نے لطیفہ سنایا۔ وزیر کوٹ میں ایکسائز والوں کا چھاپہ پڑ گیا۔ میں بہت

حیران (اور پریشان) ہوا۔ بھید کھلا، جس کا مے سے شاد امرتسری اور منیر نیازی کے لئے شراب منگوائی تھی، اس نے باقاعدہ شراب بیچنی شروع کر دی اور مال ''دور دور'' تک جانے لگا تھا۔

وزیر آغا صاحب نے جب پی ایچ ڈی کی تو پھسلتی پھسلاتی یہ خبر گاؤں میں بھی پہنچی۔ ان بے چاروں کو کیا پتا۔ پی ایچ ڈی کیا ہوتا ہے (ویسے ابھی تک ہمارے بڑے مہذب شہروں کے بیشتر صاحب علم کو بھی پتا نہیں چلا، پی ایچ ڈی کیا ہوتا ہے، کیا کرایا، تھیسس مل جائے تو کیا قدر اور خبر) (گاؤں والے تو آغا جی کو اور بیگم صاحبہ کو یہی مبارکباد دینے آتے رہے کہ آغا جی ڈاکٹر بن گئے ہیں۔

ایک اور لطیفہ ہوا۔ وزیر آغا، گاؤں والوں کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کی ادویات پاس رکھتے۔ سر درد، کھانسی، زکام، پیٹ کی خرابی۔ ایک دن ایک عورت آئی۔ گود میں بچہ تھا۔ ''آغا جی، اسے تاپ چڑھا ہے۔ کوئی دوا دے دیں''۔ وزیر آغا نے ایک دو گولیاں (ٹیبلٹس) دیں۔ وہ عورت ملتجیانہ آواز میں بولی..... نہ نہ، آغا جی..... ہن تسی پکے ڈاکٹر ہو گئے ہو، کاکے نوں سوئی (انجکشن) لا دیو''۔

وزیر آغا کم آمیز تھے، مگر جہاں تعلق ہوتا، وہاں شگفتہ مزاجی بھی دکھاتے، ایک چھوٹا سا جملہ اچھالتے اور محفل چہک اٹھتی۔ جب ''تخلیق'' کا دفتر میکلیگن روڈ پر تھا، اور ڈاکٹر صاحب جب سرگودھا سے آتے تو بلا ناغہ اپنی رہائش گاہ پر جانے سے پہلے ''تخلیق'' کے دفتر میں آتے۔ ہنستے ہنستے کہتے، ''آپ کے شہر آیا ہوں۔ اجازت لینی ہے، شہر میں داخل ہو سکتا ہوں''۔ یہ ان کی بے پناہ محبت اور اخلاص کا معمولی سا اشارہ ہے۔ جب تک ''اوراق'' چھپتا رہا (ابتداء کا کچھ زمانہ نکال کر) وہ مجھے باقاعدہ اس میں شامل کرتے رہے۔ کبھی کبھی، اچانک کہتے۔ ''اظہر صاحب، بڑا مسئلہ ہے۔ ''اوراق'' کیسے چھپے گا..... اور بکے گا کیسے؟ ان کے گمبھیر انداز سے شروع شروع میں، میں بھی حیران ہوا، ''کیوں خیر ہے، آغا صاحب.....؟''..... ''آپ نے اپنی کوئی نظم ہی نہیں دی۔'' تب میں بھی کھلکھلا اٹھتا۔ پھر وہ مجھے اہتمام سے چھاپتے اور مقام کا بہتر تعین کرتے۔ آغا صاحب لاہور آتے اور دوسرے ہی دن کہتے ''اظہر صاحب کوئی فلم ہی دکھا دیں۔'' ان دنوں سنیماؤں میں اچھی اچھی انگریزی فلمیں لگتی تھیں۔ ہم دونوں ہوتے۔ کبھی کبھی مرزا ریاض یا غلام الثقلین نقوی ساتھ ہو جاتے۔ کم از کم میرے ساتھ انہوں نے کبھی اردو، پنجابی کی فلم نہیں دیکھی تھی۔

ان کے مزاج میں کمال کا تحمل اور بردباری تھی۔ الجھنا، تکرار کرنا یا بے معنی بحث کرنا ان کی فطرت ہی نہیں تھی۔ پریشان ہوتے تھے، آخر انسان تھے۔ مگر کسی پر کھلنے نہیں دیتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ ان کی زمینوں کے سلسلے میں کچھ مقدمے بازی ہو گئی۔ دوسری طرف صرف غلط فہمی تھی، جو دور نہ ہو سکی اور اس سے پہلے وزیر آغا نے بھی جواب دعویٰ داخل کرا دیا۔ ایک تاریخ پڑی، وکیل نے بھگتائی۔ دوسری بار آغا صاحب نے تھوڑی سی دلچسپی لی۔ وکیل کو بلوایا۔ اس سے مشورہ ہی نہیں کیا، کچھ اپنی رائے بھی دی۔ پھر عجیب تبدیلی ہوئی۔ ایک دن، یونہی بیٹھے بٹھائے، انہیں خیال آیا۔ ''میں تو اس میں کھبتا جا رہا ہوں۔ یہی حال رہا، تو سارا دھیان اِدھر ہی ہو جائے گا''۔ انہوں نے بانداز دگر وکیل کو بلوایا اور اسے کہا۔ ''مقدمہ واپس لے لیں'' وکیل ہکا بکا، یہ کیا ہو گیا۔ ہمارا موقف تو بہت مضبوط ہے۔ وزیر آغا صاحب نے کہا ''بھائی، میں اس مقدمے بازی میں اتنی دلچسپی لینے لگا ہوں کہ پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ بس، بہت ہو گئی''۔

ایک بار کشور ناہید نے اپنے گھر پر وزیر آغا کے تفصیلی انٹرویو کا اہتمام کیا، انٹرویو ریکارڈ ہونا تھا۔ سوال کرنے والوں میں کشور ناہید، یوسف کامران اور جاوید شاہین شامل تھے۔ جاوید شاہین نے باقاعدہ سوچے سمجھے انداز میں وزیر آغا کی شاعری میں مین میخ نکالنی شروع کر

دی۔آغا صاحب نے دیر تک تحمل سے کام لیا۔مناسب جواب دیتے رہے، جب انہیں یقین ہو گیا، جاوید شاہین کے عزائم کچھ اور ہیں، تو وہ اٹھ گئے۔اگلے دن رواروی میں انہوں نے عبدالعزیز خالد سے بات کی۔ادھر وزیر آغا، ان کے دفتر سے نکلے، خالد صاحب نے پہلے جمیلہ ہاشمی کو فون کر کے یہ ''سکینڈل'' سنایا پھر کشور ناہید کو بتایا، ''وزیر آغا کا خیال ہے، تم نے جان بوجھ کر یہ کھڑاک رچایا ہے۔'' کشور بھی تپ گئی۔ تیسرے دن ادبی حلقوں میں وزیر آغا، کشور ناہید کی لڑائی موضوع بنی ہوئی تھی۔اب تھوڑی سی تعلّی .....ان دنوں تک ابھی میں ادبی حلقوں سے کٹ کر اور ہٹ کر گوشہ نشین نہیں ہوا تھا۔''تخلیق'' اور ''امروز'' کی وجہ سے میرا بڑا بھرم تھا۔(کہنا تو دبدبہ چاہیے تھا) وزیر آغا صاحب سے بات ہوئی۔میں نے کہا ''دیکھیں، میں یوں کرتا ہوں، کشور اور آپ کو ایک جگہ بٹھا دیتا ہوں۔دونوں بھڑاس نکال لیں''۔وزیر آغا، لفظ بھڑاس پر تھوڑے سے جز بز ہوئے۔میں نے کہا۔''آپ کو پتا ہے، گفتگو میں میری ڈکشن ایسی ہی ہوتی ہے۔'' میں نے کشور کو فون کیا یا شاید ملنے گیا۔اپنی ''مفروضہ رسوائیوں'' کے باوجود وہ بہت اچھی اور مروّت والی خاتون ہے۔مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے میری بات کبھی ٹالی ہو۔میں اور وزیر آغا گئے، کشور کو لیا، اور شیزان میں آ بیٹھے۔میں نے کہا۔''آپ بے تکلفی سے ''تبادلہ خیالات'' کریں، میں کچھ دیر کیلئے کھسک جاتا ہوں۔'' دونوں نے پرزور طریقے سے مجھے روکا۔

کشور نے تو ہاتھ پکڑ کر کہا ''اینویں نہ کر، توُں ایتھے ہی رہویں گا''

کوئی گلہ، کوئی شکوہ، کچھ بھی نہ ہوا۔حیرت انگیز طور پر دونوں خوش خوش نیچے اترے۔میری طرف دونوں مہربان نظروں سے دیکھتے رہے۔آغا جی تو چھاؤنی چلے گئے۔میں اور کشور پاک ٹی ہاؤس آ گئے۔کشور نے بڑی بے صبری سے پیار بھرے انداز میں یوسف کامران کو کہا ''اظہر نے، مجھے اور وزیر آغا کو شیزان میں بڑی اچھی چائے پلائی ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کی وضع داری اور اپنائیت کا یہ عالم تھا، جب وہ لاہور آ بسے تو میں نے انہیں کہا۔''آپ نے 'اوراق'' کا دفتر ختم کر دیا ہے۔یوں کیجئے کہ ایک عید ملن دعوت کا اہتمام کیا کریں۔واہ واہ''.....اب بھی سوچتا ہوں، تو ان کی دمکتی ہوئی مسکراہٹ میری نظروں میں گھوم جاتی ہے۔انہوں نے یوں قبول کیا۔جیسے (خدانخواستہ) میں نے حکم دے دیا ہو۔کہنے لگے ''فہرست آپ بنالیں''، تیس چالیس لوگوں کو فورٹریس سٹیڈیم کے بہترین ریستوران میں عید کے دوسرے دن کھانا کھلایا اور گپ شپ ہونے لگی۔یہ نہایت منفرد اور دلچسپ محفلیں تھیں۔ایسے ایسے شگوفے چھوٹتے، فقرے بازی ہوتی اور لطیفے تخلیق ہوتے کہ سبحان اللہ، کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔پھر میں نے ہی محسوس کیا، کہیں کہیں منافقت پیدا ہونے لگی ہے۔میں نے پھر اپنی گذارش کی۔وزیر آغا نے پھر تعمیل کی اور یہ بے حد اہم تقریب ختم ہو گئی۔ بعد میں جب کبھی ذکر آیا، انہوں نے کہا، ''آپ ہی نے شروع کروائی تھی آپ ہی نے بند کروادی'' میں بڑبڑ کر کے رہ جاتا، کہ انہیں کیا، بلکہ کیا کیا بتاؤں''۔

میرے لئے یہ بھی فخر کی بات ہے کہ وزیر آغا نے پنجابی شاعری ''تخلیق'' کی وجہ سے اور میرے بار بار کہنے پر شروع کی تھی۔یہ بات ریکارڈ پر ہے۔انہوں نے اعتراف کیا اور اپنی پنجابی شاعری کی پہلی کتاب میرے نام معنون کی۔یادوں کا سیلاب تھپیڑے مار رہا ہے۔ بڑی مشکل سے بند باندھ رہا ہوں، یوں لگتا ہے، لکھتا جاؤں، لکھتا جاؤں، تو پوری کتاب بن جائے۔رب خیر کرے، یہ کتاب بنا کر ہی چھوڑوں گا۔رب خیر کرے۔ (ڈاکٹر وزیر آغا کی سالگرہ پر خصوصی مضمون۔پ 18 مئی 1922ء)

◆◆◆

اپنے ملک صاحب

غلام نبی اعوان

جس دن ان کا ٹیلیفون آ جائے میری گنگناہٹ میں اضافہ ہوجاتا ہے، سرشاری کی کیفیت فزوں ہوجاتی ہے۔'' باتھ روم سنگنگ'' کا ٹمپواونچا ہوجاتا ہے۔

میرے پیا گئے رنگون۔ وہاں سے کیا ہے ٹیلیفون.....

اس دن میرے بچے بھی آپس میں سرگوشیاں کرتے پائے جاتے ہیں۔'' لگتا ہے ملک صاحب کا ٹیلیفون آیا ہے''۔ میرے مغموم لمحات میں طمانیت کے چند لمحوں کو میرے بچے غنیمت سمجھتے ہیں۔ یہ ٹیلیفون میرے اس محبوب کا ہوتا ہے جسے میرے بچوں نے تو کجا خود میں نے بھی نہیں دیکھا۔ میری محبت اس گنوار اور جانگلو گڈریئے کی محبت جیسی ہے، جسے موسیٰ نے محبت کے جاہلانہ اظہار پر ٹوکنا چاہا تو ہائف سے اسے ڈانٹ پڑ گئی کہ'' خبردار محبت کے جس اعلیٰ مقام پر یہ ان پڑھ چرواہا اس وقت فائز ہے، وہاں تک تمہارا علم وفضل اور تمہاری پیغمبری بھی نہیں پہنچ سکتی''۔ ملک صاحب ٹیلیفون پر جب مجھے'' عالیجاہ'' کہتے ہیں تو میرا غرور آسمان کے چودھویں طبق سے جا ٹکراتا ہے۔ پھر نہ پوچھئے کہ کتنے دن تک تفاخر وتکبر کی لپٹیں میرے مشامِ جاں کو معطر رکھتی ہیں۔ اس موقعے پر اپنے اردگرد پھیلے انسان مجھے کیڑے مکوڑے سے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک دن اپنے کامے مسلی کو چوہدری نے پیار سے کہہ دیا تھا'' جا اوئے کوڑھیا''۔ خوشی مرگ کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے دو دن تک کھانا نہ کھایا۔ اک فاخرانہ اور فاتحانہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی اور بیوی کو بار بار بتاتا'' اوئے نیک بخت آج تو چوہدری صاحب نے مجھے اپنے پاس بلا کر پیار سے کوڑھا کہا ہے''۔ بیوی بچاری عاملوں ویدوں کو اکٹھا کرتی رہی۔ جس دن میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ (بقول ڈاکٹر وزیر آغا'' فلسفیانہ مسکان زیرِلب'') اور آنکھوں میں رجائیت بھری چمک دیکھتے ہیں تو، بچے سمجھ جاتے ہیں کہ آج پھر ملک صاحب کی طرف سے ابا حضور کو کوئی مسند عطا ہوئی ہے۔ اس دن ملک صاحب نے محبت بھرے لہجے میں مجھے'' عالیجاہ'' کے لفظ سے بہ اعادۂ مرکب خطاب کیا ہوتا ہے اور میں کیفِ عید سے گذر رہا ہوتا ہوں۔ اپنی محبت کی بے بسی اور سرشاری میں لت پت کیفیت پر نظر کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ آخری عمر میں میں نے یہ کیا روگ پال لیا کہ ملک صاحب سے دل کا پیچہ لڑا بیٹھا۔ ملک صاحب نے مروّت کیا دکھائی کہ میں اپنا دل ان سے نتھی کر بیٹھا۔

وہ ہنس کے ملے ہم سے، ہم پیار سمجھ بیٹھے

لیکن جب میں اپنے دائیں بائیں نظر ڈالتا ہوں تو بڑے بڑے جیّد مجھے ملک صاحب کی زلف کے اسیر نظر آتے ہیں اور ان کے دامِ محبت میں زخمی پرندے کی طرح پھڑکتے اور تڑپتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ ان کشتگانِ تیغ ستم میں ادبی دنیا کے بڑے بڑے رستم و سہراب اور لات ومنات اور ھبل وعزیٰ اوندھے منہ گرے پڑے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، حمید اختر، علی

سفیان آفاقی، مجیب الرحمٰن شامی، خواجہ محمد زکریا، امجد اسلام امجد منشاء یاد، اے حمید، اظہر جاوید، مسکین حجازی، شعیب بن عزیز، طارق اسمٰعیل ساگر اور ع س مسلم جیسے جغادری لکھاری ملک صاحب کے سیرت و کردار کے اسیر ہیں۔ یارو کوئی اندھیر سا اندھیر ہے کہ جمیل آذر اور انور سدید جیسے لوگوں کی سانسوں میں ملک مقبول، ملک مقبول چلتا ہے۔ انور سدید پچاسیویں سال کو ہاتھ ڈال چکے ہیں۔ ہاتھ میں لاٹھی، سانس جانو توڈھنکنی چل رہی ہے۔ عرق النساء میں جوڑ جوڑ دہائی دیتا ہے۔ حال پوچھو تو اپنی ہزاروں بیماریوں کی گنتی میں دم پھول جاتا ہے۔ مگر مقبول اکیڈیمی جا کر ملک صاحب سے ملنا ہو تو پھر بناؤ سنگھار اور چاہت کے ساز و سامان دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال جمیل آذر کا ہے۔ جسم تو چکلالہ کے بنگلے میں، مگر دل چوک اردو بازار کے آس پاس کہیں منڈلاتا ہوا۔ کیسے کیسے بابے دیکھے ہیں جو ملک مقبول کو اپنا دل دے بیٹھے ہیں۔ میں تو یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہوں کہ ملک صاحب کے پاس یقیناً گیدڑ سنگھی ہے اور یہ گیدڑ سنگھی کوئی بڑی دانشور، ادیب، شاعر، محقق،، نقاد اور افسانہ نگار قسم کی مخلوق ہے کیونکہ اس کا لذیذ شکار صرف طبقہ اہلِ علم و قلم ہے۔ اتنے زیادہ لوگ تو میں نے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی شادی میں بھی نہیں دیکھے جتنے اہل ہنر میں نے ملک صاحب کی محبت میں مبتلا پائے۔ مجھے کبھی لاہور جا کر ملک صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا تو گیدڑ سنگھی کی زیارت کروانے کی التجا ضرور کروں گا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

یوں تو ملک صاحب کسرِ نفسی کی انتہا کر دیتے ہیں اور خود کو اُس مٹی سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں گلابوں کے پودے لگائے گئے ہوں، مگر میں جانتا ہوں کہ نصف صدی سے زیادہ اہلیانِ حرف و خیال کی محفلوں میں گذارنے والے ملک مقبول انداز ہائے دل ربائی دلبری کے تمام پیچ داؤ سے واقف ہو گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ کہولت زدہ اور ضعف رسیدہ اہلِ دل کھانستے بعد میں ہیں پہلے ملک مقبول کا نام لیتے ہیں اور نوجوان اہلِ ہنر ہر وقت انہیں دل کے اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر ہر طرف ''جیوے جیوے ملک جیوے'' کے نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ ملک صاحب کی عزت کرنے والا ہر ادیب یہ سمجھتا ہے کہ ملک جی صرف اس کے ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ ملک مقبول تو مہر و محبت کا اک ایسا زمزم ہے جہاں سے ہر تشنہ جی بھر کے سیراب ہوتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ وہ صدق و صفا کے اس قلزم کا واحد مالک ہے۔ ملک صاحب اپنی محبتیں اور عنائتیں ہر خور دو کلاں میں برابر برابر تقسیم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہر شخص ان پر حقِ ملکیت پر میرا لاہور کے ایک بڑے ادیب سے عنقریب ''ملاکھڑہ'' ہونے والا ہے۔ یہ ادیب شاعر ہے، بہت بڑا براڈکاسٹر اور ٹیلی کاسٹر ہے۔ سریلی آواز کا مالک ہے۔ میں ملک صاحب سے اپنی محبت کا تذکرہ اس ذاتِ شریف سے کر بیٹھا اور وہ اڑ گیا کہ ''تم دور رہتے ہو۔ میں لاہور میں رہتا ہوں۔ ملک صاحب میرے ساتھ زیادہ انس رکھتے ہیں اور اس انس و الفت کا اظہار وہ اکثر مجھ سے کرتے رہتے ہیں''۔ بس پھر کیا تھا میں ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اور اس ضمن میں اسے چیلنج دے ڈالا۔ بس اب میرے لاہور جانے کی دیر ہے۔ اس میرا ''عشقیہ دنگل'' دنیا دیکھے گی۔ مگر اس جھگڑے میں میں مقبول صاحب کو منصف ہرگز نہیں بناؤں گا۔ ان کا کیا اعتبار کہ دونوں رقیبوں میں ڈھیر ساری شفقت برابر برابر تقسیم کر کے میچ ڈرا کروا دیں۔ آپ سب لوگ اس معروف براڈکاسٹر اور شاعرِ خوش خصال سے واقف ہیں۔ میری مراد اعزاز احمد آذر سے ہے۔ وہ شخص بولتا ہے تو ساز سے بج اٹھتے ہیں۔

خدا جانے یہ ملک صاحب کا مطالعہ ہے یا نامرادانِ عشق کی محبتوں کا اثر ہے کہ ملک صاحب میں بہت سے خصائل اردو ادب کے محبوب جیسے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ایک ہیں اور ان کے طلب گار ہزاروں۔ اور ہر طلب گار مجی مجی پکار کر انہیں اپنی طرف راغب اور مائل کرنے میں جتا ہوا ہے اور ملک صاحب اک اچھے ساقی کی طرح جرعہ جرعہ تقسیم کرتے ہوئے سب کو التفات و کرم سے فیضیاب کرتے رہتے ہیں۔

اندھے کے ہاتھ بٹیرا لگنے کا محاورہ سُنتے سُنتے میرے کان پک گئے تھے مگر کبھی کوئی توضیح سمجھ نہ آ سکی۔ تا آنکہ ملک مقبول صاحب

کی دوستی دفعتاً میرے ہاتھ آ لگی اور میں دنوں تک اِس اچانک خوشی پر بولایا بولایا اور بوکھلایا بوکھلایا پھرا کیا، تو مذکورہ بالا محاورہ اپنے مکمل تناظر کے ساتھ میری کھوپڑی میں آ گیا۔ اِس اجمال کی تفصیل قابلِ توجہ ہے۔ بچپن سے اہلِ علم و ہنر کی چلمیں بھرنے اور جوتے سیدھے کرنے کا شوق تھا۔ اِس شوق کی ابتداء 58ء سے ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ شوق بھی جوان ہوتا چلا گیا۔ پھر رزق کا سلسلہ اک ایسے پیشے سے وابستہ ہوا کہ تقریباً اٹھائیس سال تک بستر میرے کندھے پر رہا۔ قریہ قریہ پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا مگر وہ جوادب کے دھیمے سے چراغ نوعمری میں دل و دماغ کے نہاں خانوں میں روشن ہوئے تھے، اُن کی لو کی حفاظت میں نے جی جان سے کی۔ پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں کبھی کبھی تو ایسا لگا کہ ابھی اندھیرا ہوا اگرچہ یہ روشنی تو میں بچالایا مگر اِس عرصے میں یارانِ تیز گام نے مہمل کو جالیا اور میں صرف دور جاتی جرسِ کارواں ہی سُنتا رہا۔ جب ذرا ستانے کا وقت آیا تو بچپن کی اک پُرانی آرزو بھیس بدل کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ آرزو تھی بستر پر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ادبی کتابیں۔ بس اک ذرا گردن جھکالی، دیکھ لی والی کیفیت۔ جب چاہو لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھاؤ۔ کتاب اُٹھاؤ اور جہانِ علم میں کھو جاؤ۔ البتہ اک تبدیلی یہ ہوئی کہ اگر ارد گرد بکھری ہوئی کتابیں مصنفین کی دستخط شدہ ہوں تو پڑھنے کا مزا دوآتشہ ہو جائے۔ چنانچہ کمر کس لی اور کچھ شناسا تخلیق کاروں کو خطوط لکھے۔ گرچہ نتیجہ مایوس کن رہا لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے۔ میں کسی اسٹال پر کتابیں دیکھ رہا تھا کہ ''سفر جاری ہے'' پر نظر پڑی۔ ارے یہ کون ہے جس کی تمام ادیب متفقہ علیہ اور قطار اندر قطار تعریف کر رہے ہیں ورنہ ہمارے ادباء اور دینی علماء کبھی اِس طرح کے ''اجماعِ اُمت'' پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ میں نے ملک صاحب کو خط لکھا۔ مجھے ترنت جواب میں نہ صرف دستخط شدہ ''سفر جاری ہے'' ملی بلکہ خوبصورت دینی اور طبی کتب کا گراں بہا تحفہ بھی ملا۔ وہ دِن اور آج کا دن میرے بستر پر ملک صاحب کی عنایات بصورتِ کتب اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ درمیان میں صرف میرے لیٹنے کی جگہ بنتی ہے۔ بچوں کو ہدایت ہے کہ صفائی کرتے ہوئے میرے بستر کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ تو یہ ہیں اپنے ملک صاحب جن کی دوستی میرے ہاتھ ایسے لگی جیسے اندھے کے ہاتھ بٹیرا۔

◆◆◆

مشہور افسانہ نگار **عطیہ سیّد** کی افسانوی کتاب

دشت، بارش اور رات

شائع ہوگئی ہے

قیمت -/300 روپے

ملنے کا پتہ: پبلشر دستاویز، لاہور (فون: 0333-4344716)

یادیں

بمبے ریٹرن

عزیز میرٹھی

تقسیم ہند کے بعد تحسین پکچرز کے مالک شیخ تحسین کے دوست اور اداکار اوم پرکاش کے بھائی بخشی جنگ بہادر لاہور تشریف لائے تو ان کے ایک دوست منور ایچ قاسم ایم اے بھی ساتھ چپکے چلے آئے۔ منور صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کا یونیورسٹی بھی کچھ نہیں بگاڑتی۔ جیسے جاتے ہیں ویسے ہی صرف ڈگری کا الزام لے کر گھر کو لوٹ آتے ہیں۔ یوں بھی فنون لطیفہ کا ڈگریوں سے کچھ زیادہ تعلق نہیں۔ اگرچہ تعلیم کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن جہاں تک ہنرمندی کا تعلق ہے، اس میں تعلیم کی بجائے سچی لگن، مسلسل ریاضت، انسانی نفسیات اور جذبات و احساسات سے آگاہی، زندگی کے نشیب و فراز اور ٹھوس حقائق کا گہرا مشاہدہ، ذاتی تجربہ فن شناسی، وجدان کی دولت اور فطری صلاحیت زیادہ اہم ہیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات، بھارت اور پاکستان دونوں ممالک میں فلمی دنیا سے ناکام ہو کر لوٹے ہیں۔ جبکہ ہندوستان کے مایہ ناز ہدایت کار محبوب اعظم اور شانتا رام کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی۔ پاکستان میں میرا ہونہار شاگرد بہت سی سپرہٹ فلموں کا مشہور و معروف ہدایت کار اقبال کشمیری بالکل ان پڑھ ہے۔ لاتعداد فلموں کا کامیاب ہدایتکار حیدر چودھری بھی ''علموں بس کریں او یار، سانوں اک الف درکار'' کی منہ بولتی تصویر تھا۔ منور ایچ قاسم صاحب ہندوستان سے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر کے ایک سادہ لوح فلمساز کا بیڑہ غرق کر چکے تھے۔ اس کے بعد انہیں کسی نے گھاس نہ ڈالی تو انہوں نے جنگ بہادر کا دامنِ عافیت تھام کر پاکستان کی راہ لی۔ لیکن جسے سمندر سے دو بوند پانی میسر نہ آ سکا اسے تالاب سے کیا ہاتھ آتا۔ البتہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ بخشی جنگ بہادر نے اپنے دوست شیخ تحسین اور ہیروئینوں کے شیدائی ایک نوجوان ٹرانسپورٹر آصف خان کے اشتراک سے فلم بنانے کا بیڑہ اٹھایا اور قاسم صاحب کو فلم کی ہدایت کاری سونپ کر کہانی کی تلاش شروع کر دی۔

ہدایت کار موصوف چونکہ انڈیا سے تشریف لائے تھے اس لئے ان کا خالی دماغ ہلکا ہونے کی وجہ سے ساتویں آسمان پر تھا۔ لاہور کے کئی رائٹروں سے کہانیاں سنیں، مگر کوئی ان کے معیار پر پوری نہ اُتری۔ آخر کار قرعہ میرے نام نکلا۔ اس وقت تک میری تین کہانیاں ''کندن''، ''آخری داؤ''، اور ''غیرت'' نمائش کیلئے پیش کی جا چکی تھیں۔ ''کندن'' بری طرح ناکام ہوئی۔ ''آخری داؤ'' قدرے بہتر ثابت ہوئی لیکن بدقسمتی سے ساتویں ہفتے میں حکومت نے قبضہ کر کے اس کے فلمسازوں کو منشیات کی سمگلنگ کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ البتہ تیسری فلم ''غیرت'' نے صبیحہ خانم کی جان دار اداکاری اور برجستہ مکالموں کی وجہ سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ فلمی دنیا میں تمام دستور کے

مطابق تازہ ترین کامیابی یا ناکامی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مثلاً کئی کامیاب فلموں کے ہدایت کار، اداکار، موسیقار اور مصنف کی تازہ ترین فلم ناکام ہو جائے تو اس کی گذشتہ کامیابیوں سے صرف نظر کر کے اس کی مارکیٹ ویلیو گرا دی جاتی ہے اور کسی ناکام فنکار کی نئی فلم باکس آفس پر ہٹ ہو جائے۔ تو اس کی گذشتہ ناکامیوں کو فراموش کر کے کامیاب فنکار قرار دے دیا جاتا ہے۔ میں ان دنوں آغا جی اے گل کے دفتر ایورنیو پکچرز میں بطور پبلسٹی انچارج اور نمائندہ خصوصی ملازم تھا اور ان کی اجازت سے فارغ اوقات میں کہانیاں لکھنے کا شوق پورا کرتا تھا۔ لہٰذا تحسین صاحب نے چپراسی بھیج کر مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور کوئی اچھی سی سوشل کہانی سنانے کے لئے کہا۔ میں نے عرض کی۔

''جناب سہاگن وہ جسے پیا من چاہے۔ اچھی کہانی کا معیار اور کسوٹی تو آپ کی پسند ہے''۔

اس پر ایم اے پاس ہدایت کار معنی خیز انداز میں مسکرا کر گویا ہوئے۔

''ہوں۔ لڑکا ہوشیار لگتا ہے''۔

''ہوشیار ہی نہیں قاسم صاحب آپ اس کی فلم ''غیرت'' دیکھیے''۔

''خیر وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ ہمیں کیا دیتے ہیں''۔

میں نے انہیں ''وحشی'' کے نام سے ایک کہانی سنائی۔ جسے اور تو سب نے بے حد پسند کیا۔ لیکن ''عظیم ہدایت کار'' نے قدرے ہچکچاہٹ اور چونکہ، چنانچہ کی تکرار کے بعد اس خیال سے کہ ہر کہانی کو ٹھکرانے کے باعث کہیں خود میں ہی نہ ٹھکرا دیا جاؤں۔ حامی بھر لی مگر ساتھ حکم صادر فرمایا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر آپ سب کو سبجیکٹ پسند ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن لڑکے کو سکرین پلے کی بالکل سینس (Sense) نہیں۔ منظر نامہ اسے میرے ساتھ بیٹھ کر میرے مشوروں کی روشنی میں دوبارہ تحریر کرنا ہوگا''۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں تو آج بھی خود کو طالب علم سمجھتا ہوں۔ وہ تو ابتداء تھی۔ میں نے کہا ''بشر و چشم، مزید کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا''۔ ظالم انسان کی رگوں میں خون منجمد کر دینے والی شدید سردی کے موسم میں قاسم مجھے چھ بجے شام کوٹھی پر بلا لیتا۔ سکرپٹ سامنے رکھ کر..... شراب نوشی میں مصروف ہو جاتا۔ دو چار سین لکھانے کے بعد سٹوری، ڈائیلاگ اور سکرین پلے پر مجھے نہایت خشک لیکچر پلاتا اور خود وسکی کے جام پر جام چڑھائے جاتا۔ مالِ مفت دل بے رحم۔ اس کے بے مغز طویل لیکچر سے میرا سر پھٹنے اور دل گھٹنے لگتا۔ ساتھ ہی وہ شامی کباب اور چرغے پر بڑی بے دردی سے ہاتھ صاف کرتا۔ اور مجھ بھوکے پیاسے مظلوم کا حال پوچھے بغیر آدھی رات گئے تک مجھ پر مشقِ ستم جاری رکھتا اور آخر کار نشے میں دھت ہو کر صوفے پر ہی مثانہ ہلکا کرتا اور اوندھا لیٹ کر زور زور سے خراٹے لینے لگتا۔ اف کسی عذاب کی راتیں تھیں وہ آج بھی یاد کرتا ہوں تو روح کانپ اٹھتی ہے۔

''قہر درویش بر جان درویش'' کے مصداق میں خون کے گھونٹ پیتا اسے سوتا چھوڑ کر اپنے گھر کو روانہ ہو جاتا۔ صبح آٹھ بجے مجھے دفتر بھی جانا ہوتا تھا۔ ایک مہینہ دس دن بعد اس بمبئے ریٹرن ہدایتکار نے فلمسازوں کو شوٹنگ سکرپٹ مکمل ہونے کی خوشخبری سنائی اور شوٹنگ کی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دیں۔

ایک روز شیخ صاحب نے معاہدے کے مطابق میری بقایا رقم کا چیک دے کر کہا۔

''میر ٹھی صاحب آپ کی کہانی کا حساب بیباک ہوا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ جب تک فلم مکمّل نہ ہو جائے۔ آپ شوٹنگ بھی

باقاعدگی سے اٹینڈ کریں اور دیکھیں کہ کام آپ کی سوچ کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس ذمہ داری کے لئے ہم آپ کو ایک سو روپیہ فی شفٹ کے حساب سے مزید ادا کریں گے۔ یہ ہم تینوں نے اس لئے کیا ہے۔ کہ جب آپ ہمیں کہانی سنا رہے تھے۔ تو ہم کہانی تو سن ہی رہے تھے۔ ذہن کے پردے پر ایک مکمل فلم چلتے ہوئے دیکھ رہے تھے''۔ مجھے ان کی اس تعریف اور اعتماد سے بے حد مسرّت ہوئی اور بخوشی حامی بھر لی۔

فلم کی کاسٹ میں انڈین سکرین کی چنچل اداکارہ ریحانہ، ہدایتکار نذیر کا بیٹا افضل نذیر، ہمالیہ والا، رقاصہ رخشی اور کامیڈین ظریف شامل تھے۔ نغمہ نگار احمد راہی اور موسیقار طفیل فاروقی تھے۔ قاسم صاحب نے فلم کے دو گانے تو آؤٹ ڈور چھانگا مانگا کے جنگل میں ہیرو ہیروئن پر پکچرائز کر لئے۔ مگر فلم میں حقیقت کا روپ رنگ بھرنے کیلئے سٹوڈیو میں کلب کا سیٹ لگانے کی بجائے اصل لوکیشن پر شوٹنگ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس زمانے میں ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ ہدایت کار کا یہ اقدام مجھے بھی بہت پسند آیا۔ اور میں نے اس کے اس فیصلہ کی دل کھول کر داد دی۔ لہٰذا مال روڈ پر ریگل سنیما کے قریب واقع ایک ہوٹل کے اینگلو انڈین منیجر مسٹر پال سے بحساب تین سو روپے روزانہ، رات بارہ بجے سے لے کر صبح چھ بجے تک شوٹنگ کرنے کا ایگریمنٹ کر لیا۔ داستان تو خاصی طویل ہے۔ لیکن قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے صرف ایک واقعے کا ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ہوٹل کو نائٹ کلب کے انداز میں ڈیکوریٹ کر دیا گیا تھا۔ سین میں استعمال کرنے کیلئے روپے کے برابر گتے کے کئی ہزار گول ٹھپے بنوا کر ان پر چاندی کی پنی اس خوبی سے چسپاں کی گئی تھی کہ ڈائی میں دینے کے بعد تماشائی کو چاندی کے اصل سکے ہی دکھائی دیں۔ آج جو سین شوٹ کرنا تھا اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

''اداکار ظریف ترکی سے آئے ہوئے ایک شعبدہ باز کے گٹ اپ میں جادو کی چھڑی ہلاتا ہال میں داخل ہوتا ہے۔ وہ سفید قمیض پر سیاہ سوٹ میں ملبوس گلے میں بونکٹائی لگائے، کوٹ کی جیب میں سفید رومال رکھے، ہاتھوں میں سفید دستانے اور پیروں میں سیاہ چمکدار شو پہنے، چھوٹی سی میز کے قریب رکھے مائیک کے سامنے آ کر تماشائیوں میں سے کسی ایک آدمی کو بلا کر اپنی تلاشی لینے کیلئے کہتا ہے۔ تلاشی لینے والا ظریف کے بدن پر لباس کے سوا کوئی اور شے نہ ہونے کی تصدیق کر کے واپس اپنی جگہ پر چلا جاتا ہے۔ اب ظریف تالی بجا کر لوگوں اپنی طرف متوجہ ہونے کیلئے کہتا ہے۔ لوگ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ ظریف اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر اس پر جادو کی چھڑی گھماتا ہے اور بڑی نزاکت سے جادوگرانہ شان کے ساتھ رومال کو چھت کی طرف اچھالتا ہے۔ لوگ چھت کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ چھوٹا سا رومال نیچے آتا ہوا بتدریج ایک بڑی سی چادر کی شکل اختیار کر کے فرش پر بچھ جاتا ہے۔ اب ظریف اپنی چھڑی کو چادر پر گھما کر میز پر رکھ دیتا ہے اور ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے بازو کو ہلاتا ہے کوٹ کی آستین سے چادر پر چھنا چھن چاندی کے روپے برسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر دوسرے بازو کو اسی طرح ہلاتا ہے اور روپوں کی بارش ہوتی ہے۔ بار بار یہی عمل دہرانے سے چادر پر روپوں کا بہت بڑا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ لوگ تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ پھر ظریف کے تالی بجانے پر ایک باڈی بلڈر آتا ہے جو چادر کی گٹھڑی باندھ کر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ناکام ہو کر گٹھڑی کے ساتھ خود بھی فرش پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔'' لوگ تالیاں بجاتے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ ظریف اپنا پاسنگ شوٹائپ ہیٹ اتار کر لوگوں کے سامنے سر کو جھکاتا ہے۔'' ہال کی لائٹیں گل ہو جاتی ہیں۔ زبردست میوزک بینگ کے ساتھ آرک لیمپ رنگ برنگی روشنیوں میں میڈم رخشی میزوں کے اردگرد رقص کرتی لوگوں کا دل بہلاتی ہے۔

یہ تھا سین جس کی آج شوٹنگ ہونا تھی۔ کیمرہ مین نے لائٹیں سیٹ کر کے آواز دی۔ ریڈی سر!

ہدایت کار نے ظریف کو بلانے کیلئے اپنا اسسٹنٹ میک اپ روم میں بھیجا۔
ظریف نے ہال میں آ کر کہا۔''یس سر''
ہدایت کار نے اسے شاٹ سمجھا کر کیمرہ مین سے لائٹس اون کرائیں اور چیخا۔ایکشن ! ظریف نے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا۔اس پر جادو کی چھڑی گھمائی اور ہوا میں لہرا کر چھت کی طرف اچھال دیا۔جو دو فٹ اونچا جا کر نیچے آ گرا۔
''کٹ ! کٹ !!منوّر صاحب چیخے۔
''کیا ہوا سر''؟ ظریف نے ان سے پوچھا۔
''بھئی ذرا زور سے پھینکو۔رومال کو کافی اونچا جانا چاہیئے''۔
شاٹ ری ٹیک کیا گیا۔''ٹیک ٹو'' اسسٹنٹ نے کلیپ دیکر کہا۔
ظریف نے پھر ایکشن کیا۔لیکن رومال اس بار بھی مطلوبہ اونچائی تک نہ جا سکا۔
''کٹ ! کٹ !'' ہدایت کار چیخ اٹھا،'' وائڈ اینگل ہے بھائی ! ہوٹل کی گیلری تک فریم کی رینج میں ہے۔ذرا اور زور سے کوشش کرو۔'' ظریف نے ایک بار پھر پورا زور لگایا۔مگر شاٹ NG ہی رہا OK نہ ہو سکا۔تینوں فلسماز اور خاکسار دوسرے لوگوں سے قدرے دور ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ڈائریکٹر کا یہ مضحکہ خیز تماشا دیکھ رہے تھے۔قیمتی نیگیٹو کا اس بیدردی سے قتل عام دیکھ کر فلمسازوں کا خون کھول رہا تھا۔ہدایت کار تھک ہار کر سر پکڑے کرسی پر براجمان تھا۔کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور پیشانی کو ہاتھ سے مسل کر بولا۔
''یار ظریف ! تمہارے ہاتھوں میں جان بالکل نہیں کیا۔ایک رومال بھی تم سے.....'' اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔
''جان لڑانے کی ضرورت نہیں سر۔رومال کو انگلیوں کے اشارے سے اَوپر.....''
منوّر صاحب بھڑک اٹھے۔
''او۔یوشٹ اپ،زور سے رومال اوپر جاتا نہیں،اشارے سے کیسے جائے گا؟ او مائی گاڈ.....مصیبت تو یہی ہے۔آج کل کے نوجوان دو چار انگلش فلموں کی نقل کر کے رائٹر بن جاتے ہیں۔پتہ انہیں خاک نہیں ہوتا۔ایسے سین لکھ مارتے ہیں جنہیں فلمانا کسی بھی ڈائریکٹر کے لئے ممکن نہیں ہوتا''۔
''بندر کی بلا طویلے کے سر'' میں نے برملا کہا۔
''سر ! منظر نامے کا ایک ایک سین خود آپ نے تحریر کرایا اور الزام مجھے دے رہے ہیں۔تاہم یہ کچھ اتنا مشکل بھی نہیں ہے''۔
شرابی سرخ ڈھیلوں سے کالی پتلیاں،جیسے اچھل کر باہر نکل پڑیں گی۔انہوں نے اپنی ضرورت سے زیادہ موٹی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم رائٹر ہو یا شعبدہ باز ہو۔بڑے چالاک بنتے ہو۔اپنی ذہانت پر اتنا ہی ناز ہے تو تم رومال کو کیمرے کی رینج سے باہر پھینک کر دکھا دو۔رومال گیلری سے اوپر نہیں جائے گا تو میں کیمرہ ٹرک کس طرح بناؤں گا''؟
''اس سین کو بدل کر کچھ اور لکھ دو میر ٹھی ! شفٹ بھی ضائع ہو رہی ہے اور میٹریل بھی۔ہم اتنا نقصان برداشت نہیں کر سکتے۔''
''آپ کا نقصان نہیں ہوگا شیخ صاحب ! اور سین بھی یہی رہے گا''۔

میں نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ شیخ صاحب نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور منوّر صاحب جھنجھلا کر اپنے بالوں کو بری طرح کھینچنے اور دانتوں سے جلدی جلدی اپنے ناخن چبانے لگے۔ ان کی پریشان حالی کو دیکھ کر میں کرسی سے اٹھا۔ ظریف کے ہاتھ سے جو اس بلا کی سردی میں بھی ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ رومال لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں سجایا اور ہدایتکار سے کہا ''ابھی ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں''۔

اتنا کہہ کر میں کاؤنٹر پر مختلف برانڈ کی شرابوں کی بوتلوں سے بھری الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ الماری کے پیچھے جا کر میں نے اپنے ماضی کو آواز دی۔ یادوں کی پٹاری کو کھولا۔ تو یاد آیا۔ بچپن میں پھٹی ہوئی پتنگوں کے باریک رنگین کاغذوں کی بہت سی تہیں کر کے گول دائرے کی صورت میں کاٹ لیتے تھے۔ پھر ان رنگ برنگے کاغذوں کے نیچے، کوئی پتھر روڑا یا ٹھیپا رکھ کر پوری طاقت کے آسمان کی طرف اچھالتے۔ روڑا تو وزنی ہونے کے باعث جلد ہی زمین پر آ گرتا۔ مگر کاغذ ہلکا ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ رنگین تتلیوں کی طرح رقص کرتے، کانپتے، تھرتھراتے زمین کی طرف آتے۔ اس کھیل میں ہمیں بڑا مزہ آتا۔ میں نے فوراً ہی جیب سے ایک دونی نکالی۔ اسے رومال کے ایک سرے میں لپیٹ کر تہ کیا اور رومال کوٹ کی جیب میں سیٹ کر کے واپس آ گیا۔ ہال میں چہ میگوئیاں کرتے لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ وہاں موجود سٹاف کے لوگ۔ ایکسٹرا، ویٹرز اور حاضرین سانس روکے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پورا ہال گومگو کی کیفیت اور بیزار کن سناٹے میں ڈوبا ہوا کسی معجزے کا منتظر تھا۔ گویا۔

یہ تماشا دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

جو کام بازانجام نہ دے سکا وہ بیچاری چڑیا کیا دے گی۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ میں نے سرگرمیاں ہدایت کار کو مخاطب کیا۔

''آئی ایم ریڈی سر! آپ کیمرہ اون نہ کرائیں۔ صرف ایکشن کہہ کر ریہرسل دیکھ لیں۔ پرفارمنس آپ کی ڈیمانڈ کے مطابق ہو جائے تو رئیل شاٹ ظریف صاحب پر لے لیں''۔

منور صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور منہ پھلائے رکھا۔ میں نے جادوگر کی میز کے پاس آ کر کہا۔

''آرڈر سر!'' بڑی بیزاری اور بے یقینی کے ساتھ انہوں نے کہا۔

''ایکشن'' میں نے دونی والی جگہ کو انگلیوں سے پکڑ کر جیب سے رومال نکالا۔ پھر انگوٹھے اور انگشت شہادت سے دبا کر رومال پر جادو کی چھڑی گھمائی اور ساحرانہ انداز و ادا سے رومال کو اوپر کی طرف اچھال دیا۔ رومال ہوٹل کی چھت سے جا ٹکرایا۔ ہال دیر تک پر زور تالیاں سے گونجتا رہا اور اس گونج میں غم و غصے سے منوّر صاحب کا چہرہ ان کی سرخ آنکھوں سے بھی زیادہ سرخ ہو گیا۔ میری کامیابی پر کوئی انعام یا داد دینے کی بجائے، اپنی چنگاریاں اڑاتی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس حقیر بے تقصیر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے کا رنگ پہلے ابولہب کی طرح لال بھبھوکا، پھر پیلا زرد۔ پھر سفید اور پھر مٹیالا سا ہو گیا۔ میں فلمسازوں کے پاس اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ جو اس ساری صورتِ حال پر حیران و پریشان سے بیٹھے تھے۔ اس پل پل رنگ بدلتے انسان کا خون جیسے رگوں میں خشک ہو گیا ہو۔ یا جیسے قحط سالی سے تڑخی ہوئی پیاسی دھرتی۔ یا پھر قدیم کھنڈرات کی کھدائی کے دوران دوران ملبے سے نکلی ہوئی کوئی بوسیدہ شکستہ ممی، پھر چکا چوند روشنی کے باوجود اس کے بے جان چہرے پر اتنی سیاہی چھا گئی کہ آنکھوں اور دانتوں کے سوا کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے انتہائی غیض و غضب

کے عالم میں کیمرہ سٹینڈ پر رکھا ہوا مجلد سکرپٹ اٹھایا اور نفرت سے فلمسازوں کی طرف فرش پر پھینک کر چلّایا۔

''ڈائریکشن بھی اس سے کرالو'

میں نے جھک کر فرش سے ڈرامہ اٹھایا۔اس کی گرد جھاڑی اور فلمسازوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

ڈائریکشن ایک رائٹر کیلئے کیا مشکل ہے۔صرف کامن سنس چاہیے اوران کی اجازت'' ہوٹل کے در و دیوار قاسم صاحب کی دہاڑ سے گونج اٹھے۔

''شوٹنگ پیک اپ'' اگلے دن دفتر میں جب شوٹنگ پر جانے کی تیاری کر رہے تھے تو شیخ صاحب نے تنہائی میں انتہائی راز داری سے کہا۔

''عزیز صاحب! بڑے دکھ کے ساتھ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ شوٹنگ پر جانے کی تکلیف نہ کریں۔ ورنہ ہمارا پروجیکٹ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ پلیز۔اب جو ہوسو ہو یا قسمت یا نصیب''۔

''ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا'' شاید ایسے ہی غبی نااہل اور مطلب پرست لوگوں کے لئے کہا گیا ہے۔ بہت بعد جب میں انور کمال پاشا کے سٹوری ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھا۔ایک بار موصوف نے مجھ سے فرمایا''عزیز! وحشی کا سکرپٹ میرے پاس ہوتا تو میں اس پر کم سے کم گولڈن جوبلی فلم بناتا''۔

وحشی فلم دس ماہ میں مکمل ہو کر پیلس سنیما میں نمائش کیلئے پیش کی گئی۔ جسے عوام نے بڑی نفرت وحقارت سے ٹھکرا دیا۔ مجھے، ہدایتکار اور فلمسازوں کو گالیوں سے نوازا۔ میں تماشائیوں کے ہجوم سے نکل کر لابی کے ایک کونے میں کھڑا شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ جبکہ فلمسازوں کا مار آستین فریب خوردہ منور ابچ قاسم ایم اے پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے۔ بڑی ڈھٹائی سے ہم پیالہ ہم نوالہ بخشی جنگ بہادر کا ہاتھ تھامے سنیما گیلری کی بلندی سے قدم قدم سیڑھیاں اتر تا لابی کی پستیوں میں آ رہا تھا۔''عظیم ہدایت کار'' نے'' آج کل'' کے نام سے میرے عزیز دوست علی سفیان آفاقی کے سکرپٹ پر بھی اسی طرح ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔اس کے بعد وہ فلم انڈسٹری ہی نہیں پاکستان سے یوں غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

◆◆◆

ڈاکٹر یونس بٹ

''اظہر جاوید عاشق مزاج آدمی ہیں۔گفتار میں ترنم......اور کردار میں ملکہ ترنم ہے۔اس نے ''تخلیق'' کے زور پر کئی شاعرات پیدا کیں۔جن میں اکثر بڑی ہوگئی ہیں مگر صرف عمر میں۔اُردو ادب کے لیے اس نے جو عملی کام کیا ہے کئی آدمی مل کر نہیں سکتے۔یعنی جتنے عشق اس اکیلے بندے نے کیے ہیں کئی آدمی مل کر نہیں کر سکتے۔ جتنے لمبے وہ عشق کرتا ہے اتنی لمبی تو لوگ دشمنیاں بھی نہیں کرتے۔عورتوں کے کام آنا اعزاز سمجھتا ہے۔اسی لیے کسی نہ کسی خاتون کا اعزازی مدیر ہوتا ہے۔''

اب کون بھلا اتنی محبت ہمیں دے گا

ڈاکٹر طاہرہ بخاری

اظہر جاوید.....سراپا محبت تھے، تمام عمر محبتیں بانٹتے رہے اور شاید اسی لیے جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ محبت کا عالمی دن تھا..... وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے لیکن جو عزّت، احترام اور محبت انہوں نے مجھے دی اس کا اندازہ کوئی لگانا بھی چاہے تو نہیں لگا سکتا۔ میرے خاندانی وقار کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا۔ مجھے سیّد زادی کہہ کر مخاطب کرتے اور یہی وجہ تھی کہ مسلسل پانچ سال ''تخلیق'' نے مجھے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ جب بھی میں ان سے کہتی کہ آپ کی محبتوں اور خلوص کا قرض کیسے اتاروں تو یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیتے ''چندا، سید زادی، جب میں مر جاؤں تو مجھے محبت سے یاد کر لینا''۔ آج میں انہیں یاد کرنا چاہتی ہوں لیکن الفاظ ہیں کہ ترتیب ہی نہیں پا رہے۔ ہم سے بچھڑے آج انہیں ایک سال سے زیادہ ہونے کو ہے لیکن ابھی تک یقین ہی نہیں آ رہا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ایسے لگتا ہے ابھی میں ان کا نمبر ملاؤں گی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ''جی اظہر'' کہہ کر پوچھیں گے ''جی طاہرہ! کیسی ہیں آپ؟ اور پھر ہمیشہ کی طرح ''جیتی رہیں، شاد رہیں، آباد رہیں'' جیسی دعائیں دیں گے۔

''تخلیق'' میں چھپنے سے پہلے بھی میں ادبی حوالے سے متعارف تھی۔ لیکن باقاعدہ ادبی حلقے میں میرا تعارف ''تخلیق'' اور اظہر جاوید صاحب کے ذریعے ہوا۔ پہلی مرتبہ انہوں نے 2007ء میں میری تصویر اور نظم شائع کی اور پھر اب آخری مرتبہ بھی وہ میری تصویر اور نظم چھاپ کر چلے گئے..... لہٰذا جب میں نے فروری کے شمارے کی اشاعت کا معلوم کرنے کے لئے ان کو فون کیا تو کہنے لگے ''میں آپ سے ناراض ہوں۔ میں آپ کی چیزیں واپس بھیج رہا ہوں۔ آپ نے مجھے خط نہیں لکھا''۔ لیکن جب ''تخلیق'' موصول ہوا تو سرِ فہرست نہ صرف میری تصویر چھپ چکی تھی بلکہ ''خوشبو'' کے عنوان سے نظم بھی شائع ہو چکی تھی۔

ممتاز شاعر احمد فراز (مرحوم) کے حوالے سے جنرل پوسٹ آفس لاہور میں ایک تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا۔ تو اظہر جاوید، شعیب جعفری اور برکات صاحب نے ہمیں خط بھیجا۔ میری دوست فرحت طاہر اور میں جب GPO پہنچے تو اظہر جاوید صاحب پہلے سے شعیب جعفری صاحب کے کمرے میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ہماری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ تقریب کے دوران تمام وقت وہ ہمارے ساتھ رہے اور جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو شعیب جعفری اور برکات صاحب سے کہہ کر ہمیں لنچ بکس بنوا کر دیئے اور یہ تاکید کی کہ ''تم لڑکیاں ہو، راستے میں کہیں بھی ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو نہ کہنا۔''

تقریب کے بعد ہمیں اپنے دفتر تخلیق لے گئے جہاں عمر زمان صاحب ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے ہمارا تعارف کروا کر کہنے لگے ''یہ عمر زمان ہیں، علم جعفر کے ماہر ہیں۔ پھر جب آپ مجھ سے ملنے آؤ گی تو ان سے تمہیں زائچہ بنوا کر دوں گا۔'' اس کے بعد دو

خوبصورت فاؤنٹین پن نکالے اور پین ہمیں کرسی سے اُٹھ کر دیئے۔ کہنے لگے ''تم دونوں ادیب اور شاعرات ہو اور میرا خیال ہے ایک قلمکار کیلئے قلم سے زیادہ بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہوسکتا''۔

اظہر جاوید دل کے عارضے میں مبتلا ہونے کے باوجود زندگی سے بھرپور باتیں کرتے تھے۔ جب ان کو ''پرائڈ آف پرفارمنس'' سے نوازا گیا تو ان کے اعزاز میں ایک شام کی تقریب باربی کیو میں رکھی گئی۔ جس کے دعوت نامے انہوں نے فرحت طاہر اور مجھے بھی بھیجے۔ کسی مجبوری کے باعث ہم شرکت نہ کر سکے تو فون پر ناراضی کا اظہار کیا۔ کہنے لگے ''ایک شرط پر ناراضی دور ہوگی کہ تم شادی کے بعد بھی رابطہ رکھو گی اور ''تخلیق'' میں چھپتی رہو گی''۔ انہیں ہر بات کا خیال رہتا تھا۔ پانچ سالوں میں کوئی سالگرہ ایسی نہیں جب انہوں نے فون کر کے نیک خواہشات کا اظہار نہ کیا ہو۔ اب بھی کچھ دن پہلے فون کر کے کہنے لگے ''تمہاری سالگرہ آنے والی ہے میں فون کروں گا'' لیکن اب کی مرتبہ سترہ فروری کو ان کا فون تو نہیں آیا بلکہ ان کی یاد میں تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا۔ اپنی وفات سے چند دن پہلے ایک شام اچانک فون کر کے کہنے لگے ''طاہرہ! زندگی کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ میں اب عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں انسان کو نرسنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم لوگ دیر کر رہے ہو۔ مجھ سے ملنے نہیں آئے کسی دن اچانک تمہیں پتہ چلے گا کہ میں فوت ہو گیا ہوں''۔

13 رفروری کی رات سات سے دس بجے کے دوران اچانک اظہر جاوید صاحب کا خیال ذہن پر حاوی ہوا۔ موبائل اٹھا کر اظہر صاحب کا نمبر ملایا۔ حسب سابق ''جی اظہر'' کہنے کی بجائے انہوں نے ''ہیلو'' کہا۔ ان کا حال پوچھا تو کہنے لگے ''جی میں ٹھیک ہوں'' میں کل دوبارہ آپ سے تفصیل سے بات کروں گی۔'' حسبِ وعدہ اگلے دن کالج کی مصروفیات سے فارغ ہو کر جب میں نے ان کا نمبر ملایا تو بہت دیر ہو چکی تھی..... وہی ہوا جس کی پیش گوئی اظہر جاوید صاحب نے چند دن پہلے کر دی تھی۔ ان کے بیٹے نے فون پر بتایا کہ ''ابو تو آج صبح ساڑھے نو بجے فوت ہو گئے ہیں''۔ میرا سر چکرا گیا اور اب تک چکرایا ہوا ہے۔

اور اب آ کر میں وہ خط جو میں ان کو زندگی میں تو نہ لکھ سکی بعد از مرگ لکھنے کی کوشش کرتی ہوں تا کہ ضمیر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے.....

''میرے محترم اظہر جاوید صاحب

گزشتہ رات جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں کل صبح دوبارہ تفصیل سے بات کروں گی تو آپ نے کہا تھا ''جی بہت اچھا''۔ پھر آپ نے مجھ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ آپ ۱۷ فروری کو مجھے سالگرہ کی مبارکباد دیں گے..... کیا آپ اپنے سارے وعدے بھول گئے۔ میں جب بھی آپ سے کہتی تھی کہ آپ کے خلوص اور محبتوں کا قرض کیسے اتاروں تو آپ ہمیشہ یہی کہتے تھے ''جب میں مر جاؤں تو مجھے محبت سے یاد کر لینا''۔ دیکھیں میں نے آپ کو یاد کرنے کا وعدہ یہ مضمون لکھ کر پورا کر دیا ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دیجئے گا..... آپ کی محبتیں ہمیشہ یاد آئیں گی اور ہم آپ کو کبھی نہیں بھول پائیں گے۔

طاہرہ بخاری

اللہ تعالیٰ اظہر جاوید صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اس شعر کے ساتھ اپنی یادوں کو سمیٹتی ہوں ؎

وہ جس کی باتوں کی بارشوں میں ہر ایک موسم میں بھیگتے تھے
وہ اپنی چاہت کے سارے منظر ہمیں دکھا کر چلا گیا ہے

◆◆◆

سفرِ شمال

.....6.....

طارق محمود

انہی دنوں میرا تبادلہ ہوا اور میری تعیناتی ایڈیشنل چیف سیکرٹری کے اہم عہدے پر کر دی گئی۔ میرے دائرۂ اختیار میں صوبے کے ترقیّاتی امور اور ماحولیات کا شعبہ تھا۔ کام کی نوعیت خاصی دلچسپ تھی۔ بین الاقوامی ترقیّاتی اداروں، ڈونر ایجنسیوں (Donor Agencies) سے براہ راست روابط کے مواقع تھے۔ کئی بیرونی ایجنسیاں قبائلی اور بندوبستی علاقوں ترقیاتی کاموں خصوصی طور پر فروغِ تعلیم، صحت، انفراسٹرکچر، افزائش جنگلات، فراہمی آب کے سلسلے میں خاصی فعال تھیں۔ صوبے بھر میں، خصوصاً قبائلی علاقوں میں جہاں پوست کی کاشت کی حوصلہ شکنی کی جا رہی تھی، عوام النّاس کے لیے متبادل روزگار کے اہتمام کے سلسلے میں کئی اہم اقدامات کیے جا رہے تھے۔ صوبے کی معیشت میں پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ کے شعبے کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ نوعمر قابل سول سرونٹس اس محکمہ میں تجربہ حاصل کرنے کے متمنی رہتے۔ چند برس کا تجربہ حاصل کرتے، اہم پروجیکٹس پر کام کرتے۔ فیلوشپ پر بیرون ممالک سے اعلیٰ تربیت حاصل کرتے اور پھر چند برس کسی بین الاقوامی ترقیاتی ادارے میں گزار آتے۔ اس دوران مجھے بڑے مستعد اور ذہین ساتھیوں کی معاونت حاصل رہی، ان میں ڈاکٹر امداد، چیف اکنامسٹ، یونس ڈاگا کا تعلق صوبہ سندھ سے تھا، ظفر علی شاہ، شیر عالم محسود، کاظم سے شناسائی سول سروس اکیڈیمی سے تھی، جہاں میں انہیں جز وقتی پڑھا چکا تھا۔ ارشد مرزا، لاہور سے میرے ہمراہ ہی تبدیل ہو کر آیا تھا۔

کام کی نوعیت کے اعتبار سے مجھے ان ساتھیوں کے ساتھ بھرپور عظیم کام کرنے کا موقع ملا۔ وسائل میں رہتے ہوئے ہماری نظر ہمیشہ اہداف پر رہتی تھی۔ میری کوشش ہوا کرتی کہ اپنی ٹیم کے ہر ساتھی کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے۔ اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھا جائے۔ اختلاف کی صورت میں احترام رائے کی جائے۔ اس اُصول کا اطلاق تو اپنے سینئر اور وقتی سیاسی قیادت کے ساتھ بھی رہا اور یہ بالعموم گھاٹے کا سودا بھی نہ تھا۔ فروعی باتوں کو کبھی مسئلہ نہ بنایا، مؤقف میں لچک سے گریز نہ کیا لیکن اصل مطمحِ نظر کو بھی اوجھل نہ ہونے دیا۔ کہتے ہیں کہ سرکاری ملازم کی زندگی میں اس کی سالانہ رپورٹ (Annual Confidential Report) بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ترقیّاں اور محرومیاں اسی کی مرہون ہو جاتی ہیں۔ یہ فرض سینئر افسران کا ہوتا ہے جو اپنے ماتحتوں کی کارکردگی کی رپورٹ لکھتے ہیں۔ میرے نزدیک ایک رپورٹ ایسی بھی تھی جو سرکاری اے۔ سی۔ آر سے بھی مقدّم تھی۔ یہ وہ رپورٹ تھی جو ہمارے ماتحت اور دفتروں کے باہر عوام النّاس سینہ بہ سینہ لکھتے چلے آ رہے تھے۔ یہ کسی مہک یا باس کی طرح ہر سُو پھیل جاتی۔ اسی پر بس نہیں، اس ضمن میں عوام النّاس کی رائے مقدم تھی۔ کن حالات میں کسی نے اُن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ آنے والے کی مشکل اور مسئلے سے کیا موانست کی کوشش کی؟ مسئلہ نہ بھی حل کر پائے، کیا اُس

کا دُکھ درد سمجھا؟ ہمدردی کے دو بول بولے! اُمید کی روشنی دی، اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے تو زندگی میں رمق تھی۔ پبلک سروس بھی سیاہ اور سفید کا کھیل نہیں تھا۔ کبھی کبھار تو سفیدی، سیاہی میں جذب ہو جاتی۔

صوبے بھر میں مختلف اضلاع میں کئی اہم پروجیکٹس پر کام ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے صوابی سے ڈیرہ اسماعیل خان، دیر، سوات، چترال اور مختلف قبائلی ایجنسیوں میں جانے کے مواقع ملتے رہتے۔ بہت کچھ جانا اور بہت کچھ سیکھا! افغان مہاجرین کی آبادی کا دباؤ اگرچہ ہر جگہ محسوس کیا جا سکتا تھا لیکن عمومی صورتِ حال، تسلّی بخش تھی۔ امن و امان کا کہیں کوئی سنگین مسئلہ بھی نہ تھا۔ ریاست کی رٹ (writ) بھی قائم تھی۔

ایبٹ آباد، نتھیا گلی جاتے ہوئے میرا گزر ہری پور سے ہوتا۔ کبھی مسافت کے دوران ستانے کا موقع مل جاتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرا دیرینہ دوست شفاعت احمد ان دنوں ہری پور میں مقیم تھا۔ شفاعت سے اوکاڑہ کے ایام سے دوستی تھی۔ یہ دوستی فیملی کے باہم تعلقات میں ڈھل گئی۔ شفاعت نے اپنے عملی کیریئر کا آغاز مچلز فروٹ فارم سے کیا تھا۔ امریکہ سے فوڈ ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ کئی برس سے مچلز کے ساتھ منسلک رہا۔

حطار انڈسٹریل اسٹیٹ میں معروف فرم پیکجز نے بیرونی شراکت داری سے ڈین فوڈ کے نام سے بسکٹوں کا ایک کارخانہ قائم کیا تو شفاعت اس فیکٹری میں جنرل منیجر تعینات ہو کر، یہاں آ گیا۔ شفاعت کی رہائش گاہ ہری پور میں ٹیلی فون فیکٹری روڈ سے ملحقہ علاقے میں تھی۔ یہ جگہ 'سوکا پانڈک' کے نام سے مشہور تھی۔ یہ برساتی نالے کی گزرگاہ تھی جو برسوں سے خشک چلی آ رہی تھی۔ شدید بارشوں میں اس نالے میں پانی بھر آتا اور یہاں آمد و رفت مسدود ہو جاتی۔ نالے کے اردگرد بلند ٹیلوں پر لوگوں نے کشادہ گھر تعمیر کر رکھے تھے بلکہ ان گھروں کو اگر بنگلے بھی کہا جاتا، تو غیر مناسب نہ تھا۔ یہ شاملات دیہہ کا رقبہ تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی مشترکہ ملکیات کے علاوہ کچھ سرکاری رقبہ بھی تھا۔ جس کا جہاں زور چلا پختہ تعمیر کرا لی اور چین سے رہنے لگے۔

شفاعت کے ہاں جانے کے لیے پتھریلے راستوں پہ سفر کرنا پڑتا، چند فرلانگ دریائی گزرگاہ طے کر کے فوروِیل گیئر لگاتے اور چڑھائی کا رُخ کرتے۔ کچھ ہی فاصلے سے بلند دیواریں دکھائی دیتیں۔ گاڑی سیاہ آہنی گیٹ کے پاس آ کر رُک جاتی۔ یہ دو منزلہ کشادہ گھر تھا۔ گیٹ کھلتے ہی وسیع لان میں داخل ہو جاتے۔ چار چفیرے موتیے اور شکری مالٹوں کی خوشبو اپنی مہک بکھیرتی۔ شفاعت ہر وقت کسی مہمان کی آمد کا منتظر رہتا۔ مل کر بہت خوش ہوتا۔ باورچی کو اشارہ ملنے کی دیر ہوتی، رات کھانے کی میز انواع و اقسام کی ڈشوں سے سج جاتی۔ میں کبھی کبھار رات بھر قیام کرتا۔ حطار، خان پور کے راستے سے ہوتا ہوا، راولپنڈی اور لاہور روانہ ہو جاتا۔

حطار انڈسٹریل اسٹیٹ کے قیام سے ہری پور، خان پور، ٹیکسلا، واہ اور مضافاتی علاقوں میں بڑی نمایاں تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ملک کے کئی اہم کاروباری اداروں نے یہاں پر کئی قسم کے منافع بخش یونٹ لگا رکھے تھے۔ روزگار کی فراہمی اور تربیت یافتہ ہنرمندوں کے لیے حوصلہ افزا امکانات تھے۔ شروع شروع میں تو حکومت نے اس انڈسٹریل اسٹیٹ میں سہولیات پر بڑی توجہ دی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ اسٹیٹ عدم توجہ کا شکار ہو گئی۔ جونہی ٹیکس کی چھوٹ کا دورانیہ ختم ہوا، توانائی اور خام مال کے حصول میں دشواریاں بڑھنے لگیں۔ کاروباری حضرات بھی ہمّت چھوڑ گئے۔ سڑکوں، شاہرات کا انفراسٹرکچر بھی شکست و ریخت سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس اہم شعبے کی نگرانی کے لیے کوئی مؤثر صورت سامنے نہ آ رہی تھی۔ کئی کاروباری حضرات نے اپنے یونٹ یہاں سے منتقل کرنے شروع کر دیئے۔ ڈین

فوڈ کو بھی اغلباً سری لنکا کے کاروباری حضرات نے خرید لیا اور گاہے گاہے مشینری یہاں سے منتقل کر لی۔ شفاعت نے بھی اپنا سلسلہ سمیٹ لیا اور جھنگ منتقل ہو گیا جہاں اُسے ڈیری پراڈکٹ کی ایک فیکٹری میں جنرل منیجر کی آفر مل چکی تھی۔

ہری پور، جسے گزرے دنوں میں ہری پور ہزارہ کے نام سے پکارا جاتا تھا، کہنے کو تو سابقہ صوبہ سرحد حال خیبر پختون خواہ میں واقع تھا لیکن ثقافتی اور تمدنی اعتبار سے اِس پر راولپنڈی اور پوٹھوہار کا بڑا گہرا پرتو تھا۔ پشاور کی نسبت رشتے داریاں، برادریاں، کاروباری روابط راولپنڈی سے زیادہ تھیں۔ یہ کوئی انہونی بات بھی نہ تھی۔ دو صوبوں سے ملحقہ علاقوں میں یہ خصوصیت تو بڑی نمایاں تھی۔ سیاسی اور انتظامی محل وقوع سے قطعِ نظر اِن علاقوں کا ثقافتی، تمدنی اور بسا اوقات لسّانی اتصال دوسرے ملحقہ صوبے کے ساتھ زیادہ دکھائی دیتا۔ سیاسی اور انتظامی حوالہ تو محض تاریخی حادثہ تھا۔ تمدن، لسّانی، ثقافت کی جڑیں تو تہذیبی اور جغرافیائی ماخذوں سے پھوٹتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت جنوبی پنجاب کے ایسے علاقوں میں دیکھنے میں آئی جو سندھ سے ملحقہ تھے۔ لسّانی اور زبانی، رہن سہن، لباس کی حد درجہ مماثلت دیکھ کر کہنا مشکل ہو جاتا کہ متعلقہ شخص کا تعلّق پنجاب سے تھا یا پھر سندھ سے! ایسی ہی صورتِ حال سے میں اُس وقت دوچار ہوا جب ڈیرہ اسماعیل خان کے مضافاتی علاقوں، دیہاتوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں گھومتے ہوئے میں جگہ جگہ سبز ہریالے کھیتوں کے بیچوں بیچ کھجور کے لدے پھدے پیڑ دیکھ رہا تھا۔ وہاں کے باسیوں کی شیریں سرائیکی سُن کر میرے لیے باور کرنا مشکل تھا کہ میں ڈیرہ اسماعیل خان میں تھا یا ملتان کی کسی نواحی دیہی آبادی میں گھوم رہا تھا۔

میں ہری پور سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد پہنچ جاتا۔ کچھ ہی فاصلے پر مانسہرہ تھا جہاں سے مین شاہراہ دو شاخوں میں منقسم ہو جاتی ایک راستہ تھاکوٹ سے ہوتا ہوا شاہراہِ ریشم کو مل جاتا اور دوسرا پر پیچ راستہ بالاکوٹ، کاغان ناران سے ہوتا ہوا بوسر کی بلندیوں کو چھونے کے بعد شمالی علاقوں میں شنکیاری سے گزرتا، تو چائے کے تجرباتی فارم دیکھ کر بہت کچھ یاد آتا۔ سلہٹ کے پہاڑی بل کھاتے سبز مخملی سلسلے جہاں خواتین بھڑکیلی رنگین سوتی ساڑھیوں میں ملبوس قطار در قطار چائے کی پتیاں چنتیں نظر آتیں۔ ان پتیوں کو چُن کر کمر سے کسی ٹوکری میں ڈالتی جاتیں۔ سری لنکا میں کینڈی اور کیگال کے نواح میں ایسے ہی ڈھلوانی منظر میرے دیکھے بھالے تھے۔ کیگال کے نواح میں ہم چائے کے باغ میں ایک گیسٹ ہاؤس میں تازہ چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چائے کو خاص طور پر دم کیا گیا۔

جیپ سے اُتر کر میں شنکیاری کے تجرباتی فارم میں یونہی بے مقصد گھومنے گیا۔ ذہن میں اکثر یہ سوال اٹھتا ہم دنیا بھر میں چائے درآمد کرنے والے نمایاں ممالک میں سے تھے۔ یہاں چائے کی دنیا کی مجموعی پیداوار کا لگ بھگ بارہ فی صد استعمال ہو رہا تھا لیکن چائے کی پیداوار کے اعتبار سے ہم ابھی تک تجربات کے عمل سے ہی گزر رہے تھے۔ ماہرین مناسب آب و ہوا، زمینی ہیئت، اُس کے کیمیائی اجزاء کی تلاش میں تھے۔ ایسے پہاڑی ڈھلوان جہاں جاڑے میں کورا نہ پڑتا ہو! بارش بھی خوب ہو اور پانی بھی نہ رُکا رہے۔ ہم شنکیاری کے علاوہ کہیں اور ایسی معقول مٹی اور فضا کیوں نہ تلاش کر پائے تھے۔ ہمارے ماہرین کے لیے ایک اہم سوالیہ نشان تھا! مانسہرہ سے آگے ناران کی سمت جائے ہوئے پلک جھپکتے ہی ایک نئے منظر کی تصویر تھی، کہیں بلند بالا پہاڑی سلسلوں پر چیڑ اور چنار کے گھنے پیڑ اور کہیں سڑک کے دوسری طرف گہری کھائی کے بیچوں بیچ بہتا ہوا پُر شور دریا، کسی مقام پر لینڈ سلائیڈ کی بنا مسدود راستہ اور کہیں میلوں تک لمبی ڈرائیو! شوگران سے آگے پتھریلے پہاڑی راستوں پر جیپ کا صبر آزما سفر! سلسلہ تمام ہوا تو ہزار ہا فٹ کی بلندی پر بے آب و گیاہ چٹیل میدان، جہاں دم بھر کے لیے سستا لیے۔

اس بلند مقام سے نظر دوڑائی تو ایک اور بلند مقام نظر آیا۔ ہم سفر نے بتایا کہ ان دونوں مقامات کو مقامی لوگ سری پائے کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ شام کے سایے پھیلے تو شوگران لوٹنے کی جلدی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ فارسٹ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے لکڑی کی انگیٹھی یقیناً دم کر رکھی ہوگی۔ سخت سردی میں گرم دہکتی انگیٹھی کا خیال ہی بڑی آسودگی کا باعث تھا۔ گرم گرم چائے کا سرور، بدلیوں میں گھری فضا میں اس بلند و بالا مقام پر نیند کا تصور، ہم ریسٹ ہاؤس کے بالکل قریب تھے۔ طویل سفر، پہاڑوں کی اونچ نیچ پاٹنے کے بعد یہاں رات بھر کا قیام بڑا فطری لگ رہا تھا۔

انہی دنوں حکومت بڑے وسیع پیمانے پر انتظامی ڈھانچے میں دوررس تبدیلیاں کر رہی تھی۔ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے کلیدی عہدے ختم کئے جا رہے تھے۔ ملک میں نیا بلدیاتی نظام آ رہا تھا۔ بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن (Bureau of National Reconstruction) کا قیام عمل میں آ چکا تھا جس کی سربراہی فوج کے ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل کر رہے تھے۔ مطمعٔ نظر یہی تھا کہ تمام تر اختیارات اب ضلع اور اس سے بھی نچلی سطح پر منتقل کیے جا رہے ہیں۔ ان اداروں کو زمینی سطح (Grass Root) کی سطح کے عوامی نمائندے چلائیں گے۔ اختیارات کا منبع اب ضلعی سطح پر منتخب نمائندہ ضلع ناظم تجویز کیا جا رہا تھا۔ صوبائی حکومتوں پر لازم تھا کہ وہ اپنے بجٹ کا خطیر حصہ ضلعی حکومتوں کو منتقل کریں۔ بہت سے سرکاری محکمے جو ابھی تک صوبائی حکومت کے اختیار میں تھے، اُن کا انتظام و انصرام ملازمین کی جزا اور سزا کا اختیار، ضلعی ناظمین کو منتقل کیا جا رہا تھا۔ اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی، ہر حکومت کا نعرہ رہا۔ یہ سلسلہ تو ایوب خان کے دور سے شروع تھا، قوم کو بنیادی جمہوریت کی نوید سنائی گئی۔ عوام الناس سے بالغ رائے دہی کا حق سلب کر لیا گیا اور ایک ایسی مخلوق وجود میں آ گئی جو ضلعی، تحصیل اور مقامی سطح پر ترقیاتی کاموں کے ساتھ ساتھ قومی اور صوبائی اسمبلی اور صدر کے انتخابات کے سلسلے میں اب انتخابی ادارے Electoral College کا فریضہ بھی سرانجام دے رہی تھی۔ لگ بھگ اسی ہزار افراد پر مشتمل قوم کے نمائندے موم کی ایسی ناک ثابت ہوئے، جنہیں انتخابات کے موقعے پر حکومت نے جس طرف موڑنا چاہا، موڑ لیا۔ یہ نظام ایوب خان کی معزولی کے ساتھ ہی ملک سے رخصت ہو گیا۔

ضیاالحق مرحوم نے بلدیاتی نظام کی داغ بیل رکھی جو بڑی حد تک تاریخی تسلسل کا حصہ تھا۔ ضلع میں ترقیاتی کام اور مہمان داری کا شعبہ منتخب نمائندوں کے سپرد تھا۔ ملک میں جب عام انتخابات ہوئے تو کبھی کبھار قومی و صوبائی اسمبلی کے اراکین اور میونسپل اداروں کے سربراہان کے مابین تناؤ آ جاتا لیکن اس حد تک تجاوز نہ کرتا کہ نظام کو تلپٹ کر دے! مشرف دور میں سرکار کے ترقیاتی اختیارات کے ساتھ ساتھ ریگولیٹری (Regulatory) اختیارت، مقامی سطح پر انصاف کی فراہمی اور امنِ عامہ سے متعلقہ ادارے، ریونیو افسران جنہیں عدالتی اختیارات بھی تفویض تھے بیک قلم ضلعی ناظمین کے حوالے کر دیئے گئے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ نہ ہی ناظمین اس نظام پر کلی دسترس حاصل کر پائے اور نہ ہی انصاف کے جملہ تقاضے پورے ہو سکے۔ طاقت کا ارتکاز فردِ واحد کے ہاتھ میں تھا جس کا طرۂ امتیاز دھڑے بندی کی سیاست Factional Politics ٹھہری۔

ضلعی اور ڈویژن کی سطح پر بیک جنبش قلم کلیدی عہدوں کو ختم کرتے ہوئے Colonial Legacy کا غوغا بلند کیا گیا۔ غلامی کے دور کی میراث! ہمارے ہاں یہ عہدے یقیناً غلامی کے دور کی میراث تھے لیکن ان کے تسلسل میں تاریخ کا طویل سفر تھا جس کی کڑیاں دورِ غلامی سے بھی دور تک پھیلی تھیں۔ Colonial Legacy کو بہرطور ایک نعرے کے طور پر خوب استعمال کیا گیا۔ نئے نظام کے فضائل

گنواتے وقت جنرل مشرف مروجہ انتظامی ڈھانچے کو رد کرتے ہوئے کلونیل لیگسی (Colonial Legacy) کا ذکر بڑے تواتر سے کیا کرتے۔ایسی باتیں سُن کر اکثر خیال آتا کہ اس ملک میں ایسا کون سا کلیدی ادارہ تھا جس کے خدوخال کلونیل دور میں مرتب نہ کئے گئے تھے۔اس میراث میں کیا کچھ نہ تھا۔ریلوے کا نظام جس نے پاکستان کی قدیم بکھری معاشرت کو یکجا کیا۔شاہرات کا نظام جس نے اس خطے کے مختلف دور دراز علاقوں کو مربوط کر دیا۔نہری نظام جس نے نا قابلِ تقلید تمدن کی بنیاد رکھی۔یہ سب تو اسی دور کی پیداوار تھی۔ہمارے عسکری نظام کی داغ بیل،عہدے،مرتبے،تربیت اُسی دور کی مرہون تھی تو پھر یہ غوغا کیوں کر سال ہا سال سے ان اداروں کی افادیت کے پیشِ نظر یہ ہماری قومی میراث بن چکے تھے۔

مشرف حکومت کے دیئے گئے نظام کو ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کا نام دیا گیا۔ضلعی ناظم کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔اہم صوبائی محکموں کا کنٹرول انتظامی و مالی وسائل،ضلع کی سطح پر منتقل کئے جا رہے تھے۔ڈویژن کی سطح پر انتظامی ڈھانچے کی کڑیاں ختم کر دی گئیں جن میں کمشنر کا عہدہ بھی شامل تھا۔ریونیو جوڈیشل (Revenue Judicial) اختیارات نسبتاً جونیئر افسر کے سپرد کر دیئے گئے جو ضلعی ناظم کے ماتحت تھا۔ آنے والے برسوں میں ریونیو کیسوں پر سیاسی اثرات کی وجہ جاننا کوئی اتنا مشکل امر نہ تھا۔

نئے نظام کے نفاذ کے سلسلے میں جب بھی کوئی اہم اجلاس ہوا کرتا تو خوبیوں کا اعادہ کرنے کے ساتھ ساتھ میں اپنے تحفظات کے اظہار سے کبھی نہ چوکتا۔میرے پیشِ نظر یہی تھا کہ جیسی بھی تبدیلی لائی جائے اس میں اتنی سکت اور پائیداری ہو کہ اپنے خالقوں کی رخصتی کے بعد اسکی افادیت اور دوام کا بھرم رہ جائے۔ہمارے اربابِ اختیار اور نئے نظام کے خالق یا تو یہ بات سمجھ نہ پا رہے تھے یا عجلت میں کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔انہیں یہ بھی باور کرانا مشکل تھا کہ اُن کا آنا تو حادثاتی تھا اور اُن کا جانا بالکل فطری تھا۔لیکن یہاں تو یوں لگ رہا تھا کہ اُن کا آنا تو فطری تھا اور اُن کی رخصتی تو محض حادثاتی ہی ہو سکتی تھی۔

اس سارے عمل کے بارے میرا نکتہ نظر یہی تھا کہ کسی بھی اکائی کو ضلعی حکومت کہتے ہوئے،صوبائی سطح کے اختیارات تفویض کرتے وقت اُس اکائی کا کم سے کم حجم (Critical Mass) کا تعین ضروری تھا۔وگرنہ ایسی کوئی بھی اکائی اپنے بوجھ تلے کراہنے لگے گی اور کچھ نہ کر پائے گی۔کم سے کم حجم ضروری تھا جس کے گرد انتظامی امور اور اسی نوع کی سرگرمیوں کو منظّم کیا جا سکے وگرنہ ہمارے ہاں جس طرح ضلع قائم کیا جاتا یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ضلع کا قیام تو گزشتہ چند برسوں سے ایک سیاسی نعرے کی پذیرائی اور سرکاری نوٹیفکیشن کی مار تھا۔کسی بھی ضلع کے لیے آبادی کا رقبہ اور وسائل یقیناً مقدم تھے لیکن اب تو حال یہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی تحصیلوں کو ضلع کا درجہ دیا جا رہا تھا اور اُن پر صوبائی حکومت کے اختیارات لادے جا رہے تھے۔ان ضلعوں کے مابین وسائل اور زیرِ زمین پانی کی تقسیم کے مسائل سر اُٹھا رہے تھے۔اختیارات کی منتقلی کیا ہوئی کہ ناظمین کے دفاتر میں تبادلوں اور تعیناتیوں کے لیے تانتا بندھا رہتا۔

صوبائی حکومتوں کے اہم اختیارات کی منتقلی کے حوالے سے ہمیں ڈسٹرکٹ گورنمنٹس کے بجائے ریجنل گورنمنٹس (Regional Governments) کی ضرورت تھی جن کا دائرہ کار ضلع سے یقیناً زیادہ وسیع ہو سکتا تھا۔ہمارے ہر صوبے میں تمدنی تنوں اور انتظامی پھیلاؤ کی بنا پر ریجن (Region) کا قیام ایک فطری امر تھا۔یہ ایک ایسی اکائی تھی جس کے گرد مناسب انتظامی اور سیاسی ڈھانچہ قائم کیا جا سکتا تھا۔اس حوالے سے صوبوں کے مابین بڑھتے ہوئے اقتصادی بُعد اور شکر رنجیوں کو بھی دور کیا جا سکتا تھا۔ان ریجن میں ریجنل سروسز کا قیام بھی عمل میں آ سکتا تھا۔سرکاری محکموں میں ڈاکٹروں،لیکچراروں اور دوسرے اہم شعبوں میں کلیدی بھرتیاں ان ریجن کی بنیاد پر کی جا سکتی تھی

جس کی بنا پر یہ اعتراض بھی دور کیا جا سکتا تھا کہ دُور افتادہ علاقے مناسب نمائندگی سے محروم چلے آ رہے تھے۔

نئے نظام کے داعیوں کے ذہن میں یہ بات بھی نہیں آ رہی تھی کہ نچلی سطح پر گورننس سے متعلقہ امور کا تعلق مقامی اور خصوصی قوانین (Local and Special Laws) کے مؤثر نفاذ میں تھا۔ ان قوانین پر عملدرآمد کے لیے ہمہ وقتی ادارے اور ضلع میں ایک مؤثر ایجنسی کی ضرورت تھی۔ ہمارے ہاں نوے فی صد سے زائد شہریوں کا انہی مسائل سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ ناجائز تجاوزات، تعمیرات کے قواعد و ضوابط، اجناس خوردنی میں ملاوٹ، گرانی فروشی، دیہی علاقوں میں سرکاری کٹڑی اور پانی کا اخفا، صفائی اور ستھرائی کے قواعد وضوابط یہ تھے روزمرہ کے مسائل، شہر سے باہر نکل جائیں، دیہاتوں میں کوکا کولا اور سیون اپ کی فیکٹریاں کھلی تھیں۔ جعلی مشروف تیار ہو رہے تھے۔ سمجھ نہ آتی کس کے پاس جائیں کہاں سے تادیبی کارروائی ہو، پولیس سے گلہ بے جا تھا۔ اہلکار بے چارہ تو چوبیس گھنٹے بھی بھاگم دوڑ میں تھا۔ وہ تو وردی میں ملبوس ہی بستر پر دراز ہو جاتا۔ نجانے کب افتاد آن پڑے اور اُسے جائے واردات کی طرف بھاگنا پڑ جائے۔ اس کا مسئلہ تو قاتل اور مفرور کے پیچھے بھاگنا تھا۔ گٹڑ کا ڈھکن تلاش کرنا نہیں تھا۔ وہ اہم جرائم (Hardlore) سے نبٹنا چاہتا تھا۔ اُبلتے گٹر بند کرانے کے لیے اُس کے پاس وقت نہ تھا اور نہ ہی یہ اُس کی تربیت کا خاصا تھا۔

نئے نظام کے داعی بھری محفل میں خاموش انقلاب (Silent Revolution) کا دعویٰ کرتے۔ وہ بھولے بیٹھے تھے کہ انقلاب طنطنے سے آتا ہے، گلیوں بازاروں، کھیتوں کھلیانوں سے جنم لیتا ہے۔ سول لائنز، سول سیکرٹریٹ اور محفوظ علاقوں (Out of toward) سے سر نہیں اُٹھاتا۔ انقلاب ہنگام سے آتا ہے، خاموشی سے نہیں! خاموشی سے تو سازش جنم لیتی ہے!

.....

پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں اہم منصب کے پیشِ نظر میرا صوبے بھر میں دور دراز علاقوں میں دوروں پر اکثر جانا رہتا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان، وزیرستان سے لے کر دیر، سوات اور چترال تک کئی اہم ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد ہو رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے پروجیکٹ ایسے بھی تھے جو غیر ملکی امداد اور ڈونر (Donor) ایجنسیوں کے تعاون سے جاری تھے۔ ان منصوبوں کے لئے اگرچہ پروجیکٹ ڈائریکٹر تعینات تھے جنہیں جملہ اختیارات حاصل تھے لیکن صوبائی سطح پر سٹرلنگ کمیٹی بھی قائم تھی جس کی سربراہی میرے سپرد تھی۔ اس کمیٹی میں پالیسی امور کے بارے اہم فیصلے کئے جاتے۔ اس میں غیر ملکی امدادی اداروں کے نمائندوں کی مشاورت بھی شامل تھی۔ اُن دنوں پوست کی کاشت کی حوصلہ شکنی کے لیے مختلف اقدامات پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔ افغانستان میں طالبان حکومت نے پوست کی کاشت پر مکمل پابندی لگا رکھی تھی۔ پاکستانی قبائلی علاقوں میں بھی ایسی ہی حکمت عملی اپنائی جا رہی تھی۔ باہم گفت وشنید، جرگے کے تعاون اور اگر ضروری ہو تو طاقت کے استعمال سے اس فصل کی نہ صرف حوصلہ شکنی کی جا رہی تھی بلکہ اسے فی الفور تلف بھی کر دیا جاتا۔ کاشت کاروں کو یوں بے یارومددگار چھوڑنا بھی مناسب نہ تھا۔ متاثرہ افراد کے لیے متبادل روزگار کا اہتمام بھی کیا جا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں قبائلی ایجنسیوں میں کئی ترقیاتی منصوبے جاری تھے جن میں روزگار کی فراہمی کو اولین ترجیح دی جا رہی تھی، کئی بیرونی ایجنسیاں جن میں یو ایس ایڈ (US Aid)، ایشین ڈویلپمنٹ بینک (ADB) اور ایفاڈ (IFAD) پیش پیش تھیں.....

(جاری ہے)

◆◆◆

ڈائری

سنگریزے اور جواہر

غلام الثقلین نقوی

میر انیس کا ایک شعر ؎

کریم! جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں، پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

.....

28 فروری 96ء

غالب کا ایک شعر

میں اپنی پوتی عقیلہ زینب نقوی جماعت ہفتم کو غیر ملکی انگریزی نصاب کا ایک سبق پڑھا رہا تھا جس کا عنوان ہے (Rapids) اس میں ایک ترکیب آئی (Pulverized water) عنوان اور ترکیب دونوں کے معنی ڈکشنری سے تلاش کرنے پڑے۔

(Rapids) کے معنی ہیں ڈھلوان۔ پہاڑی ندی جب اچانک نشیب میں تیزی سے گرتی ہے تو ایک آبشار کا سا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ جب پانی چٹان سے ٹکراتا ہے تو وہ قطروں میں بٹ جاتا ہے۔ اسے مصنف نے (Pulverized Water) کہا ہے۔ اس سے میرا ذہن غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی طرف منتقل ہو گیا۔

قطرۂ مے از بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا　　خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اصل میں ہوا یہ کہ تلازمۂ خیالات کی گاری کئی اسٹیشنوں پر ٹھہرے بغیر سرعت سے گزر گئی۔ ایک اسٹیشن جہاں اسے پہلے ٹھہرنا تھا، بعد میں میرے ذہن میں آیا۔ چنانچہ گاڑی کو پیچھے آنا پڑا۔

اقبال نے ''فلسفۂ غم'' میں ڈھلوان پر آبشار بناتی ہوئی پہاڑی ندی کا جو منظر کھینچا ہے، وہ مندرجہ بالا انگریزی لفظ اور ترکیب پر نہایت موزوں طور پر منطبق ہوتا ہے۔

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی　　آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رُخسارِ نور　　گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے　　یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی　　مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

میں نے اس بند کے آخر کے اشعار نقل نہیں کیے کیونکہ ان کے اندر چھپے ہوئے فلسفیانہ نکتے کی گرہ کشائی مقصود نہ تھی۔

غالب کے شعر میں یہی منظر Miniature مصّوری کی صورت میں پیش ہوا ہے۔ شراب کے پیمانے میں پیگ (peg) کے خط لگے ہوے ہیں۔ کئی شیشے کے گلاس ایسے ہوتے ہیں جن میں مدوری خطوط لگے ہوتے ہیں۔ غالب کے مشاہدے کی باریکی اور لطافت ملاحظہ ہو کہ شراب کا ایک قطرہ دائرے کے اس محیط پر آ ٹکا اور پھر ٹوٹ گیا۔ ٹوٹ کر بھی وہ ناپید نہیں ہوا بلکہ ''رشتۂ گوہر'' بن گیا یعنی موتیوں کی مالا، گویا قطرے نے اپنے ''وجود'' کو بکھیرا ضرور لیکن مٹنے نہیں دیا۔ یہ گویا اس کی ''نفس پروری'' ہے یعنی ''حفظِ خودی''۔ سارے شعر میں ''حیرت'' کا ایک ایسا لفظ ہے جس کی شعر میں موجودگی میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ سالک اپنے روحانی سفر میں ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے جسے ''منزلِ حیرت'' کہتے ہیں۔ ممکن ہے غالب کی مراد اسی منزل سے ہو کہ جہاں وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اقبال کی 'جوئے کوہسار' پھٹ کر پریشان ضرور ہوتی ہے لیکن دو قدم پر جا کر پھر اپنے 'وجود' کو پا لیتی ہے۔ ''خودی'' کی حفاظت کا تصور یہاں بھی موجود ہے۔

.....

12/مارچ 1996ء

کل رات بارہ بجے عمر عزیز کے تہتر سال بیت گئے! یہ کوئی ایسا واقعہ یا سانحہ یا حادثہ نہیں کہ جس کی گونج کسی اور نے سنی ہو۔ ایک کنکر بحرِ ناپیدا کنار میں گرا اور گم ہو گیا۔ اس کی آواز میں نے بھی نہ سنی۔

اس سال کوئی بڑا یا چھوٹا کارنامہ مجھ سے سرانجام نہ ہو سکا۔ دو چار مضمون لکھے۔ ماہنامہ ''محفل'' نے میرا خاص نمبر شائع کیا جس میں ''تنکے تنکے'' کے عنوان سے اپنی آپ بیتی لکھی۔ محمد خاں کلیم مدیر ''محفل'' اور میرے دیرینہ دوست ہیں، ان کے اصرار پر اسے جاری رکھا۔ یوں میری زندگی میں کوئی ایسا معرکہ بھی نہیں کہ جسے ریکارڈ کرنا ضروری ہوتا لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ قلم اور کاغذ کا رابطہ قائم رہا اور چل رہا ہے۔

مجھے امید نہیں تھی کہ میں اتنی لمبی عمر پاؤں گا اور نہ اتنی عمر کی خواہش تھی۔ میرے والد محترم تہتر سال پورے کرنے سے پہلے پہلے چل بسے۔ میری عمر جوں جوں لمبی ہو رہی ہے، میری تشویش بڑھ رہی ہے۔ لمبی عمر اچھی نہیں ہوتی، فی الحال بقدرِ ضرورت صحت ٹھیک ہے۔ چل پھر لیتا ہوں۔ مالی طور پر بھی کوئی فکر نہیں۔ اولاد خدمت گذار ہے لیکن ایک بیٹا صغیر الحسن ذہنی مریض ہے اور اس کی طرف سے کبھی کوئی خوشی کی خبر نہیں ملتی۔ جوں جوں رشتوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے، تفکرات بھی بڑھ رہے ہیں۔ کوئی بیٹا کسی مسئلے کی وجہ سے پریشان ہو تو میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں؟

میں نے اپنی والدہ کی لمبی عمر دیکھی ہے۔ ان کے آخری دو سال مکمل معذوری کے عالم میں گزرے۔ ان کی دیکھ بھال کیلئے ایک آدمی کو رات بھر جاگنا پڑتا تھا۔ یہ فریضہ میں اپنے بڑھاپے کی وجہ سے ادا نہ کر سکا اور گنہگار رہا۔ میں نہیں چاہتا کہ عمر کے اس نقطے پر پہنچ کر اپنی اولاد کے لئے امتحان و آزمائش کا باعث بنوں۔

اس لئے میں ہر نماز میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے چلتے پھرتے اپنی طرف اٹھا لے۔ اس کی طرف سے زندگی بھی نعمت

ہے اور موت بھی۔ دعا ہے کہ وہ آخری منزل کو میرے لئے آسان فرمائے۔

پاکستان کے حالات مائل بہ زوال نظر آتے ہیں۔ کرپشن بہت بڑھ گئی ہے۔ حکومت عوام کی تعلیم و تربیت سے غافل ہے۔ مولوی اور استاد بھی ہوس زر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ مدرسوں، مکتبوں، سکولوں اور کالجوں میں استاد 'ڈیڈی کیشن' سے محروم ہو گیا ہے۔ غریب کیلئے سکول کم ہیں اور جو ہیں وہاں کا استاد انہیں پڑھاتا نہیں۔ مولوی باہر سے پیسہ لیتے ہیں اور تعصّب کا زہر بچوں کو منتقل کرتے ہیں۔

پاک بھارت جنگ کا بھی خطرہ ہے۔ جس قوم کے زعما ہر قسم کی کرپشن میں مبتلا ہوں، ان سے امید نہیں کہ وہ جنگ بھی لڑ سکیں۔ انہیں دونوں ورلڈ کپ کے کوارٹر فائنل میں پاکستان اپنی ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے بھارت سے ہار گیا ہے۔ قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو اس کا ملال ہوا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ٹیم کا کپتان وسیم اکرم اس لئے نہ کھیلا کہ اس نے دبئی کے ایک بک میکر سے ایک کروڑ کی رشوت لی ہوئی تھی۔ ماننے کو جی نہیں چاہتا لیکن نہ ماننے کا بھی کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

چوہترویں سال کے آغاز پر مجھے کوئی خاص یا عام خوشی نہیں، صرف اتنی خوشی ہے کہ بیٹوں، بہوؤں، بیٹی، پوتوں، پوتیوں اور دوہتوں، بھائیوں اور بہنوں اور دوستوں سے ملاقات کا موقع ملتا رہے گا اور اس دید و وادید کو میں غنیمت سمجھ کر قبول کرتا ہوں۔ اللہ بہتر جانتا ہے اور بہتر کرے گا۔ آمین!

◆◆◆

ممتاز افسانہ نگار معین کمال کی کتاب

وہ اور مَیں

شائع ہو گئی ہے

رابطہ

جبران اشاعت گھر

102۔ عائشہ منزل، گوالامین نمبر 3، نزد مسجد مقدس، اُردو بازار، کراچی (پاکستان)

فون: 021-3541804 موبائل: 034-538945865

طنزومزاح

جشنِ آزادی

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

جس طرح غریب ملکوں میں شادی کے بعد بچے کا انتظار کیا جاتا ہے اسی طرح امیر ملکوں میں نکاح اور رخصتی سے فارغ ہوکر دونوں خاندان آس لگاتے ہیں کہ کب طلاق ہوتی ہے۔اس میں کچھ زیادہ دیر بھی نہیں ہوتی۔بس یوں سمجھیے کہ چٹ منگنی، پٹ بیاہ اور جھٹ طلاق! ہمارے یہاں دلہن کی گود ''آل'' سے بھرتی ہے، وہاں اس مال سے بھرتی ہے جو طلاق کی صورت میں پکے پکائے پھل کی مانند اس کی گود میں آ گرتا ہے۔

مالدار ملکوں میں شادی اور طلاق عام زندگی کے دو پہلو ہیں.....فرق صرف اتنا ہے کہ طلاق روشن پہلو ہے جو فریقین کو دلاسا دیتا ہے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔انسان کو جب بھی ہوش آئے، اسے چاہیے کہ اپنی غلطی کی تلافی کر لے اور پائیدار فلاح کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ایک نامور انگریز ادیب نے لکھا ''میری بیوی اور میرے درمیان یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ ہم کسی جزیرے پر دو ہفتے کی چھٹیاں منائیں یا طلاق لے لیں؟'' بہت غور وخوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جزیرے کی تفریح تو محض دو ہفتے میں ختم ہو جائے گی اس کے بعد پھر وہی شام غم اور صبح الم! کیوں نہ ہم طلاق کی دائمی برکات حاصل کر لیں؟ پس انہوں نے مہذّب لوگوں کا راستہ اپنایا اور اپنے لیے ''ثوابِ جاریہ'' کا اہتمام کر لیا۔

ہمارے یہاں کوئی شادی ناکام ہو جاتی ہے تو دونوں فریق اپنے طور پر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ؎ ''زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا۔''

جبکہ وہاں ناکام شادی کی اہمیت کامیاب شادی سے کہیں زیادہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک پارٹی حصول دولت پر خوش ہوتی ہے اور دوسری حصول آزادی پر۔ہم جیسے تنگ نظر، طلاق کو ایک حادثہ تصوّر کرتے ہیں، ان جیسے وسیع القلب لوگوں کے نزدیک یہ ایک تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔بقول ایک رئیس امریکی ''انسان کو اپنی زندگی کا سب سے زیادہ پرمسرّت لمحہ پہلی طلاق کے بعد نصیب ہوتا ہے۔'' البتہ کبھی کبھار طلاق بھی ناکام ہو جاتی ہے اور اجنبی پھر سے آشنا ہو جاتے ہیں کہ آنجہانیہ ایلزبیتھ ٹیلر کے ساتھ کئی بار ایسا ہی ہوا۔ان ممالک میں بدترین طلاق وہ ہے جو پُرامن طور پر واقع ہو جائے اور وکیل کے ہاتھ کچھ نہ لگے۔بہت سے وکلا طلاق کے مقدمے سے اپنی شادی کے اخراجات نکالتے ہیں۔پھر طلاق کے کسی اگلے کیس سے خود اپنی طلاق کا خاطر خواہ بندوبست کرتے ہیں۔

عام مقدمات میں ایک پارٹی جیتتی ہے، دوسری ہارتی ہے۔طلاق میں دونوں کی جیت ہوتی ہے۔عدالتی فیصلہ عموماً مرد کے خلاف

ہوتا ہے لیکن فیصلے کی کاپی وصول کر کے وہ خوشی سے جھومتے ہوئے کہتا ہے ۔ ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔''

وجہ اس واقعے میں تلاش کیجیے۔لندن میں ایک شخص نے اپنے علاقے کے پادری سے مشورہ کیا کہ وہ کس طرح اپنی بیوی سے چھٹکارا پائے۔ پادری نے حیرانی سے کہا''تم اتنی اچھی بیوی کو طلاق دینا چاہتے ہو؟ وہ حسین ہے، ذہین ہے، سلیقہ شعار ہے، خوش اطوار ہے۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''اس شخص نے اپنا جوتا اتار کر پادری کے سامنے کرتے ہوئے جواب دیا۔

''فادر، آپ اس جوتے کو دیکھ رہے ہیں؟ یہ خوبصورت ہے، مضبوط ہے، چمک دار ہے، کم وزن ہے..... ہے نا؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے'' پادری کو تسلیم کرنا پڑا۔

اس شخص نے جوتا واپس پہنتے ہوئے پادری کو مخاطب کیا''ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ بات صرف میں جانتا ہوں کہ یہ مجھے بری طرح کاٹتا ہے۔''

تاہم ایسے سمجھ دار، من پسند، صابر اور باظرف لوگوں کی کمی نہیں جو ازدواجی تعلقات میں ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ایک جوڑا جنوبے کی پیٹے میں تھا طلاق کے لیے جج کے روبرو حاضر ہوا۔عورت نے گریہ کی۔

''حضور، یہ شخص راتوں کو گھر سے باہر رہتا ہے، میرے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے، پکا جواری اور دھوکے باز ہے۔میرا اب اس کے ساتھ گزارا نہیں ہوسکتا۔''

جج نے بڑے میاں کی طرف دیکھا تو موصوف منمنائے''جناب والا، یہ عورت بدزبان، بدسلیقہ، کام چور اور خرچیلی ہے۔ میں اب اس کے ساتھ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔''

''یہ معاملات کب سے بگڑے ہوئے ہیں؟''جج صاحب انگشت بدنداں تھے۔

دونوں بیک زبان پکار اٹھے''تقریباً 70 سال سے۔''

''تو آپ کو اب طلاق کا خیال آیا ہے؟''جج نے سوال کیا''آپ لوگ کس بات کا انتظار کرتے رہے؟''

''اپنے بچوں کے انتقال کا''

کچھ اذیت پسند خواتین مردوں کے خلاف طلاق کا ہتھیار استعمال کرنے سے مصلحتاً گریز کرتی ہیں۔ایک محترمہ اپنی دوست سے شوہر کے غیر انسانی رویے کی شکایت کر رہی تھیں۔دوست نے ان سے پوچھا۔

''تم اس ظالم شخص سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''خاتون نے جھٹ پینترا بدلا''وہ دس سال سے میرے اعصاب پر سوار ہے اور میں طلاق لے کر اسے سکھ چین کی زندگی گزارنے دوں؟''

جتنی کسی ملک کی اقتصادی حالت مضبوط ہوگی، طلاق کا ادارہ بھی اتنا ہی مستحکم ہوگا۔اب تو یہ نوبت آ گئی ہے کہ جیسے ہمارے ہاں ''شادی ہال'' ہوتے ہیں وہاں طلاق کے ہال قائم ہو رہے ہیں، جن میں''عقد شکنی'' کی باقاعدہ تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔اس منافع بخش کاروبار کا خیال جاپان کے ایک جودت پسند تاجر کے ذہن میں آیا۔اس نے ٹوکیو میں پہلا''طلاق محل'' کھولا ہے جس میں عقد کشائی کی شایانِ شان تقریبات ہوتی ہیں۔اس پُرمسرّت موقع پر بھی دونوں جانب کے مہمان مدعو ہوتے ہیں جو اپنی دعاؤں کے سائے میں شادی

شدہ جوڑوں کو ایک دوسرے کے چنگل سے نکلتا دیکھ کر خوشیاں مناتے ہیں۔تقریب کا اہم ترین حصہ وہ ہوتا ہے جس میں منگنی کی انگوٹھی توڑی جاتی ہے اور ہر طرف سے مبارک، مبارک کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔تالیوں کی گونج میں شادی کی آخری نشانی کو نیست و نابود کر دینے کے بعد پر تکلّف عشائیہ اور بعد ازاں محفل رقص و سرود منعقد ہوتی ہے۔

جاپان کی سماجی و اقتصادی ترقی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ 2008ء میں وہاں 2 لاکھ 51 ہزار طلاقیں ہوئی تھیں جن کی تعداد 2009ء میں بڑھ کر 2 لاکھ 53 ہزار تک پہنچ گئی۔گویا لوگوں کا شعور پختہ ہوتا جا رہا ہے۔''طلاق محل'' کے مالک کا کہنا ہے۔

''یہ معاشرتی زندگی کی ترقی کے لیے ایک خوش آیند علامت ہے کہ اب لوگ باگ جبر کے عالم سے باہر نکل کر اپنے تمام معاملات میں خود مختار ہوں گے۔میں نے انہیں ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر دیا ہے جو ان خوشگوار لمحات کو یادگار اور ناقابل فراموش بنا رہا ہے۔''

اب وہ اپنے کاروبار کو جاپان کے دوسرے شہروں کے علاوہ جنوبی کوریا اور دیگر پڑوسی ممالک میں بھی وسعت دے رہا ہے کیونکہ طلاق جماہی کی طرح پھیلتی ہے۔

مہمانوں کے لیے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ وہ ''نو مطلقہ'' جوڑے کو تحفہ دینے کی بجائے محض ''یوم آزادی'' کی مبارک باد اور اس دعا پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ ایسی بابرکت گھڑیاں ہر شادی شدہ کے حصے میں آئیں۔جاپان میں طلاق کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر اس نعمت کے متلاشی افراد کو مطلوبہ تاریخوں میں ''طلاق محل'' کی بکنگ میں دقت پیش آ رہی ہے۔لہٰذا ہو سکتا ہے کہ آیندہ دور اندیش قسم کے لوگ بطور حفظ ماتقدم شادی کے موقع ہی پر طلاق کی ممکنہ تاریخ کی ایڈوانس بکنگ کرانے لگیں تا کہ ایک کارِ خیر بروقت پائے تکمیل کو پہنچ سکے۔

نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔

◆◆◆

اکادمی ادبیات پاکستان کے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے کی ایک کتاب

ڈاکٹر انور سدید ـــــ شخصیت اور فن

شائع ہو گئی ہے

مصنف : پروفیسر سجاد نقوی

ضخامت : چار سو صفحات سے زائد

ملنے کا پتہ : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/I، اسلام آباد

پرانی اور نئی گاڑیاں

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

ہمارا مشورہ مفت ہے؟ لیکن قیمتی ہے، سنیے!

''یا تو بندہ موٹر مکینک کا کورس کر لے یا پھر کوئی پرانی سی کار خرید لے تو یوں وہ مکینکی سیکھ جائے گا۔''

اس دوسرے عمل میں ذرا سی دیر لگتی ہے مگر جو اس سے سبق سیکھتا ہے وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ پرانی گاڑی خریدتے ہوئے بیچنے والا اس کے جو اوصاف حمیدہ بیان کرتا ہے وہ آہستہ آہستہ ''اوصافِ رنجیدہ'' میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ یوں گاڑی کے ایک ایک نقص کے عیاں ہونے پر اس کے لئے جو قسم قسم کی ''دعائیں'' بے اختیار منہ سے نکلتی ہیں، ان کا ذکر کرنا غیر مناسب ہے کہ کچھ الفاظ غیر پارلیمانی بھی ہو سکتے ہیں''۔

ہم نے جب پہلی مرتبہ ایک پرانی گاڑی لی تو وقت کے ساتھ عقدہ کھلا کہ یہ سیکنڈ ہینڈ نہیں بلکہ اس کو تو کم از کم پانچ ہینڈ لگ چکے ہیں اور ہمارے ساتھ بھی اردو کا ''ہاتھ'' ہو چکا ہے۔ گاڑی کی کمپنی کا نام ہم اس لئے نہیں لے رہے کہ یہ پردہ داری کی بات ہے۔ بس چھوٹی گاڑی کی تعریف یہی سمجھ لیں کہ اس کا ''پیچھا'' یا پشت نہیں ہوتی۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ڈگی نظر نہیں آتی مگر تھوڑی سی ہوتی ضرور ہے۔ باقی خواص کے علاوہ ایک بہت بڑی خاصیّت اس کی کمانی ہوا کرتی تھی مگر ظالموں نے اب وہ سہولت بھی ختم کر دی ہے۔ ظالم ہم نے اس لئے کہا ہے کہ کمانی کے ٹوٹنے سے جو دلکش بظاہر دلخراش آواز آیا کرتی تھی اب گاڑی کے نئے مالکان کو اس سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ کہانی بالی عمریا کی نازک پتلی کمریا کی طرح ہی ہوا کرتی تھی۔ دونوں ''کمرون'' میں ماشاءاللہ اتنی لچک ہوتی کہ منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلتا۔ تاہم حسینہ کی کمریا ہم نے کبھی ٹوٹی ہوئی نہیں دیکھی، چاہے جتنی بھی نازک ہو مگر چھوٹی گاڑی کی کمریا ہم نے جتنی بار ٹوٹی دیکھی وہ ہمیں ہی پتہ ہے۔ جب کبھی ہم آٹھ دس دوستوں کو سیر کرانے لے جاتے اور سڑک پر کوئی جمپ آ جاتا تو اس کی طبیعت پر فوراً ''گراں گزرتا۔ اب آپ جمپ کو سپیڈ بریکر مت خیال کیجئے گا کیوں کہ اکثر ہماری سڑکوں پر سپیڈ بریکر بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ کبھی کوئی کھڈا آ جاتا ہے تو کبھی ناہموار اڈہ آ جاتا ہے۔ یوں سڑکیں ہمیں زندگی کی اونچ نیچ کا پتہ دیتی رہتی ہیں اور یہ کمانی ٹوٹ کر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زندگی میں اپنے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ یہ ٹوٹ جائے اور سفر وہیں پہ ختم ہو جائے۔ پھر ہم نے چھوٹی پرانی سے بڑی پرانی گاڑی لے لی جس میں ڈگی بھی تھی اور اس میں سامان بھی رکھا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر جب ٹائر پنکچر ہو جاتا تھا تو اس کو با آسانی وہاں رکھا جا سکتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں پرانے ٹائروں کے خواص کا بھی علم ہونے لگا تھا اور دوران سفر ہمیں وہ تمام دکانیں یاد ہو گئی تھیں کہ جہاں پنکچر لگوانے کی بہترین سہولت میسر ہوتی تھی۔ اب جیسے ہی پہیوں کا بیلنس خراب ہونے لگتا تو ہمیں احساس ہو جاتا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور کوئی شرارتی کیل یا تو خود سے ٹائر میں آن گھسا ہے یا پھر کسی ٹائر پنکچر والی دکان نے اپنے سے کچھ فاصلہ پہلے یہ کیل بکھیر دیئے ہیں تاکہ گاڑی پنکچر ہو اور اس کا کاروبار چلتا رہے۔ بلکہ کئی دفعہ تو پنکچر والی دکانوں والوں کا

آپس میں بھی جھگڑا ہوا ہے کہ کیل تو میں نے بکھیرے تھے، اس پنکچر لگانے کا حق بھی میرا بنتا ہے۔

آہستہ آہستہ ہمارے سارے کے سارے حواس کام کرنے لگے۔ ہم سامنے والی سڑک اور ٹریفک کو بھی دیکھتے اور سامنے حرارت والی سوئی کو بھی دیکھتے کہ جب بھی ریڈی ایٹر سے پانی لیک ہوتا یہ ظالم اوپر کو اٹھنا شروع ہو جاتی۔ یوں ہمیں ''بونٹ'' سے اٹھنے والے دھویں پہ بھی نظر رکھنی پڑتی جو آسانی سونگھا جا سکتا تھا۔ ہمیں اپنے کان کھلے رکھنے پڑتے کہ کوئی ہارن دے کر یا اونچی آواز سے ہمیں یہ بتائے گا کہ گاڑی کا ٹائر پنکچر ہونے والا ہے بلکہ ہو گیا ہے اور ہمیں معلوم اس لئے نہیں ہو سکا کہ ہم نے گاڑی میں میوزک اونچی آواز سے لگایا ہوا ہے۔ البتہ گاڑی کا تیل پانی یعنی موبل آئیل اور بیٹری کا پانی چیک کرنا تو ہمیں پہلے دن سے آ گیا تھا کہ یہ گاڑی رکھنے کا پہلا سبق ہے گو کہ مستری ہمیں ہمیشہ شرمندہ کرتا کہ جناب ذرا دھیان کیا کریں یہ موبل آئیل اتنا کا لانکل رہا ہے کہ گاڑی کی تمام حصے جو اس سے وابستہ تھے اور اس کی ساری آرزوئیں بھی خاک ہو کر کالی ہو گئی ہیں اور مزید یہ کہ اگر آپ آج نہ آتے تو گاڑی کا انجن سیز یعنی بند ہو جاتا۔

گاڑی کے ریڈی ایٹر کی ''حسنِ کارکردگی'' کا تو ہمیں بہت خوب اندازہ رہا ہے جیسے بوڑھی عمر کے مردوں کا پراسٹیٹ کا عذود بڑھ جائے تو بار بار انہیں مثانہ خالی کرنے کی حاجت ہوتی ہے اس طرح سے ہمارے پرانی گاڑی کے بوڑھے ریڈی ایٹر کی مرمت کے باوجود کارکردگی ایسی ہی تھی اور ہر دس کلومیٹر بعد اس کا مثانہ بھرنا پڑتا تھا تب وہ چلنے کے قابل ہوتا مگر پھر لیک کر جاتا۔ تاہم ہم نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیل ہوئی تھیں اور ہم پانی کا ایک چھوٹے قد کا ڈرم ڈگی میں رکھ لیتے تھے تا کہ بوقت ضرورت (جو ہر وقت پڑتی تھی) کام آئے۔

پرانی گاڑی کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شہر کے سارے مستریوں کو یہ پرکھنے کا موقعہ ملنے لگا کہ کوئی کتنا ایماندار ہے۔ جونہی ہم مستری تبدیل کرتے وہ ہمیں گاڑی کے پچھلے مستری کی خصوصی صلاحیتوں اور چالاکیوں کے بارے میں آگاہ کرتا۔ جب کہ نئے کو چھوڑ کر نئے نویلے کے پاس جاتے تو وہ نئے کی خفیہ صلاحیتوں کے بارے میں آگاہ کرتا۔ اسی طرح سے جب ہم غلطی سے (اور اپنی مصروفیات کی وجہ سے یہ غلطی ہم اکثر دہراتے) کسی ڈرائیور کو گاڑی ٹھیک کروانے بھیجتے تو بیان کردہ نقص تو دور کروا آتا لیکن گاڑی میں موجود دیگر ہزاروں نقائص کی نشاندہی بھی کرتا جو اس کی محبتانہ کوشش سے دور ہو سکتے تھے۔ کبھی کبھی ہم کسی صاحب کو گاڑی کا ایک پرزہ ٹھیک کروانے کو بھیجتے تو وہ گاڑی ورکشاپ میں ہی کھڑی کر کے کوئی دوسرا پرزہ ہاتھ میں لئے منہ لٹکائے آتا اور یہ خوشخبری سناتا کہ اگر یہ پرزہ بھی مرمت کروالیا جائے یا اس کی جگہ کوئی نیا سستا کابلی پرزہ ڈال دیا جائے تو گاڑی جو چلتے ہو کے احتجاج کرتی ہے اس کا علاج نہایت سستے داموں ممکن ہے۔

اب پرانی گاڑیوں کی سب خوبیاں بیان کرنے لگیں تو اس کے لئے ایک موٹی سی کتاب لکھنا پڑے گی تاہم فی الحال ہم نے ان سب خوبیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اور پرانی گاڑیوں کے تجربے کو اپنے سینے میں دفن کرتے ہوئے ایک عدد نئی گاڑی خرید لی ہے لیکن یقین ہے پرانے تجربے کا فائدہ ضرور ہوا ہے جو رہتے دم تک ہماری مدد کرتا رہے گا۔

پرانی گاڑیوں کے تجربے اور نئی گاڑی کی سہولت کا انتخابات سے بالکل تعلق نہیں ہے پھر کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ جسے پرانے وقتوں کا تجربہ نہ ہو وہ بھلا آگے کیسے چلے گا۔ نئی گاڑی کے حامی کہتے ہیں کہ اس سکون سے بھی آگاہی ضروری ہے جو نئی چیز خریدنے سے ملتا ہے۔ پرانی طرز کے لوگ کہتے ہیں تجربہ کار لوگوں کی حمایت کرو۔ نئی نسل کہتی ہے نئے لوگوں کو آزما کر دیکھو۔ پرانے کہتے ہیں کہ تجربہ ہی سب کچھ ہے۔ نئے کہتے ہیں ہم نے دیکھ لیا ہے تجربے کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ پرانے یہ بھی کہتے ہیں گاڑی خراب ہو گئی تو نئے بندے کو تو نقص کا پتہ ہی نہیں چلے گا، نئے کہتے ہیں ہم میں عقل ہے ہم نقص پڑنے ہی نہیں دیں گے۔ دونوں ہمیں کنفیوز کرنے کی کوشش کر رہے اور ہم سنبھلنے کی.....

◆◆◆

جائزے

شاہ دولہ کا چوہا

مامون ایمن (نیویارک)

''شاہ دولہ کا چوہا'' کیفیت سازی اور منظر نگاری سے معمور زبان اور بیان کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں استعمال ہونے والی بیشتر اساسی الفاظ کا اشاراتی متون عام نہیں۔ ساقی فاروقی یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ معاشرے کیلئے جنگ کر رہا ہے۔ ہمیشہ جاری رہنے والی اس جنگ کا تماشائی بن کر بیٹھنا اور تماشے میں شامل نہ ہونا اس کے اختیار میں نہیں۔ اس کے نزدیک ''ذہنی بیداری ایک طرح کا جبر ہے'' منطقی طور پر، ذہنی بیداری کو جبر نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں ذہنی نیند جبر کی رہین ہو سکتی ہے۔ نیز، ساقی کا یہ اعلان بھی پوری طرح درست ثابت نظر نہیں آتا کہ عوام سے گفتگو کے لیے فنکار کا میلان طبع بائیں بازو کی جانب ہونا ضروری ہے۔ دائیں بازو کا میلان طبع رکھنے والے فنکار بھی عوام سے گفتگو کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ ہاں، اس کے اس خیال سے پوری طرح اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ خدا کا معاملہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اس ذاتی معاملہ سے کٹ کر بھی عوام سے گفتگو کی جا سکتی ہے، نباتات و حیوانات سے محبت کی جا سکتی ہے اور اس دنیا کو خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کو خوب صورت رکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں، ساقی کی حیثیت مجرد نہیں۔ اپنے افکار اور تخلیقات کے باعث وہ معاشرہ کے عام افراد سے زیادہ فعال ضرور ہے۔ اس کی آواز تخریب اور تعمیر اپنانے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ آواز ''تعمیر و تخریب'' اور ''تخریب و تعمیر'' کی ایک ازلی روش کا احاطہ کرتے ہوئے، حال کی ضروریات کی جانب اس طرح نشان دہی کرتی ہے کہ مستقبل بھی کارہائے زیاں سے محفوظ رہے۔ یہ سعی فطرت کا توازن برقرار رکھنے کی تمنائی ہے۔ عالمی طور پر، یہ سعی عام نہیں کہ ہر فرد اس آواز سے واقف نہیں، یا وہ اس آواز میں پنہاں پیام کی اہمیت سے آگاہ نہیں، یا وہ اپنی ذاتی ضروریات اور معاشرتی مسائل کے باعث اس پیام کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہے۔ یہ مجبوری بہر حال ایسی مجبوری ہے جسے حل کرنے کیلئے مزید آگاہی اور علم کی فراہمی ضروری ہے۔ فرد کو تحفظِ حیات کے لئے تخریبی اعمال کو بھی تعمیری اعمال کے سانچوں میں ڈھالنے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ یہ امر ناممکن تو نہیں، مشکل اور دِقّت طلب ضرور ہے۔

آج ''گلوبل وارننگ'' اور ''گرین ورلڈ'' ایسے الفاظ سنائی دینے لگے ہیں ہر جگہ نہ سہی، کہیں کہیں ہی سہی۔ لفظ ''گرین'' کے حوالے سے ساقی اپنے پیام کو پارسا بنانے کے لئے ''ہرا پانی، ہرا ٹب، سبز پانی، سبز مٹی، سبز دروازہ، سبز آنکھیں'' ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک اختراعی ترکیب ''سبز حیرت'' بھی پیش کرتا ہے۔ الفاظ کے ضمن میں ''نیلا زہر، مٹیالے تالاب، گنجی پہاڑی، منحوس کنواں'' روایت سے جڑے ہیں۔ دوسری جانب ''مردہ پانی، ہوا کا دوشالہ، ہجرت کے ٹوٹے پر''.....اختراعات ہیں۔ لفظیات کے باب میں ''بساند، نتھنے، کھردری، گینتیوں، باسی، جھاگ، کسیلا، جوتا، کولہوں'' کا شعر میں استعمال عام نہیں۔ پوربی زبان میں ''اکھوا، چکوا، ڈھنڈیا'' عام بول چال میں شامل ہیں۔ اضافتی تراکیب کے ضمن میں، ساقی روایت کا سہارا لیتا ہے، مثلاً ''متاعِ جسم بندۂ مومن، دریائے خوں، بارِ گراں، حجلۂ ملال، خیمۂ خیال، زینۂ پیچاں، کلبۂ نسیاں'' اس کا ذہن نئی اضافتی تراکیب بھی تراشتا ہے۔ ''ہوائے خوش خبر، عمر کج روش، نوید سنگ، پیوندِ غم'' وغیرہ۔ بعض مفرد الفاظ ''لغت گردانی'' کی دعوت دیتے ہیں مثلاً ''منتقم، کمپا، ساعد، درانا'' اس مجموعہ میں، ماحول کے حوالے

سے الفاظ کی ایک لمبی قطار ہے۔ حیوانات اور کیڑوں مکوڑوں کے ضمن میں ''کتا، بلا، سانپ، شیر، زیبرا، خرگوش، ہاتھی، کچھوا، کیچوؤں، گونگھا، جھینگر، مکڑا، چھپکلی، جیلی فش، تتلیاں، کے نام شامل ہیں۔ املا اور استعمال کے ضمن میں یہ الفاظ ساقی کی نظر ثانی چاہتے ہیں۔ ''تیریزا، غصب، رائگاں، اندھی سڑک، قالین، شائستہ، غبارے، رودغم، ہم جلیس، اک پانی کا سانپ''۔

اس مجموعہ میں بیشتر نظمیں قوانی اور بحور کی پابند نہیں۔ چند نظمیں با قاعدہ بحروں میں ہیں لیکن غیر مقفّہ، ان غیر مقفہ نظموں کا عروضی جائزہ یوں لیا جا سکتا ہے'' (ناچتی ہے رات کی نیلم پری/ فاع لاتن، فاع لاتن، فاع لن/ بحر رمل مسدس سالم محذوف/ ایک جنسی تجربہ، صفحہ 23)''۔ ''(وہ جسم سہمے ہوئے بندمرتبانوں میں/م فاع لن، ف ع لاتن، م فاع لن، فعلن/ بحر مجتث مثمن مجنون محذوف/ مردہ خانہ، صفحہ 24)''، ''(اوس کی گرد سے نجات ملی/ فاع لتن، م فاع لن، ف ع لن/ بحر خفیف مسدس مخبون مشعث محذوف/ صبح، صفحہ 55)''۔ ''(ایک لڑکی چال میں دیوانگی/ فاع لاتن م، فاع لاتن، فاع لن/ بحر رمل مسدس سالم محذوف/ جنگ، صفحہ 71)''۔ نظم ''زندہ سچا پانی، صفحہ 21'' (جس میں ناخن گاڑ دیئے ہیں اب اک آبی جھاڑی نے/فعلن، فعلن، فعل، فعولن، فعلن، فعلن، فعلن، فع)'' بحر متقارب شانزدہ (سولہ رکنی) ہے۔ اس نظم کے بعض مصرعے غور طلب ہیں۔ ایک اور نظم ''مستانہ ہیجڑا'' صفحہ 30۔32'' بحر مضارع مربع اخرب اسالم میں ہے'' (مولا تری گلی میں/مفعول، فاع لاتن)'' ساقی نے اس نظم کے پہلے پانچ مصرعے اسی بحر میں رکھے لیکن بعد والے چند مصرعوں کو توڑ توڑ کر لکھا، مثلاً'' (ٹینس کے بال/کستی انگیا میں/کس کسا کے)'' انہی مصرعوں کو ایسے لکھ کر وزن کی پابندی کی جا سکتی تھی'' (ٹینس کے بال کستی / انگیا میں کس کسا کے)'' یاد رہے کہ اس نظم کے بیشتر مصرعوں میں وزن کی پابندی نباہی گئی ہے۔ بہر حال ساقی کے پاس توڑے جانے والے مصرعوں کا کوئی معقول جواز تو ہوگا۔ توڑے جانے والے مصرعے غنائیت کی راہ سے کٹ جاتے ہیں۔ اسی مجموعہ میں نظم ''انہدام'' صفحہ ۲۶، میں پانچ اشعار ہیں۔ اس نظم کا ہر مصرع ایک ہی بحر میں ہے یعنی اس میں کوئی مصرع توڑا نہیں گیا، مثلاً!'' (تو کنار بحر کی وہ چٹان ہے جسے/ فاع لن، م فاع لن، فاع لن، م فاع لن/ بحر ہزج مثمن اشتر مقبوض مقبوض مخنق مقبوض)'' بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں مختلف بحریں ایک ساتھ استعمال کی گئی ہیں۔ ان نظموں میں غنائیت رستے بدلتی نظر آتی ہے۔ یہ عمل ساقی کے سیمابی مزاج کا ایک انداز ہے۔

شعر کو شاعر سے اور شاعر کو شعر سے جدا کرنا ایک مشکل امر ہے۔ مجوزہ باہمی رشتہ کہیں عیاں اور کہیں نہاں نظر آتا ہے۔ اس کتاب میں یہ رشتہ موجود ہے، مثلاً'' ایک ذی روح اپنی آواز سے جل سکتا ہے' اس کے شعلہ گر پنجوں میں جان نہیں، اس کے سینے میں نخوت کے پھول کھلے ہیں، موت کی تیز خوشبو نے اسے پاگل کیا ہے، وہ شاید ضمیر عالم کے تنگ مقبرے میں گڑا ہے، وہ پہاڑی کو کسی دیوہیکل فرشتے کا جوتا گردانتا ہے، وہ سمندر میں آگ دیکھتا ہے اور پیاسا رہتا ہے، وہ کسی کی تنہائی سے اپنی تنہائی ملانا چاہتا ہے، وہ یادوں کی ساری شمعیں بجھا کر خوابوں میں چل رہا ہے، وہ جنگل میں کمبل ڈال کے پڑا ہے، وہ شعور کے شیش محل میں زندہ ہونا چاہتا ہے'' وغیرہ۔

مشاہدات اور تجربات کی کوکھ سے جنم لینے والے افکار، عام طور پر، سبب/نتیجہ سے بارور ہوتے ہیں۔ ساقی کی کاوشات میں یہ روش موجود ہے۔ مثلاً'' آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر بوسے کھلانے سے روح الجھتی ہے، آن کی کمان ٹوٹنے پر جان چھوٹنے لگتی ہے، بیداری یادوں کی فصد کھولتی ہے، اکھوے پھوٹ پھوٹ کر موسم کی تبدیلی کا احساس دلاتے ہیں''۔

بعض باتیں سبب/نتیجہ کے راستے سے کر بھی کہی جا سکتی ہیں، کہی جاتی ہیں، مثلاً'' فرد آنسو اپنے اندر بھی گرا سکتا ہے، فرد کبھی کوئی اڑتا رنگ ہے تو کبھی کوئی ٹھہری لہر، فرد کی تنہائی میں ہم تمنا چھپ سکتا ہے، فرد خود پر ہونے والے ظلم کا بدلہ بھی لے سکتا ہے، روشنی خیال سے دور بھی ہو سکتی ہے، وقت کا سہارا لے کر فرد اپنا حق مانگ سکتا ہے، زیتون کا پیڑ مشعل بن کر جل سکتا ہے''۔

اس کتاب کی نمائندہ نظم ''امانت، صفحہ 82-83'' ہے۔اس نظم میں تین کردار ہیں۔''تتلی، لڑکا، شاعر'' اس نظم کے منظر میں ''فضا، پیپر ویٹ، چاقو، ماچس، پنسل، تیس برس، مٹیالے خون کے دھبے'' ہیں۔پس منظر میں'[رہائی، زبان، تھکن، نیند، پاگل پن' ہیں۔یہ نظم بچپن کی ایک عام سی، معصوم شرارت کی داستان کہتی ہے۔اس داستان میں عمل جرم سے نہیں، احساس جرم سے مربوط ہے۔وہ احساس جرم بچپن سے آگے کے عہد کا رہین ہے۔وہ عہد شعور اور اعتراف کا عہد ہے۔اس عہد میں فرد اپنے ماضی کا جائزہ لیتا ہے، غلط کو غلط کہتا ہے، صحیح کو صحیح کہتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کرتا ہے۔وہ آواز خود کلامی کے باعث تعصّبات سے مبّرا اور صداقت پر مبنی ہوتی ہے۔اس نظم میں وہی آواز شاعر کے دل و دماغ سے سرگوشی کرتی ہے تو وہ کسی غیر کے جرم پر خود کو تکان اور نیند سے پاگل پاتا ہے۔بلاشبہ، یہ تاثر دیرپا ہے۔اس تاثر کا واسطہ ہم سبھوں کے بچپن سے ہے، ہماری ان معصوم شرارتوں سے ہے جو جرم اور ظلم سے واقعی نا آشنا ہوتی ہیں۔ان شرارتوں کا تجزیہ جوانی اور بڑھاپے کے مہ و سال کرتے ہیں۔یوں کہیے کہ وہ مہ و سال دہانہ بن کر ذات کے دریا کو مڑ مڑ کر دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔اس عمل میں خوشی، غم، تاسف، فخر اور ندامت کے عناصر بکھر کر اعتراف کے در پر دستک دیتے ہیں۔یہی دستک اس نظم کی اساس ہے۔اس اساس میں غم بھی ہے اور غصہ بھی۔نیز اس نظم میں ایک غیر ملفوظہ تمنا بھی ہے ''اے کاش! ایسا نہ ہوا ہوتا''۔ساقی کی اس کتاب کا نام ہے، شاہ دولہ کا چوہا، یہ عنوان ایک نظم کا بھی ہے۔اس نظم کے انسلا کی کردار ہیں۔''شاہ دولہ، مجاور/ سجادہ نشین، گداگر، پلوٹھی (درست املا: پہلونٹھی) کے لڑکے، درویش، رضا کار چوہا، بلا''۔حضرت شاہ دولہ پاک پنجاب کے ایک شہر، گجرات میں دفن ہیں۔موصوف اپنے عہد میں عوام الناس کو روحانی فیض پہنچانے کے سبب احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ایک عام روایت یہ ہے کہ بانجھ عورتیں ان کے مزار پر آ کر اولاد کی دعا مانگتی ہیں اور پہلونٹھی کا لڑکا مزار کی نذر کر دیتی ہیں (پہلونٹھی کی لڑکیوں کے ضمن میں کوئی روایت نہیں ملتی)۔وہ لڑکا عام بچوں سے یوں مختلف ہوتا ہے کہ اس کا سرنار یل ایسا چھوٹا سا اور قد بہت کم ہوتا ہے۔ایسے لڑکوں کی گفتگو بھی عام فہم نہیں ہوتی۔ ان لڑکوں سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ بظاہر یہ لڑکے حضرت شاہ دولہ کی کرامت سے منسوب ہوتے ہیں۔اس ضمن میں کوئی حتمی، درست رائے اس لئے نہیں دی جا سکتی کہ زندگی اور موت صرف ربّ العزت کے ہاتھ میں ہیں۔حضرت شاہ دولہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔کوئی مرنے والا خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا چہ جائے کہ وہ بانجھ عورتوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر معذور لڑکا عطا کرے۔ساقی کے مشاہدے کے مطابق ان ''چوہوں'' کے اعضاء توڑ کر مضبوط رسی سے ننگی کمر سے باندھ دیے جاتے ہیں۔یہ مشاہدہ درست نہیں۔جن لڑکوں اور لڑکیوں کے اعضاء توڑ کر مضبوط رسی سے ننگی کمر سے باندھ دیئے جاتے ہیں، وہ گداگروں کی ایک اور قسم ہے۔ایسے گداگروں کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ ان کے والدین ہی یہ شرم ناک کام کرتے ہیں، انہیں ریڑھیوں پر بٹھاتے ہیں، محلوں میں گھماتے ہی اور لوگوں سے ہمدردی کے جذبہ کے تحت بھیک کے طلب گار ہوتے ہیں۔ایسے بچے اور ان کے والدین زبان سے نہیں، آنکھوں سے گفتگو کرتے ہیں۔اس نظم میں ساقی نے گداگروں کی ان دونوں اقسام کو حضرت شاہ دولہ کے چوہوں کا نام دیا ہے جو درست نہیں۔اس نظم میں ''صدیوں کے سوگ جگر جگر جگماتے ہیں'' بجا۔یہ بھی بجا ہے کہ اس کے متن سے قاری کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن متعلقہ علائم اور ان کے اظہار کیلئے استعمال ہونے والے الفاظ یکجا ہو کر وہ تاثر نہیں پیدا کر پاتے جو تاثر شاعر پیدا کرنا چاہتا ہے۔وجہ؟ بین السطور پائی جانے والے تہہ داری نے راہ اور منزل کے درمیان دوری کی وہ خلیج بنا دی ہے جسے قرب کی روش سے پاٹا نہیں جا سکتا۔بلاشبہ، ذہن و جدان کی بھول بھلیوں میں بھی بھٹک کر، بالآخر، آگاہی کے درجہ سے ہمکنار ہونے کا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس نظم میں، متن کے حوالے سے ''دوری'' کا وجود ''قرب'' کی ذات پر غالب نظر آتا ہے۔یہی غلبہ بہ حیثیت مجموعی ساقی کے اسلوب کا بنیادی مظہر ہے۔ ◆◆◆

فخر زماں کا.....گردش میں پاؤں

ڈاکٹر خیال امروہوی

واقعہ یوں ہے کہ میں اپنے سٹڈی روم میں مطالعے کیلئے کتاب تلاش کر رہا تھا کہ ''گردش میں پاؤں'' نامی سفرنامہ نظر آ گیا۔اس کتاب کے مصنّف فخر زماں کے نام پر نظر پڑی تو سوچا کیوں نہ آج فخر زماں کے ساتھ مغرب کی سیر کر لی جائے۔ چنانچہ ایک دن میں پوری کتاب پڑھ ڈالی اور فخر زمان صاحب کو خط بھی لکھ دیا کہ ''گردش میں پاؤں'' ایک ایسا معلوماتی سفرنامہ ہے جو ہر ان ٹیلیکچوَ ال کو پڑھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ سفرنامہ عام سفرناموں کی طرح نہیں ہے۔قدیم سفرناموں کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے تو بے شمار سفرنامے دنیا بھر کے حالات اور واقعات کے مناظر قاری کے سامنے مجسم کر دیتے ہیں۔سفرنامہ کسی بھی سیّاح کی ذاتی مطالعاتی نظر، دلچسپی اور مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر مسافر، سیاح اپنی نگاہ سے انسانوں، شہروں اور تمدن وغیرہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ اندازِ نظر کا فرق ہی ہوتا ہے جو قاری پر انسانی تہذیبی، تمدنی مناظر کو ذہن میں ویڈیو کرتا ہے۔ پاکستان میں سفرناموں کی کوئی کمی نہیں۔ جو بھی باہر گیا اس نے مشاہدات کو قلمبند کیا اور حسبِ استطاعت، مشاہدہ اور اس کے ساتھ ادبی اسلوب نگارش، سیاحتی اندازِ نظر سے سفرنامے کو دلچسپ بنایا۔

فخر زماں کا سفرنامہ ''گردش میں پاؤں'' دنیا کے دس ممالک کے اسفار پر مشتمل ہے یہ ممالک درج ذیل ہیں۔

امریکہ، روس، سوئیڈن، ہنگری، کینیسا ڈا (صدر مقام یو این او) ہالینڈ، آسٹریا، برطانیہ، فرانس ان ملکوں کے فاصلے، اخراجات سفر اور فخر زماں کے عزم سیر و سیاحت پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اتنے ملکوں کو کس دلچسپی سے دیکھا اور پھر اس پہ کتاب لکھ کر ہمیں اپنی سیاحت میں شامل کر لیا۔ بہر حال ''گردش میں پاؤں'' غالباً آتش کی جوانی کے دور کا سفرنامہ ہے۔ یوں تو فخر زماں آج بھی ناشتہ لاہور میں کرتے ہیں اور آٹھ گھنٹے بعد لنچ لندن میں کر لیتے ہیں۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

''گردش میں پاؤں'' سفرنامہ ادبی انشائیہ نہیں ہے بلکہ ایک دانشور کی سیّاحت کے دوران مختلف ممالک کے ان مشاہدات کا چونکا دینے والا مجموعہ کہا جا سکتا ہے جس میں ہر ملک کی عمرانی، سیاسی، تمدنی ثقافتی زندگی، وہاں کی تعمیرات، مختلف اقوام کی طرز بود و باش، مذاقِ سخن، نفسیات اور تہذیبی رویوں کو پیش کیا گیا ہے، فخر زماں نے اپنے سفر کی یاداشتوں کو بالکل اسی طرح بیان کر دیا ہے جیسا کہ انہوں نے بلا تصنع و تکلف دیکھا بھالا، سوچا، سمجھا اور پرکھا۔فخر زماں کی ان سفری داستانوں میں ایک سمجھ دار، سلیم الفکر اور صاحبِ مطالعہ قاری فخر زماں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہر ملک کے بارے میں ان کے تجزیوں سے مستفید بھی ہوتا ہے۔

میں نے اس سفرنامے کے مطالعے کے دوران جن ملکوں کے بارے میں فخر زماں کی وضاحتوں اور توجیہات کو اپنی معلومات کیلئے قابل ذکر خیال کیا وہ بالترتیب ملک کے حوالے سے من وعن نقل کر دیا ہے تا کہ قاری اس ملک کے اہم موجودہ حالات سے مستفید ہو سکے۔ مثلاً امریکہ کے بارے میں فخر زماں نے لکھا کہ ''سیکس کے بارے میں امریکی بلاتکلف بات کرتے ہیں اور آئے دن اس بارے میں تحقیق اور سروے کی کتابوں اور رپورٹوں کے انبار لگاتے رہتے ہیں۔ امریکی صحافت پر مجموعی طور پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ عام امریکی صرف اپنے شہر یا ریاست کے اخبار پڑھتے ہیں۔ قومی سطح پر نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، لاس اینجلس ٹائمز، شکاگو ٹائمز، وال سریٹ جرنل، ڈیلی نیوز وغیرہ مقبول ہیں۔ بقول مصنف ''امریکہ فلک بوس عمارات کا ملک ہے۔ گویا امریکی فلک بوس عمارات سے اس ملک کے ارتقائی رفتار اور بلندی کی آرزو کی علامت مقرر ہوتی ہے۔

واشنگٹن کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ''کمرشل ازم امریکی معاشرے کا اٹوٹ انگ ہے۔ امریکی بنیادی طور پر ایک چالاک سیلز مین ہے۔'' گویا پاکستان کے سیلز میںوں پر بھی امریکی چالاکی کا اتنا اثر ہے کہ کوئی گاہک دکان سے اپنی جیب سلامت لے کر واپس نہیں جا سکتا۔ لیکن حال ہی میں دو عدد مشرقی و مغربی سیلز میںوں کی جو روداد سامنے آئی تو ایک سیلز مین مسٹر بش نے نہ صرف پاکستان کو خرید لیا بلکہ مشرقی سیلز مین صدر مشرف نے چٹکی بجاتے امریکی ڈالروں کو اس خوبی سے اسٹیٹ بینک پاکستان کے حوالے کر دیا کہ مسٹر بش بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

1983ء میں فخر زماں روس گئے، کریملن کی تاریخی ہیبت ناک عمارات دیکھیں۔ انہوں نے بتایا کہ لینن کی لاش اپنی تمام تر عظمت کے ساتھ رکھی ہوئی ہے جو دیس بدیس کے سیّاحوں کیلئے اہم ترین کشش رکھتی ہے۔ [جواہر لال نہرو'' نے جب لینن کی لاش دیکھی تو کہا تھا کہ لینن کے چہرے پر کھلتی یہ مسکراہٹ دنیا بھر کے افتادگان خاک کے لئے ایک رجائیت بھرا پیغام ہے۔''

''ماسکو میں چند دن'' کے عنوان سے فخر زماں نے سفرنامے میں اس طرح روس کے مناظر دکھائے، کہ عملی اشتراکیت کا البم دیکھنے کو مل گیا۔ روس میں اشتراکی سیاست کے ساتھ سائنس اور دیگر علوم وفنون کی بہتات نظر آتی ہے اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اشتراکیت کے خلاف جتنی باتیں یہاں کی جاتی رہی ہیں وہ مغربی بشمول اسلامی ممالک زوردار پروپیگنڈے کے سوا کچھ نہیں وگرنہ جس ملک کی لائبریریوں میں تین کروڑ سے زائد کتابیں موجود ہیں اور جنہیں پڑھا بھی جاتا ہو وہ پاک و ہند جیسا ملک تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہی قوم کتابوں کی شائق، رسیا ہوتی ہے جو انقلابی ہوتی ہے اور تشکیل انسانیت میں عملی حصہ لے سکتی ہے۔ زیرنظر سفرنامے میں ''ایک گول میز مکالمہ'' کے عنوان سے سوئیڈن کے ایک جوڑے سے اِن ٹیلیکچوَ اَل مباحثہ فاضلانہ اور معلوماتی ہے۔ سوئیڈن کے بارے مصنف کی معلومات اور ہمہ قسمی علمی تجزیات اور پھر سوئیڈ میاں بیوی کے ترکی بہ ترکی جوابات قابل مطالعہ ہیں۔

اب ہمارا سیاح 1982ء میں ہنگری پہنچتا ہے ہنگری کا دارالخلافہ بوڈاپسٹ کہلاتا ہے۔ ہنگری میں فخر زماں نے کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی نہ انہیں محسوس ہوا کہ وہاں اجنبی مسافر کا خواہ مخواہ تعاقب کیا جاتا ہے۔ یہ تمام افسانے مغربی ذرائع کے گھڑے ہوئے ہیں۔ ہنگری کے باشندے فنون لطیفہ کے میدان میں ہمیشہ سے اہم کردار ادا کرتے آئے ہیں۔

''گردش میں پاؤں'' کا مصنف 82-1980ء میں کینیڈا جاتا ہے۔ اب کینیڈا میں ایشیائی افراد کافی تعداد میں پہنچ چکے ہیں۔

کنیڈا بہت بڑا ملک ہے اور اس کا بیشتر حصہ غیر آباد بھی ہے جسے بتدریج بالخصوص زرعی اعتبار سے آباد کیا جا رہا ہے۔ وہاں زیادہ تر پنجابی آباد ہیں۔ پنجابی زبان کے لئے کنیڈا میں بہت کام ہو رہا ہے۔ بقول مصنف کم کم از کم چھ پنجابی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ پنجابیوں کے اپنے ٹی وی اسٹیشن اور ریڈیو اسٹیشن بھی ہیں۔ اس طرح وہاں پنجابی زبان کے احیاء کے لئے شب و روز کام ہوتا رہتا ہے۔ اردو رسالوں، کتابوں کی بہت مانگ ہے۔ اقوام متحدہ (جسے میں اقوام غیر متحدہ کہتا ہوں) اس کی تعمیری تفصیل بھی سفر نامے میں ملتی ہے۔ فخر زماں نے اقوام متحدہ کے دفتر وغیرہ 82-1980ء میں دیکھے۔ یہاں کئی عمارات پر ایسے سلوگن بھی دکھائی دیتے ہیں جن کا آج کے گلوب سیاست سے دور کا تعلق بھی نہیں مثلاً وہاں لکھا ہوا ہے۔

''ہم اقوام متحدہ کے باسی آئندہ نسلوں کو جنگ کی لعنت سے بچانے کا عزم کرتے ہیں۔''

اس اعلان کی آج کیا اہمیت ہے ہمیں بتانے کی چنداں ضرورت نہیں، ترقی پذیر ممالک بالخصوص پاکستان کا نام و نشان مٹانے کی جو کوشش جاری ہے وہ اقوام متحدہ کے عزم و عمل کی شدید تردید کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہر چند یورپین چارٹر جسے پاکستان عوام بالکل بھی نہیں جانتے اس کے مطابق اس ادارے کے مقاصد میں بین الاقوامی امن، قوموں کے درمیان خوشگوار تعلقات کا فروغ اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا تحفظ سبھی کچھ شامل ہیں لیکن کشمیر، فلسطین اور دنیا کے دیگر علاقوں میں جو ظلم و بربریت دیکھنے میں آ رہی ہے وہ اقوام متحدہ کے منشور کے خلاف ہے۔

سفر نامے کی تفصیل کے مطابق ہالینڈ بنیادی طور پر ایک رفاعی ریاست ویلفیئر سٹیٹ ہے۔ لیکن یہ سوئیڈن ریاست کی طرح بھی نہیں جس میں پنگھوڑے سی قبر تک کا ہمہ گیر انشورنس رائج ہے۔ البتہ ہالینڈ کا ہیلتھ اور سوشل انشورش بہت موثر ہے۔ سماجی تحفظات کی وجہ سے زندگی خوشحال اور لوگ Affluent ہیں۔ ہالینڈ سائیکلوں کا دیس بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں سب سے موثر ذریعہ مواصلات سائیکل ہے۔

''گردش میں پاؤں'' سفر نامے کا آٹھواں ملک آسٹریا ہے۔ آسٹریا ایک خوبصورت ملک بتایا گیا ہے۔ اس کے باسی محنتی اور سنجیدہ ہیں۔ وایان کی خصوصی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ کہ دریائے دالینوب کے کنارے واقع ہے۔ اس شہر کا ذائقہ مشرق سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی ثقافت کے ڈانڈے مشرقی یورپ کے ممالک بالخصوص یوگوسلاویہ، ہنگری اور چیکوسلواکیہ سے ملتے ہیں۔ آسٹریا کی مزید اہمیت یہ ہے کہ دنیا کی معروف شخصیت، ہٹلر بھی آسٹریا میں پیدا ہوئے۔ معروف ماہر نفسیات سگنڈ فرائڈ کا گھر Beqgasse میں واقع ہے اور اس میں فرائڈ میوزیم قائم کر دیا گیا ہے۔ جہاں فرائڈ اور اس کے خاندان اور دوستوں (ژنگ) آئن سٹائن، ہیولاک ایلس، میری بونا پارٹ اینا فرائڈ، مارتھا فرائڈ، ہینز بس کی تصاویر آویزاں ہیں، فرائیڈ کی تصانیف اس کی لائبریری میں موجود ہیں۔ پہلی منزل پر ڈاکٹر فرائیڈ کا کلینک ہے، دوسری منزل پر تین کمرے اور دو سٹڈی روم ہیں۔ ''گردش میں پاؤں'' کا سیاح جب ویانا میں اپنے آخری سفر کے دوران گیا تو اسے بتایا گیا کہ وہاں کے ایک ڈاکٹر نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ افراد مذکورہ ڈاکٹر سے اپنا طبی معائنہ (میڈیکل چیک اپ) کرانے آتے تھے۔ ان میں ایک اہم نام ذوالفقار علی بھٹو کا ہے جس کے بارے میں ویانا کے ڈاکٹر نے درج ذیل رائے دی تھی:۔

''ذوالفقار علی بھٹو نہایت ذہین، خوش لباس، خوش گفتار، باسلیقہ اور بہت پڑھے لکھے شخص ہیں۔'' اس ڈاکٹر نے شاہ فیصل کی بھی خاصی تعریف کی ہے۔ اب یہ دو قابل قدر ہستیاں ہم سے بچھڑ گئیں شاید اس لئے کہ ان کی ذہانت ایک خاص ملک کو ناپسند تھی''۔ سفرنامے کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ جب ویانا سے جہاز پر لندن کیلئے بیٹھا تو اسے رہ رہ کر آسٹرین ڈاکٹر کے فقرے یاد آ رہے تھے اور وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ ہم (اہل پاکستان) کتنی بدقسمت قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس نے اتنا بڑا شخص گنوا دیا لیکن پھر اسے اچانک حوصلہ ہوا کہ تاریخ ذوالفقار علی بھٹو کی موت کا حساب ضرور چکائے گی۔ کیونکہ یہ وعدہ ہے تاریخ کا پاکستان کے عوام کے ساتھ۔

''گردش میں پاؤں'' سفرنامے سے سیّاح فخر زماں نیویارک سے برطانیہ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ امریکہ سے یورپ کا سفر انتہائی بور ہوتا ہے۔ اوپر بندہ نیچے بیکراں بحرِ اوقیانوس، کوئی سٹاپ نہیں کہیں مستقر نہیں۔ ہر وقت سقوط کا خطرہ، موصوف کو جہاز میں بیٹھ کر کبھی خوف محسوس نہیں ہوا بلکہ لذت کا احساس ہوتا رہا ہے۔ ایڈونچر واقعی بڑی لذت آفریں ہوتی ہے، برطانیہ میں لندن ایک ایسا مقام ہے جس ملوکیت امپیریلزم کا سرچشمہ کہنا چاہیے۔ وہیں کے بادشاہوں نے خدائی زمیں پر برسوں حکومت کی اور اپنی حکومت کو اس قدر وسعت دی کہ سورج کو بھی ڈوبنے کیلئے اپنا ذاتی افق نصیب نہ ہو سکا۔ پاکستان کے تمام نامور اور کامگار ادیب، شاعر، صحافی، عامۃ المسلمین غرضیکہ سبھی لندن ہو آئے ہیں بجز بندۂ ناچیز یعنی خیال امروہوی کے فخر زماں کے سفرنامہ برطانیہ میں یوں تو بہت سی چیزیں لائق استفادہ ہیں تاہم مجھے جن چیزوں کی تلاش رہی وہ برطانوی دانش تھی جسے ہمارے سیّاح نے ہم تک پہنچا دیا کہ:

''دنیا کا ناخوش ترین شخص وہ ہے جو ناموافق حالات میں صبر کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ انسان ناموافق حالات کے ہاتھوں نہیں بلکہ بے صبری کے ہاتھوں مرتے ہیں''۔

یہی حال ہمارے ملک پاکستان کا ہے جس میں ناموافق حالات بھی ہیں، بے صبری، انتشار و ابتری بھی۔ سنتے ہیں ہندوستان کا معروف ہیرا کوہ نور، انگلستان کے خزانہ عامرہ کی زینت ہے۔ چنانچہ بقول مصنف، کوۂ نور کہ جس کے بارے میں بھٹو صاحب نے برطانوی حکومت کو کہا تھا کہ یہ ہیرا تم نے غصب کیا ہے، اسے واپس کرو اور اس پر برطانوی اور بھارتی حلقوں میں کافی غیض و غضب کا اظہار کیا گیا تھا۔

فخر زماں نے لندن میں ہائیڈ پارک بھی دیکھا۔ یہ پارک یادگار پاکستان کے میدان کی طرح ہی ہے۔ ہائیڈ پارک لندن میں پاکستان کی صورتحال پر دھواں دھار تقاریر ہو رہی تھیں۔ پاکستان کے خلاف امریکی صیہونی سازشیں، اسلام کے خلاف مغربی میڈیا وغیرہ تقاریر کا موضوع رہتے تھے۔ ہمارے یہاں بھی ہر ضلع میں ایسے ہائیڈ پارک بنا دینے چاہئیں تاکہ مقررین غبار خاطر جھاڑ سکیں اور شہر جلسہ جلوس کی آفات سے محفوظ ہو سکے۔ برطانیہ کے سفر کا مزید فائدہ یہ ہوا کہ فخر زماں نے شیکسپیر کا گھر بھی دیکھا اور سب سے اہم بات یہ کہ لندن میں پاک و ہند کے معروف دانشور رائٹر، اداس نسلیں'' کے خالق جناب عبداللہ حسین سے بھی مل لئے۔ عبداللہ حسین اور فخر زماں ایک ہی شہر گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اور کلاس فیلو بھی تھے۔

فخر زماں نے بتایا کہ عبداللہ حسین ایک ایسا دانشور رائٹر ہے جو کسی بھی مرحلے پر منطق کو نہیں چھوڑتا اور غیر جذباتی انداز میں چیزوں کا تجزیہ کر کے نتیجے اخذ کرتا ہے۔ وہ سیدھا سادا انسان ہے، سیدھی بات کرتا ہے۔ ہمارے عام دانشوروں کی طرح اُلجھی ہوئی گفتگو نہیں کرتا۔ غیبت نہیں کرتا۔ تعلّی کا شائبہ تک نہیں بلکہ اپنی تحریروں کے بارے میں انکسار آمیز روّیہ اس کی پہلودار شخصیت کا اہم جزو ہے۔

اب سفر نامے کا مصنف لندن سے فرانس روانہ ہوتا ہے۔ یہ سفر 1979ء۔1980ء میں کیا گیا۔فرانس کے بارے میں عام رائے یہ رہی ہے کہ وہاں سڑکیں شیشے کی بنائی جاتی ہیں۔خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن کئی بار سمجھایا کہ سڑکین شیشے کی نہیں ہوتیں، صفائی ستھرائی میں شیشے کی طرح صاف شفاف ہوتی ہیں۔لیکن لوگ نہیں مانتے۔وہ کہتے ہیں جب فرنچ عورت کانچ کی گڑیا جیسی خوبصورت ہوتی ہے تو سڑکیں شیشے کی طرح کیوں نہیں ہوسکتیں۔قصوران کا بھی نہیں ہم نے بھی کسی دور میں کئی بدن ایسے دیکھے تھے جنہیں دیکھ کر شعر ہوگیا تھا کہ

ملے ہیں ایسے بھی شیشہ بدن زمانے میں
نم سحر بھی جنہیں مس کرے تو زنگ آئے

ملک پاکستان میں چونکہ گندی، شکستہ حال سڑکیں کثرت سے ہیں لہٰذا عوام کا یہ خیال درست ہے کہ مغربی ممالک میں سڑکیں شیشے کی ہی ہوتی ہوں گی۔فخر زماں کے سفر نامے اور ان کے مشاہدات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ترقی یافتہ ممالک کو ظاہر کی آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں لیکن ان کے دل کی آنکھ اپنے وطن کی حالتِ زار پر آنسوؤں کے دریا بہاتی رہتی ہے۔ان کی یہ کیفیت اکثر مقامات پر محسوس ہوئی ہے۔واقعی اب تک پاکستان امریکہ اور فرانس کے برابر ہو جاتا لیکن بلوغت سے قبل ہی کہولت میں چلا گیا۔انسانی علم آگے بڑھ گیا، پاکستانی جہالت ترقی یافتہ ممالک کے علم سے بھی آگے بڑھ گئی بقول مصنف ''فرانس خوبصورت بھی ہے اور ہر لحاظ سے مہذب اور آزاد بھی۔آزادی کی خواہش انفرادی آزادی سے لے کر اجتماعی سطح تک فرانسیسوں کی گھٹی میں ہے۔سارتر کی سوچ ان کے ہر سٹائل سے جھلکتی ہے'' جن دنوں ''گردش میں پاؤں'' کا مصنف فرانس میں تھا ان دنوں سارتر بیمار تھا بلکہ چند دنوں کا مہمان تھا۔ان حالات میں ان سے ملاقات کا شرف ممکن نہ تھا۔مصنّف کے علم کے مطابق سارتر کسی پاکستانی ادیب سے ملنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔کیونکہ کسی ناعاقبت اندیش پاکستانی ادیب نے سارتر سے کہہ دیا تھا کہ ادب اور سیاست کا کوئی سمبندھ (رشتہ تعلق) نہیں ہے لیکن بقول مصنف اگر سارتر آج زندہ ہوتا تو پاکستان میں ادب وسیاست کے گہرے رشتے/تعلق کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوتا کہ اپنی رائے بدل لیتا۔بہر حال سارتر فرانس ہے اور فرانس سارتر۔

فرانس کی بنیادی انقلابی اہمیت وولٹیر اور روسو کی وجہ سے ہے۔وولیٹر نے کلیسائی تعصب اور تھیوکریسی سے جس طرح بغاوت کی وہ ایک تاریخ ساز قدم تھا۔وکٹر ہیوگو، بوولیو اور رمبو جیسے انقلابی قلمکاروں کو کون فراموش کرسکتا ہے۔یاں کاکٹو، سارتر، مولیئر، لافونٹین نے بورژوائیت کے کس طرح پرخچے اڑائے۔

اس سفر نامے میں فخر زماں نے فرانس کو جس طرح اکیڈمک اور انقلاب آفریں ملک ثابت کیا اور فرانسیسی معیار کی تمام تخلیقات، ترجیحات، سیاست وثقافت پر طائرانہ لیکن گہرے تعقّل کی نظر سے دیکھا ہے وہ گردش میں پاؤں'' کا نہایت وقیع حصہ ہے۔من حیث القوم فرانسیسی انتہائی جذباتی اور گرم جوش قوم ہے۔نوجوان استاد اور طلباء ذہنی طور پر بائیں بازو کی سوچ رکھتے ہیں۔مارکس ازم کو بطور فلاسفی قبول کرتے ہیں۔کیونکہ کانٹ اور ہیگل کے فلسفے ان کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔فرانس کے سفر میں مصنف نے وہاں کی زندگی، فنون لطیفہ خوبصورت ثقافت، تعمیرات وغیرہ کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور تمام سفر نامے میں قاری کو خود سے الگ نہیں ہونے دیا جبکہ اسے ایک عالم بنانے کی کوشش کی ہے۔

◆◆◆

امکان در امکان

خورشید بیگ میلسوی

خورشید رضوی کی شاعری لفظ کے اندر معنی کی وسعت اور پہنائی سے آغاز ہوتی ہے، جو پہلو داری اور تہہ در تہہ محسوسات خارجی اور داخلی کے اظہار کے مدار میں پیہم رواں رہتی ہے۔ اس کی منزل کہاں ہے؟ اس کیلئے ہمیں ادب کے زمانی و مکانی تقاضوں سے بات کا آغاز کرنا ہوگا۔ عصری ادب دراصل موجود نظام حیات و کائنات کے خوش رنگ عکس کے ساتھ اس میں رنگوں کی تبدیلی کے تحرک سے متصل ہے۔ ایک روشنی جو سورج میں جھلسا دینے والی ہے، مہتاب میں ٹھنڈی، نرم خو اور آغوش کشا ہے۔ لہو جو شریانوں کے اندر زندگی کی تشکیل کرتا ہے، باہر نکل کر معاشرتی عروج و زوال کی کہانی سناتا ہے۔ یہی تفوّق، یہی امتیاز ادبی تجسس کی بنیاد بنتا ہے۔ کبھی شعر گری اور کبھی افسانہ نویسی میں اور یوں قدرت اظہار سے زیادہ طاقتور نظر آنے والا مہر بلب رکھنے کا منظّم ماحولیات جبر، استعارہ و علامت کی دنیا میں بے وقار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے شاعر انفرادی سطح پر وہ بات کہنے کی طاقت رکھتا ہے جو دوسرے صرف محسوس کرتے ہیں۔ شاعر لاچار و بے کس حیات کو قوّت فراہم کرتا ہے، تاہم بے زبانوں کو زبان عطا کرنے کی تخلیقی صلاحیت کا حامل خود طلسم اظہار کا اسیر ہے کیونکہ

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

کی طرح اظہار کا سب سے افضل مصوّر ہوتے ہوئے شاعر مزید امکانات کا تجسس رکھتا ہے۔ خورشید رضوی کے فکر و فن میں، یہی جذبہ نمو پاتا ہوا نظر آتا ہے۔

خون سے لکھتا ہوں اور لفظ میں ٹھہراتا ہوں
پھر بھی عکسِ دل بے تاب کہاں پاتا ہوں

دراصل شاعری وہبی صفت ہے، دنیا کا پہلا شاعر جو بھی ہوگا وہ باقی لوگوں سے مختلف سوچ رکھتا ہوگا، ہوسکتا ہے اس نے اشاروں کی زبان میں شاعری کی ہو اور مؤرّخ کی بجائے اس وقت کے سامعین بھی اس کے فن سے محظوظ ہوئے ہوں، تاہم تنوع نے اسے فنکار بنایا اور پھر یہ تسلسلِ فکر ادبی ورثے کی طرح عہد بہ عہد چلتا ہوا آج کے سائنسی دور میں بھی اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ حالانکہ سائنسی نظریہ اصول میں تسلیم شدہ آفاقی حقیقتوں کے سوا ہر شے کو باطل گردانا جاتا ہے۔ سو یہ شاعروں کی فکری ریاضت کا کمال ہے کہ آج ''کلوننگ'' کی طلسم زدگی کے پہلو میں اگر شعر انکشافات کی اوّلیں سطح پر دکھائی نہیں دے رہا تو اسے تلاش کیجئے، یہ سائنسی اصول کی بنیاد مفروضات کے تخلیقی رنگوں میں جھلملاتا ہوا نظر آئے گا۔ دراصل شاعر فرسودگی میں نہیں پڑتا تاہم وہ احسن اقدار کو روایت کا نام دیتا ہے، تاکہ نظام کائنات کا

حسن توازن انسانی بقاء کی مرکزیت کے حقیقی نظریے سے جڑا رہے۔

کچھ گم ہوئے اوراق روایت میں نہ آ کر　　کچھ مسخ ہوئے حسن روایت کے اثر سے
ہر ایک نیند میں ڈوبے ہوئے شبستاں تک　　بلا سے کوئی نہ جاگے مگر اذاں گئی ہے
ترے ہجر، تیرے وصال، اپنے خیال میں　　کسی آئینے، میں سب کا سب نہیں آ سکا

خورشید رضوی کے ہاں خیالات کی ندرت اور موضوعات کا تنوّع ان کی فکری وفنی ریاضت کا عکس ہے۔ان کے ہاں علمی بلندی کے باوجود ہر بات شعر نہیں، ان کے ہاں قادرالکلامی کا معیار روایتی نہیں نہ وہ ادب میں مشکل پسندی سے وابستہ ہیں۔جذبہ واحساس کا ایک تاج محل نظروں کو خیرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔یہ شاعری ''شہرخواب''، ''ہوک''، اور ''جزیرہ'' کی نظموں میں جھلکتی ہے۔ ''ہوک'' کا آخری شعر ملاحظہ کیجئے:۔

ہے مری سوچ مرے اپنے لئے ایک عذاب
اس پہ عائد ہی نہیں میرے سوالوں کا جواب

وہ بھی خواہش تھی جس کی وجہ سے فردوس گم گشتہ کی تلاش میں انسان سیّارۂ زمیں پر فانی عہد گزار رہا ہے اور شاعر بھی خواہش کے طلسم کدے میں کشکول لئے بغیر داخل ہوتا ہے۔کیونکہ اس خواہش کے ماحول میں جہاں تمنّا کی دلفریبی ہے، وہاں معیارات کا تفوق وامتیاز ردعمل کے تضاد کے بے شمار امکانات کی بنا پر شاعر کیلئے محور ومخزن غم بن چکا ہے۔چنانچہ وہ طلسم کدے میں خود کو اس کے بوجھ تلے محسوس کرتا ہے۔اوپر رنگ، خوشبو، نزاکت، حسن اور دلفریبی ہے مگر سامنے تلخ حقیقت کی سنگینی ارادوں کو متزلزل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔گویا ایک دائرہ ہے جس کی ایک قوس صغیرہ میں اثبات ہے تو قوس کبیرہ میں نفی ہے۔دائرے کا کچھ حصہ دونوں کے تعامل کا دکھائی دیتا ہے، اور یہ دائرہ عمل و خیال کے ارتباط سے وجود پذیر ہو کر لفظ کے اندر ڈولتے اور لڑکھڑاتے ہوئے معنی کو شاعر کی فکر وفہم سے متوازن کرتا ہے تو شاعری وجود میں آتی ہے۔لیکن فکر وفہم پر کسی ایک قوس کے تاثر کی برتری ممکن رہتی ہے، جس کی بناء پر خورشید رضوی یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زمانہ لب پہ یہ انگشت رکھ کے کہتا ہے　　کہ دردِ دل نہ کہو اور کہو تو ڈرتے ہوئے

.....

گو دست کشی دل کو سہاروں سے بہت ہے　　ڈوبے گی تو یہ نبض دکھانی ہی پڑے گی

.....

میں تو خود خاک ہوں میرا تو بھلا کیا مذکور　　آسمانوں سے ستاروں کو بلاتی ہے یہ خاک

خورشید رضوی کے مجموعہ کلام ''امکان'' میں غم کا شعور اور اس کے مخزن کا علم ہونے پر ہیجان آمیز بغاوت کا اظہار ایک دوسرے سے کہیں کہیں مربوط نظر آتا ہے۔دراصل زمین پر مسلّط استحصال کا شکنجہ بھی اسی غم کی اسیری کا ایک پہلو ہے۔حیرت میں گم انسان سوچ رہا ہے کہ رنگ ونسل کا امتیاز بڑھتا جا رہا ہے۔ہوس زر انسان کو اپنے قد سے اوپر لے جا رہی ہے، اس لئے آدمی کا زمین سے رابطہ کٹ رہا ہے، وہ اپنے پیروں تلے انسانیت کو بکھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔اس لئے ایسے نظام کا حصہ بننے والے انسان سے خورشید رضوی کا تعلق نہ ہونا جہاں ہیجان انگیزی کا باعث بنا ہے وہاں اس میں تبدیلی نہ لا سکنے کا دکھ بھی غم کا ایک پہلو ہے۔تاہم جہاں یہ غم محبت کے طلسم کدے سے گزرتا ہے تو

اس غم سے لطف انگیزی کیلئے کبھی شاعر اپنی فکر کے مدار میں سوچوں کی لطافت کے عقب میں چلا جاتا ہے تو کبھی لذت ہجر کے حوالے سے اس غم سے حظ اٹھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اے خالق امکاں ترے زندان قضا میں　　کیا کیا نہ ہمارے دلِ غم ناک سے گزرا
جما ہوا ہے لہو تہہ بہ تہہ رگ جاں میں　　ہمیں لہو یہ اگلنا بھی چاہیے کچھ کچھ

.....

دُور جا کر بھی مری رُوح میں موجود نہ رہ　　تو کبھی اپنی جدائی بھی تو سہنے دے مجھے

فنا کے مضمون کا اظہار عمرِ خیام کی رباعیات میں اتنا بلند ہوا کہ اس کی شاعری کے تراجم کے ساتھ دنیا بھر میں عام ہوا۔ خورشید رضوی جس عہد میں جی رہے ہیں اس کے بطن میں جھانکنے والی آنکھ ایک لمحے کیلئے فنا کو خود سے اوجھل پاتی ہے۔ کیونکہ لوگ فنا کے احساس سے عاری اپنی اپنی من پسند سمتوں کی جانب محوِ سفر ہیں۔ چنانچہ فنا پر یقین رکھنے والے خورشید رضوی جو حقیقت کو جذبۂ احساس اور مضمون آفرینی کے ہنر سے بیان کرنے کا اسلوبِ نگارش رکھتے ہیں، فنا کے موضوع کو بھی ایک تنوّع اور ندرت بیان کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ کہیں فنا بالا دست روایتی محرم ہے تو کہیں یہ فرد کے اندر تحرک کا سبب ہے، اور کہیں غم کے جذبے نے فنا پر غلبہ حاصل کر لیا۔ یوں خورشید رضوی کے ہاں موضوع فنا بے حد چشم کشا ہے ؎

اے درد نہاں مار ہی ڈالا مجھے آخر　　اس رنج سے باہر نہ نکالا مجھے آخر

.....

جس طرح سمندر سے گزرتا ہے سفینہ　　مجھ کو بھی گزرنا ہے جہان گزراں سے

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی تعلیم میں خورشید رضوی کی سخن وری سیادت کے مقام پر فائز ہے، جس کی بنیادی وجہ تخلیقی جوہر ہے جو ان کے مخصوص اسلوب کی پہچان بن چکا ہے۔

بھرم اسی میں تحمل کا ہے کہ مر جائیں
جئے تو پھوٹ بہے گا یہ سب کبھی نہ کبھی

◆◆◆

محشر بدایونی

مخلصی و رفیقی اظہر جاوید صاحب! ''تخلیق'' میرا عزیز ترین اور انتہائی پسندیدہ رسالہ ہے۔ بڑے شوق اور انہماک سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں..... ''تخلیق'' ان چند رسائل میں شامل ہے جو اپنی ساکھ ادبی حلقوں سے منوا چکے ہیں۔ اس کی اعلیٰ نگارشات آپ کی مخلصانہ کاوشوں کی ترجمان ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ڈاکٹر جمال نقوی

دانشوری کے تقاضے بہت سخت ہیں۔ کیونکہ ان میں پہلی شرط مختلف علوم سے واقفیت ہے اس کے بعد اسی واقفیت کی بنیاد پر ایک واضح نقطہ نظر ہے۔ ہمارے یہاں دانشوری کے دعویدار تو بہت ہیں لیکن ان شرائط پر پورا اترنے والے بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ ان کم لوگوں میں ایک نام ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا بھی ہے جن کی دانشورانہ حیثیت کو اردو دنیا کے اہم نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی نے تسلیم کرتے ہوئے تحریر کیا کہ

''ایسے میں محمد علی صدیقی کی شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ایک طرف تو ان کی نگارشات میں کثرت مطالعہ کے نشانات بہت واضح ہیں، دوسری طرف وسیع مطالعے سے نتائج اخذ کرنے کی بے پناہ صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔''

محمد علی صدیقی نئی ترقی پسندی کے امام تسلیم کیے جاسکتے ہیں کیونکہ اپنے نقطہ نظر پر قائم رہنے کے باوجود وہ نئے مطالبات کے متنوع پہلوؤں کو سمیٹنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

مختلف علوم سے واقفیت حاصل کرنے کی خواہش نے ہی ڈاکٹر محمد علی صدیقی کو انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی اسناد بھی حاصل کیں اور علم و ادب کے عمیق سمندر میں غرق ہوئے۔ جہاں سے وہ موتی اور جواہر حاصل کر کے دنیا ادب میں نمودار ہوئے۔

1962ء میں عملی زندگی کا آغاز اردو اور انگریزی صحافت سے کیا جو روزنامہ 'حریت'، پاکستان اینڈ گلف اکنامسٹ، ڈان اور بزنس ریکارڈر کے ساتھ زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ اس درمیان ماہنامہ ''افکار'' میں بھی کافی عرصے تک مہمان مدیر کی حیثیت سے شامل رہے۔ ان کے تحریر کردہ اداریے ''اشاریے'' کے نام سے افکار فاؤنڈیشن نے شائع کئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ابتداء میں اردو اور انگریزی میں شاعری بھی کی مگر بہت جلد تنقید کی طرف آ گئے۔ ان کا پہلا تنقیدی مضمون ''ہمارا ادب اور قومی دماغ'' 1959ء میں ماہنامہ ''جامِ نو'' میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے تجزیہ کیا تھا کہ ہمارے ادیبوں میں کہیں قومی دماغ نظر نہیں آتا۔ آج بھی بہت سی بولیاں ہیں، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ ہم ابھی تک ایک قوم نہیں بن سکے۔'' ان کے نزدیک تنقید ادب کا فلسفہ ہے، جیسے حسن کا فلسفہ جمالیات ہے۔ آج جس نقطہ نظر سے بھی تنقید لکھیں، آپ کے علم میں یہ ضرور ہونا چاہیے کہ عالمی تحریکیں کیا ہیں اور آپ کو عالمی تحریکوں کے تناظر میں کس خانے میں رکھا جائے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی صدیقی صاحب کا نظریاتی جھکاؤ ترقی پسندی کی جانب رہا اور وہ آخر وقت تک اسی فکر سے منسلک رہے۔ انہوں نے مارکسی فکر کو پوری طرح سمجھا اور اس کو اپنی تحریروں کا مرکز بنایا تھا۔ ادبی و سماجی معاملات کا ادراک اسی فکر کے زیر اثر کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر احتشام حسین کے بعد ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ترقی

پسند فکر کے وکیل کی حیثیت سے کام انجام دیا۔ان کی نظر مغربی ادب پر بھی بہت گہری تھی،لہٰذا مغرب سے لے کر مشرق تک جہاں کہیں بھی ترقی پسندی سے متعلق کوئی سوال اٹھایا گیا انہوں نے فوراً اس کا مدلّل جواب دیا ہے۔

اصولوں اور حقائق پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کبھی سودے بازی نہیں کی مگر کسی موضوع پر اس وقت تک نہ تو قلم اٹھایا اور نہ ہی زبان کھولی جب تک اس موضوع کے بارے میں پوری معلومات حاصل نہ کر لیں۔علوم کے اس سمندر سے موتی حاصل کرنے میں ان کی مختلف زبانوں میں مہارت نے بڑی مدد دی تھی۔اردو اور انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، سندھی، پنجابی، سرائیکی اور فرنچ زبانوں کو انہوں نے اپنے ذوق علم کی وجہ سے حاصل کیا تھا۔جہاں وہ جدید علوم اور جدید ادبی تحریکوں سے پوری طرح واقف تھے، وہیں قدیم علوم، مذاہب اور مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ غالب، سرسید، اقبال اور جوش وغیرہ پر تحریر کردہ ان کی کتابیں اردو کے تحقیقی ذخیرے میں اہم مقام رکھتی ہیں۔انہیں کتابوں کی بنیاد پر انہیں جامعہ کراچی نے ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا تھا۔ان کی اولین تنقیدی کتاب 'توازن' کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ انہوں نے جس راہ کا انتخاب کیا ہے وہ سخت اور بہت ہی ناہموار ہے.....دیکھنا یہ ہے کہ اس دیوانگی شوق میں محمد علی صدیقی کا توازن قائم رہتا ہے کہ نہیں.....مگر ہم نے دیکھا کہ اس دیوانگی شوق نے ان کی بصیرت میں اضافہ کیا اور ساتھ ہی ان کا توازن بھی برقرار رکھا۔یہ الگ بات ہے کہ آخر عمر کی تحریروں میں انہوں نے کھلے الفاظ میں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے مگر کہیں بھی تضحیک کا پہلو نظر نہیں آتا۔انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان بنیاد پر تنظیم کے بعد وہ پہلے منتخب صدر تھے جن کے دور میں انجمن کے پہلے استقبالیہ اجلاس میں انہوں نے اپنی پوری ٹیم کے ساتھ کل پاکستان بنیاد پر انجمن کی کارکردگی کو فروغ دینے کا اعادہ کیا اور تمام ممبران سے انجمن کے بنیادی مقاصد کے فروغ میں مدد کی درخواست کی تھی۔ہم نے ان کی سربراہی میں جو سفر شروع کیا تھا وہ جاری ہے اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق جاری رہے گا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ادب کے شعبے میں ان کی بیس تنقیدی کتابیں، ان کے ادبی اور سماجی نظریات کی ترجمان ہیں۔اور ان کے بعد آنے والوں کیلئے چراغ راہ کی مانند ہیں۔''توازن''.....ان کی پہلی تنقیدی کتاب تھی جس کو بڑی پذیرائی نصیب ہوئی اور پاکستان رائٹر گلڈ نے جسے بہترین کتاب کا اعزاز بھی دیا۔اعزازات اور پذیرائی کا یہ سلسلہ ان کی آخری کتاب 'نکات' تک جاری رہا۔حکومت پاکستان نے انہیں 'پرائیڈ آف پرفارمنس' اور ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا، جرائد نے ان کے گوشے اور نمبر نکالے، جامعات میں ان پر تحقیقی مقالے تحریر کئے گئے اور مغربی جامعات نے انہیں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا۔

تعلیم کے شعبے میں پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی سے 1988ء میں شروع ہونے والا ان کی معلّمی کا سفر ہمدرد یونیورسٹی سے ہوتا ہوا بزٹیک یونیورسٹی میں ڈین اور وائس چانسلر کے عہدے پر اختتام پذیر ہوا۔آخر میں ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں بزٹیک یونیورسٹی نے انہیں 'پروفیسر ایمریٹس' کا اعزاز بخشا۔

'مابعد جدیدیت' کے بارے میں ان کی ایک زیر اشاعت کتاب کے علاوہ وہ اپنے نام مشاہیر کے خطوط کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ان کی تحریروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع شدہ ان کے اخباری کالم ہیں جو تقریباً پچاس سال پر محیط ہیں۔یعنی جن میں ادب کی پچاس سالہ تاریخ رقم ہے۔یہ تمام چیزیں منتظر اشاعت ہیں۔کاش! انہیں کوئی معتبر پبلشر مل جائے۔

◆◆◆

خوابیدہ خطوط

ادیبوں کے خطوط اظہر جاوید کے نام

انور سدید بنام اظہر جاوید

برادرم اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون، آج کے ''امروز'' میں آپ کا مقبولِ عام کالم ''محفل محفل'' میں نے دلچسپی سے پڑھا ہے۔ آپ نے جس حقیقت بیانی سے حلقۂ اربابِ ذوق (ادبی) کے گزشتہ اتوار کے جلسے کی رپورٹ مرتّب کی ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ جناب غلام الثقلین نقوی کا طنزیہ، مزاحیہ مضمون ''میری پچیسویں سالگرہ'' پر بحث خوب چٹخی۔ اس ضمن میں ایک مجلسی نقاد نے ''دبستانِ سرگودھا'' کا تذکرہ بھی کیا اور یہ تاثر دیا کہ بعض ادبی احباب کے ساتھ شامیں منانے کا جو سلسلہ چلا ہوا ہے، اس کے خلاف ردِّعمل ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق مرتّب کیا جا رہا ہے۔ اور جناب غلام الثقلین نقوی کا مضمون اس سکیم کا حصّہ ہے۔ مجھے یہاں اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ ''دبستانِ سرگودھا'' کے ادباء ادب کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور اسے دنیاوی ثمر سے بے نیاز تصوّر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب آج کا ادیب دولت پسندوں کے انداز میں شہرت پسندی کا شکار ہوا تو ادبائے سرگودھا نے اس کے خلاف کھل کر اظہار کیا۔ تاہم اس اظہار کے پسِ پشت حسد یا رقابت کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا بلکہ یہ ادباء تو اس حقیقت کو قبول کرنے سے ہی قاصر ہیں کہ ادیب کا قصیدہ اس کے منہ پر پڑھا جائے اور اسے غلط قسم کے احساسِ برتری میں مبتلا کر دیا جائے۔ اس اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ توصیفی شاموں میں جو مضامین پڑھے جاتے ہیں ان میں صرف ستائش کا پہلو غالب ہوتا ہے اور اکثر گھٹیا درجے کی تنقید سامنے آتی ہے۔ چنانچہ اکثر شام ڈھلنے کے بعد ''ستائشی جملوں'' کے باطنی مفہوم کو مقالہ نگار اپنی زبانِ شیوہ بیان سے ظاہر کرتا ہے اور دوست اور دشمن دونوں کو ایک ہی تلوار سے ذبح کرتا ہے اور یہ کہنا درست ہے کہ اسی قسم کی شاموں نے ادب کی خدمت کرنے کی بجائے اسے نقصان پہنچایا ہے اور ادیب کو نہ صرف حریص بنا دیا ہے بلکہ بہت سے سینئر ادباء کو اپنی محرومی کا احساس بھی دلایا ہے۔ چنانچہ دبستانِ سرگودھا نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے تو اس کے اس آزادانہ اقدام کی تعریف و تائید ہونی چاہیے۔

مجھے اس بات کی تردید بھی کرنا ہے کہ جناب غلام الثقلین نقوی کا مضمون کس سکیم کا حصہ تھا۔ یہ مضمون ان کے ذاتی تاثر کا نتیجہ ہے۔ ادبا کی شہرت پسندی طنز و مزاح کی زد میں آ گئی ہے تو باور کرنا چاہیے کہ یہ ناہمواری معاشرتی سطح پر بھی کھٹکنے لگی ہے اور اب اس کی

اصلاح کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ مزاح نگار کی قینچی اس کی تراش خراش پر مامور ہوگئی ہے۔ شاید اربابِ ادب اسی طرف متوجہ ہوں اور اس بدعت کا استیصال کیا جا سکے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس مسئلہ پر قارئین ''امروز'' کی گراں قدر آراء حاصل کیجئے اور ہمیں ان سے استفادہ کا موقعہ دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔

آپ کا مخلص.....**انور سدید**

سرگودھا 23-02-1977 .....

برادرم اظہر صاحب!

سلام مسنون۔ آپ کے خط کا انتظار تھا۔ عزیز احمد پر میں نے جس مضمون کا تذکرہ کیا تھا، وہ غیر معمولی طور پر طویل ہوگیا اور اب یہ ''امروز'' کی ایک اشاعت میں نہیں سما سکتا۔ میں نے ایک اور تاثر آپ کے لیے لکھا ہے اور اس خط کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ آپ نے دیکھا.....عزیز احمد کی وفات کا ادب کی دنیا میں نوٹس ہی نہیں لیا گیا۔ شاید یہ زندہ پرستی کا دور ہے.....اور ہمیں یہ بھول گیا ہے کہ ایک دن موت کا فرشتہ ہماری گردن بھی دبوچے گا اور بے بسی کی کیفیت ہم پر بھی طاری ہوگی۔ عزیز احمد کی وفات پر میں آپ سے تعزیت کرتا ہوں۔ یہ تعزیت ''امروز'' کے وسیلے سے پوری دنیا تک پہنچا دیجئے۔ آپ نے عطاء الحق قاسمی کا کالم ''خود سوختی'' پڑھا ہے؟

مخلص.....**انور سدید**

سرگودھا 27-12-1978 .....

برادرم اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون۔ آپ کا ایڈیشن اس مرتبہ بھی معنی خیز، متنوع اور بھرپور تھا۔ شاہد شیدائی کا مضمون دیر سے چھپا لیکن اس میں دلچسپی کا وافر سامان موجود تھا اور یہ لاہور میں ضرور موضوعِ گفتگو بنا ہوگا۔ ''ادبی رسائل پر میرے مضمون کو کئی دوستوں نے توجہ سے پڑھا اور مجھے اپنے خوشگوار تاثر سے مطلع کیا۔ ریاض احمد شاد تو کہہ رہے تھے کہ اب رسائل کو تلاش کرنا ضروری نہیں رہا۔ تمہارا خلاصہ ہی قاری کی تشفی کر دے گا۔ اگر آپ نے اور لاہور کے دوستوں نے پسند کیا تو اسے ماہانہ فیچر کی صورت دینے کی کوشش کروں گا۔ اپنی رائے سے جلدی مطلع کریں تاکہ میں رسائل کا مطالعہ اسی زاویے سے کروں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عطاء الحق قاسمی نے بھی اس دفعہ اُبھرنے کی کوشش کی ہے اور وہ کلغی اُبھار کر بانگ دے رہے ہیں۔ مسعود مفتی صاحب کا مضمون اسی تناظر میں بڑا معنی خیز ہے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ عطاالحق قاسمی آپ کا مقابلہ قلم کی تلوار سے کریں۔ اس طرح جوابی حملے میں آپ کی خفتہ صلاحیتیں بھی بیدار ہو جائیں گی اور مقابلہ بھی کھلے میدان میں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آپ بازی لے جائیں گے اور فریقِ مخالف بھگل ہو جائے گا۔ منگل کی شام کو اخبار ''مشرق'' کا ادبی صفحہ بھی دیکھا اور اب سنا ہے کہ اخبار ''جنگ'' لاہور سے بھی شائع ہوگا اور ادب کی اقلیم میں بھی دخل اندازی کرے گا۔ سو برادرِ عزیز! لنگر لنگوٹ کس لیجئے۔ نئے نئے محاذ کھل رہے ہیں۔ ''امروز'' اور ''حریّت'' میں آپ کے دونوں کالم ہم معنی تھے۔ مگر بڑے لذیذ تھے۔ افسوس کہ آپ نے جس محفل کا سماں باندھا ہے، میں اس کے لطیفوں سے محروم رہا۔

''فنون'' نے مصحفی کے شعر پر بحث کا آغاز کیا ہے۔ میں اس پر شبِ خون مار کر بحث کا رُخ ''امروز'' کی طرف موڑ رہا ہوں۔ اس خط کے ساتھ مضمون ارسالِ خدمت ہے۔ عزیز احمد کی وفات پر آپ کو تاثر بھیج رہا ہوں۔ ان کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر

لکھنے کا ارادہ ہے۔عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تو ہر وقت ''امروز'' کے لیے ہی سوچتا رہتا ہوں۔اب دیکھیے، آپ کب بھاگتے ہیں اور ''امروز'' مجھ سے کب اپنی جان چھڑاتا ہے!

مخلص.....انور سدید

سرگودھا 31-12-1978

.....

برادرم اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون۔حیرت ہے کہ آپ اہلِ قلم کانفرنس اسلام آباد میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ہر طرف رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔بعض خواتین تو بیوٹی پارلر سے پورا میک اپ کرا کے آئی تھیں لیکن آپ کے بغیر یہ محفل سونی سونی لگیں اور خواتین تو بے حد سوگوار دکھائی دیں۔آپ کی غیر حاضری کا زیادہ فائدہ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد نے اُٹھایا۔جب بھی دیکھا انہیں خواتین کی گیلری میں دیکھا اور بعض خواتین کا تو سانس پھولنے لگا تھا۔بعد میں وہ ناگفتنی شکائتیں بھی کرتی رہیں۔

''امروز'' میں آپ نے پرویز بزمی کی ڈائری کا سلسلہ جاری کر کے گویا اہلِ سرگودھا کو لوٹ لیا ہے۔میری کتاب ''فکر و خیال'' چھپ کر آ گئی ہے۔اس خط کے ساتھ پیشِ خدمت کرتا ہوں۔عذرا اصغر اہلِ قلم کانفرنس میں بے حد نمایاں تھیں۔ان کی وساطت سے میرزا ادیب صاحب کی کتابیں ملیں۔انہیں میں نے سفر کے دوران پڑھ ڈالا اور اب واپس ارسال کر رہا ہوں۔بصد شکریہ، بصد احسان۔کانفرنس کا ''کانوں سنا'' احوال ''امروز'' کے لیے پرویز بزمی صاحب لکھیں گے۔میں نے ایک کالم ''امروز'' ملتان کے لیے لکھا ہے اور اقبال ساغر صدیقی صاحب کو بھجوا دیا ہے۔اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص.....انور سدید

کوٹ ادّو 02-01-1982

.....

برادرم اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون۔میں نے آج ''غالب کا خط'' لکھ لیا ہے اور انشاء اللہ ایک آدھ روز میں صاف کر کے بھجوا دوں گا۔''ذکر اِس پری وش کا'' کی دو جلدیں ''تخلیق'' کے پتہ پر بھیجی ہیں۔اسی پیکٹ میں ''مٹی کا دِیا'' اور ''ناخن کا قرض'' کی دو جلدیں بھی رکھ دی ہیں۔یہ میں نے آپ سے مستعار لی تھیں۔ملنے پر رسید ضرور دیجئے۔تازہ ادبی رپورٹ ''امروز'' کے لیے ارسال ہے۔میں بہت اختصار سے کام لے رہا ہوں کہ اس اخبار میں مجھے مناسب جگہ ملتی ہے۔کوٹ ادّو کے اس گوشہ نشین کو آپ بامِ شہرت پر پہنچا رہے ہیں۔شکریہ! ہزار بار شکریہ۔لیکن میں اتنا ہی زمین کے ساتھ چمٹتا جا رہا ہوں۔شاید زیادہ روشنی میری آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا ان دنوں لاہور میں ہیں۔توقع ہے کہ منافقوں کے حلقے میں گھرے ہوئے ہوں گے اور آپ دور سے نظارہ دیکھ رہے ہوں گے۔اندر کی خبریں اپنے مخصوص تبصرے کے ساتھ مجھے بھی بھیجیں۔کوٹ ادّو میں شدید تنہائی محسوس کرتا ہوں۔اسے دور کرنے کے لیے ملتان چلا جاتا ہوں۔پہلی ملاقات راستے میں ڈاکٹر مقصود زاہدی صاحب سے ہوتی ہے۔دفتر کا کام بھگتا کر عرش صدیقی صاحب کو سلام پیش کرتا ہوں اور چائے پی کر رات گئے واپس کوٹ ادّو!

مخلص.....انور سدید

کوٹ ادّو 07-01-1982

◆◆◆

سلسلے محبتوں کے

دوستوں کے دوست اظہر جاوید کے خطوط ـــــ معاصرین کے نام

افسانہ نگار کرنل خاقان ساجد کے نام

پیارے کرنل ساجد!

آپ کہاں گم ہو گئے۔ بالکل گھپ چپ.....

کیا پھر سم بدل لی ہے.....گزشتہ دنوں سے بے شمار فون کئے ہیں۔ عین اُس وقت جب آپ کی محبت کی کوشش ثمر بار ہونے کو ہے، آپ ''گریزاں'' ہیں۔ یار جی، ''بہ صحبتِ اہلِ دل'' والے ایسے کٹھور نہیں ہو جاتے۔

آپ سے پُرانا تعلّق ہے، گہرا ناتا ہے.....رابطہ کریں.....کام تو خیر، آپ کی مہربانی سے ہو ہی جائے گا، آپ کے اور ہمارے مشترکہ بریگیڈیئر ایم ڈی ملک اپنے تئیں لگے ہوئے ہیں۔

آپ کو اصل میں نور جہاں نے ''چوڑ'' کر رکھا ہے.....میرا ماہی رنگ رنگیلا۔ چھیل چھبیلا.....ہائے نی کرنیل نی.....

باز آ جائیں.....شاد آباد رہیں!

رب راکھا، آپ کا.....**اظہر جاوید**

02-02-2012 .....

ڈاکٹر انور محمود خالد کے نام

محبّی انور محمود خالدؔ صاحب!

آپ کے خط نے خاصا حیران کیا۔ شکر ہے، پریشان نہیں کر سکا۔ حیرت اور حیرانی (حیرانگی نہیں) کی بات یہ ہے، صدیوں بعد آپ کو ''تخلیق'' کیسے یاد آ گیا؟ آپ کی محبت، دوستی اور اخلاص (''تخلیق'' اور اظہر جاوید سے) پر کوئی شُبہ کرنے کا شائبہ بھی نہیں، مگر کئی سال.....کئی کیا، بُہت سال سے آپ نے 'تخلیق' کو صرف پڑھنے ہی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔

اس پر ایک مولوی صاحب کا لطیفہ یاد آیا تھا، لیکن وہ سنانے والا ہے۔ دیکھتے ہیں آپ کا اشتیاق کیا رنگ لاتا ہے۔

اب معاملہ یہ ہُوا، آپ کا 24/جولائی والا خط حیرت ناک طور پر 24/جولائی ہی کو لاہور پہنچ گیا.....یہ کیسے ہُوا، اس کا جواب یقیناً ''کھوج کار'' انور سدید کے پاس بھی نہیں ہوگا.....

صورتِ حال یہ ہے، تب تک ''تخلیق'' (اگست والا) تیار ہو کر پریس روانہ ہونے کو تھا۔ مجھے افسوس ہُوا، اور اُن لوگوں کو غائبانہ خوشی ہوئی ہوگی، جن کے بارے میں یہ خط تھا اور چھپ نہیں سکا۔ خط واپس ارسال ہے۔ حالانکہ رسائل کے دفاتر سے مضامین اور غزل نظم واپس بھیجی جاتی ہیں۔ آئندہ شمارہ اگلے ہفتے تک آپ کو مِل جائے گا۔ اس خط کو نئے خط میں ملا کر.....

ع جیسے شرابیں شرابوں سے ملیں

ایک اور بار ''تخلیق'' سے تعلّق خاطر کی تجدید کر لیں.....

برسبیلِ تذکرہ..... آپ سالہا سال سے دیکھ رہے ہیں۔ 'تخلیق' ہر فروری میں فیضؔ کی یاد میں ایک آدھ مضمون چھاپتا ہے..... شاد آباد رہیں۔ ملاقات ہوئے بھی دیر ہوگئی ہے۔

رب راکھا، آپ کا..... **اظہر جاوید**

01-08-2008

.....

نارنگ ساقی جی کے نام

پیارے ساقی جی!

آپ بے پناہ مصروف رہتے ہیں اور جب تک آپ کے خط کا جواب آتا ہے، پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان چلنے والی بس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، اِس غریب بندے نے اپنی بیماری کا ذکر کیا تھا یعنی (Prostat) کا۔ اس مرض میں پیشاب بُہت آتا ہے اور گھنٹے گھنٹے کے وقفے سے پریشان کرتا ہے..... ڈاکٹر صاحبان (کئی دوست ڈاکٹر ہیں) تجربے کر کر کے اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں، کہ آپریشن ہوگا۔ اللہ نگہبان ہے۔ پرسوں چوتھے، رات کے وقت جب قتیلؔ شفائی صاحب کو آپ نے فون کیا تھا، میں وہیں موجود تھا۔ قتیلؔ صاحب نے نہیں چاہا تھا کہ میری بھدی آواز بھی آپ سُن لیتے۔ لیجئے..... خوش خبری.....

سلیمہ ہاشمی صاحبہ دِلّی آ رہی ہیں۔ ظاہر ہے، ان کے اپنے اور فیضؔ صاحب کے وہاں ہزاروں مدّاح ہیں۔ مگر اُنہوں نے سب سے پہلے آپ کا ذکر کیا ہے۔ ربّ..... آپ کو سلامت رکھے۔ ہمارے لئے تو پورا بھارت آپ ہیں۔ گھر کے پتے پر ''تخلیق'' اس لیے بھیجتا ہوں کہ آپ کو وہیں پر پڑھنے کا وقت ملتا ہے۔ دفتر والا پرچہ کسی اُردو دان کو دان کر دیا کریں۔

لاہور کی کچھ کتابیں جو مارکیٹ میں تھیں، حاضر ہیں۔ باقی کی جو ملیں گی، وہ بھی لے رکھوں گا۔ خلیجی ریاستوں والا نمبر کی بھی دو تین کاپیاں ارسال ہیں۔ تقسیم کر دیں اور اپنے پاس رکھ لیں۔ اچھے استعمال کے لئے۔ ''جنگ'' کا تراشا بھی ملاحظہ کریں۔ آپ کی وجہ سے میں بھی مشہور ہو رہا ہوں۔ قتیلؔ صاحب کا ابھی لندن جانے کا سلسلہ نہیں بن رہا۔ نوید کا ویزا نہیں مِلا۔ پھر کوشش کریں گے۔

مجتبیٰ حسین، امریکا فتح کر کے آ چکے ہوں گے۔ ہم تو حسرت ہی کر سکتے ہیں ہائے ہائے!! سلیمہ کے پاس بوجھ زیادہ نہ ہو جائے، ورنہ آپ کے لئے اور بھی کچھ بھیجتا۔ بہت بہت۔ بہت پیار۔

رب راکھا، آپ کا..... **اظہر جاوید**

14-07-2000

◆◆◆

حنیف باوا

ایہہ دو ہویں کون

اَوھ کھا گیا
اَوہ سارا کھا گیا
ککّھ نئیں چھڈیا پلّے
ڈھڈ سی اوہدا کہ ٹویا
نسّے جدھر نسنا چاہوے
نئیں چھڈاں گا
سارا ڈِھڈ نچوڑ لواں گا
اوویں جیویں لہو نال بھری
جوک نچوڑی دی اے
اِک نیں
بھجے جاندے دو جے نوں
لمی
اتے ور ہیاں بدھّی لمی
ڈھکار لکاندیاں
سنگھ پاڑویں واج ماردیاں کیہا

OOO

منزہ شاہد

آکھیا سی

آکھیا سی ناں! کم نئیں اوَنے سجناں دے سجناپے
مٹی پاء کے مُڑ آوَندے نئیں کیہ سجن کیہ ماپے

محل منارے چھڈنے پینے، کفن نوں کھیسا کوئی نہ
چار دِناں دی کھیڈ ای بیبا! نہ کر ایڈ سیاپے

کُوچ نقارہ وجنا اے جد سُرت کوئی نئیں رہنی
مال بگانا کُھس جانا اے جد پینے نیں چھاپے

مَن خالق دا کہنا، کر لئے کجھ مخلوق دی سیوا
ساہمنے اَوَندا اکھیٹا ویٹا جد اوہ تولے ناپے

ستر ماواں نالوں ودھ کے پیار کرے رب سوہنا
جیہڑا بندہ دُشمن لئی وی پیار دے گیت الاپے

چائیں چائیں کراں تیاری سوہرے گھر جاون دی
مُلاں ڈردا جس تھاں، سانوں جھوک سجن دی جاپے

مینوں کاہدی فکر منّزہ چھم چھم نچدی جاواں
میرا مُرشید اُچّا، میری فکر کرے گا آپے

OOO

انوار فیروز

پنجابی ہائیکو

ہر پاسے بحرانِ
باہروں سب کج چنگا اے
اندر اک طوفان

ایہوای منگیاں نیں
مینوں ہور نئیں حاجت کوئی
یاداد چنگیاں نیں

خُشیاں ہاسے نیں
یاداں تیریاں ایدھر اُدھر
چارے پاسے نیں

خواباں دی تعبیر
میرے دل وچ وسدی اے
تیری ایک تصویر

اُچا علم نشان
میں ظالم توں ڈردا نئیں
ایہہ میری پہچان

OOO

شگفتہ نازلی

غزل

مُک جانے رَستے دے ہنیرے دیوے اگے روشن نیں
چار پُھیرے سوچ سویرے، دیوے اَگے روشن نیں

آس دے دِیوے ماری حیاتی روشن رکھنے چاہیدے
تاں جے دُور ای رہن ہنیرے، دیوے اَگے روشن نیں

مُکھ توں اُداسی دا پرچھانواں، پر انہہ ہٹا کے ویکھو
خُشیاں دے پُھل کھڑن بتھیرے، دیوے اَگے روشن نیں

کِنی رات وی کالی ہوے، مُکنا اوہدا مُقدر اے
دَھرتی تے فیر اُگدے سویرے، دیوے اَگے روشن نیں

رِیت ایہو اے، لوکی سدا توں گلاں کر دے آئے نیں
چُپ ہو جان گے ایرے غیرے، دیوے اَگے روشن نیں

دُکھ دی مَالا ایسے ای لئی خورے کسے پروئی سی
سُکھ آوے حصّے وچ تیرے، دیوے اَگے روشن نیں

سچی خُشی ہے اوہی جہڑی سبھناں دے لئی ہووے
ہووے ناں لئی تیرے میرے، دیوے اَگے روشن نیں

ایس وی لَو وِچ پرچم پیا جویں جگدا اے
جگمگ کردے سارے بنیرے، دیوے اَگے روشن نیں!

OOO

اظہر جاوید.....''ٹر گیا ماہی''

شوکت علی (گلوکار)

اساں نہ تکیا ماہی میلہ لگا رہیا
گھر وچہ وسّے للاری کُڑتہ بگا رہیا

میاں محمد فرماتے ہیں:

''منہ نِگّا تے گل وڈیری نہ کر مت کوئی ہسّے
اعظم، شافعی، مالک، حنبل ایہہ مسئلے نہ دسے''

بطور آرٹسٹ میری حیثیت بہت چھوٹی اے پر خوش قسمت آں کہ ادب دی دنیا چہ جتھے دُجے وڈے ناں ہوئے نے مینوں پیار کرن والیاں وچہ اظہر جاوید ہوراں ناں میرے سینے تے لکھیا ملے گا اعلیٰ شاعر اعلیٰ پائے دا ہسدا وسدا انسان، محبتاں ونڈن والا.....

پاک ٹی ہاؤس تے کافی ہاؤس دی جوانی سی جدوں ساڈی ملاقات ہوئی او ہناں دے قریب مینوں اک گیت نیڑے لے کے آیا جہڑا میں کسے ڈائجسٹ وچوں لخیا سی گھر وچ گیت دی طرز بنائی تے سب توں پہلاں میری والدہ صاحب نے سنیا۔

کہن لگے ''اینا سوہنا گیت طرز وی سوہنی''

میں دسیا ''بے جی! (اسی اپنی والدہ نوں بے جی کر کے سدنے آں) ''ایہہ اظہر جاوید نے لخیا ے جہڑے بڑے چنگے انسان تے بے مثال شاعر نیں''۔

سو سو پیچ بنا کے تینوں روز ملن آ جانا واں
توں وی سوچ دی ہوویں گی میں جھلا واں دیوانہ واں

1975ء وچ میں ٹی وی تے شوکر داساں ''جی آیاں نوں'' بڑا پسند آیا لوکاں نوں۔ پروڈسر سیّد زاہد عزیز سان۔

اکثر اظہر جاوید ہوراں کہنا ''مینوں وی سناؤ گیت''۔

میں کہندا ''جناب! میں ایہدی پراپر ریکارڈنگ کروا کے دیواں گا''۔

مگر بدقسمتی ایہہ گل توڑ نہ چڑھی۔

اظہر جاوید کدی کدی آکھدا سی ''یار! اینوں ویکھ ایہہ کیسا تابعدار۔ اپنی ماں دی پسند دا گیت مینوں نئیں سناندا'' بلکہ اک دن افضال شاہد نوں کہن لگے اپنے یار نوں آکھو گیت سنائے، فیر افضال شاہد ہوراں دے آخری گھڑی سب دوستاں چہ کھلو کے مینوں کہن لگے

مِلدے رہو یا کرو یار
اک دوجے دا خیال کرو

سرفراز سیّد، آذر صاحب، طالب رضوی، یونس جاوید، افتخار مجاز ساریاں نے ایہہ گل سُنی۔ لانگ کوٹ، کیپ پا کے مینوں خاص طور نے آکھیا ''اپنا وی دھیان رکھو''

میں کہیا ''اللہ تعالیٰ تہانوں تتی واہ نے لائے''

میری گل سُن لیندے سن، ہس پیندے سن، تے ہولی ہولی کہنا ''ایہہ سب بکواس اے'' جدوں میں کہیا۔

''تُسی ہسپتال وی اوہ پسند کردے او جہڑ یا کسے ناں نال مِلد جُلدا ہووے'' ڈاکٹر سبزواری صاحب والا، ریحانہ مشتاق..... میں کہنا عمرانا مشتاق ہسپتال''

جوش صاحب دے جنازے توں فارغ ہو کے سانوں گڈیاں تک آؤندیاں کافی ٹرنا پیا۔ مینوں بڑی خوشی ہوئی جدوں اوہناں اپنے پُتر ''سونان'' ہوراں دا تعارف کروایا۔ اودوں وی بڑی ہمت کر کے اورٹر دے رہیئے۔ میں سونان نوں دعاواں دے کے اک گل آکھی کہ نامور بندیاں دی اولاد نوں پیو دے نال زیادہ وقت گزارنا چاہی دا اے۔ ''سونان جی! تُسی اظہر جاوید جیہئے عظیم شاعر دے پتر او، ایہہ پہچان تہانوں زندگی چہ قدم قدم ساتھ دے گی کم آئے گی۔ وڈے لوکاں دی اولاد نوں تے شکر کر کے والد دے نال رہنا چاہی دا اے۔ اج میری گل کیتی یاد آرہی ہے۔ سونان اظہر نوں رب سلامت رکھے۔ اوہ بوہڑ دی تھاں بوہڑ دسیا اے۔ رب کرے سونان نوں وی باپ توں زیادہ رنگ لگن۔

میرا اک شعر اظہر جاوید دی نذر:

ماہی ٹُریا تے شہر سُنسان ہو گیا
کِنوں دسّاں میرا کِناں نقصان ہو گیا

◆◆◆

افضال شاہد

''انتہائی استقلال سے مسلسل ایک ادبی پرچہ نکالنا کس قدر جان جوکھوں کا کام ہے..... ان کٹھنائیوں سے میں ذاتی طور پر نبرد آزما ہو چکا ہوں اور ناکام رہا ہوں۔ آپ کے حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے کہ ایک الگ ''محلے'' میں ایک اور طرح کی ''بیٹھک'' سجائے آپ کو برسوں بیت گئے مگر آپ کی صحت آج بھی جواں ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے۔''

تبصرے

کافرستان (محمود دانشور ایرانی)

مبّصر : انور سدید

محمود دانشور ایرانی کے سفر نامہ ''کافرستان'' کے ناشر منیر احمد منیر نے لکھا ہے:

''سفر نامہ کسی علاقے کی اس دور کی ثقافت، تہذیب، تمدن، رسوم و رواج، روایات، عادات، اطوار، سوچ، افکار اور اقدار کا آئینہ ہوتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے رائے ظاہر کی: ''سیّاح بھی ایک طرح کا مؤرخ ہوتا ہے اور مؤرخ کا کام تاریخ اور جغرافیے کے حوالے سے محض وقائع نگاری ہے۔''

منیر احمد منیر کی اس تنقیدی رائے پر ماضی کے ایک سفر نامہ نگار محمود دانشور ایرانی نہ صرف پورے اُترے بلکہ وہ اس تاریخی حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ نصف صدی قبل ان کا چترال، دیر، سوات، چکدرہ اور کافرستان کا فارسی میں لکھا ہوا سفر نامہ خلیل احمد نے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تو اس کی وقائع نگاری اور مشاہدات نے ہنگامہ بپا کر دیا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں اس حقیقت کو اُجاگر کیا تھا کہ اس خطّے میں صدیوں سے آباد لوگوں کے مقدر میں ہولناک اندھیرے ہی لکھے تھے۔ اور ان اندھیروں کو روشنی کی کرن سے محروم رکھا گیا تھا۔ قید خانے سے مماثل اس ماحول میں محرومیوں کی وحشت برستی تھی۔ محمود دانش ور نے اس ماحول کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور پھر اپنے مشاہدات کو سفر نامے کی صورت دے دی اور عنوان ''کافرستان'' رکھا جس میں کتاب کا مطالعہ کرنے کی ترغیب موجود ہے۔

''کافرستان'' کا مصنف محمود دانشور ایران سے پاکستان آیا تھا۔ وہ یہاں ایک ماہ قیام کر کے اس نوزائیدہ ملک کے بارے میں ایک کتاب لکھنا چاہتا تھا لیکن اس سرزمین کے نظاروں، ماضی کی تاریخ اور حال کے واقعات کی مقناطیسی قوّت نے اس سیّاح کو اپنی گرفت میں لے لیا اور سیّاحت کے دوران ریاست سوات، دیر اور چترال کی طرف جا نکلا جہاں ''کافرستان'' کے علاقے نے ان کی خصوصی توجہ حاصل کی۔ نوزائیدہ پاکستان کے لوگوں کے لیے یہ علاقہ غیر معروف تھا اور اس دور میں سیّاحت کو فروغ نہیں ملا تھا۔ محمود دانشور نے شاید پہلی مرتبہ اس خطّے پر ایک ایسے سیّاح کی نظر ڈالی جو وقائع نگاری پر قدرت رکھتا اور اپنے مشاہدات کے ثمرات قارئین تک پہنچا سکتا تھا۔ انہوں نے زمینی واقعات کے ساتھ، ماضی کے تاریخی حالات کو بھی نظر میں رکھا اور حقیقت شناسی کا ثبوت دیا تو ان حیرتوں کو جمع کیا جو اس خطّے کے رسوم و رواج سے تعبیر ہوتی ہیں۔ محمود دانشور اپنی حیرت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں کا ہر شخص جہاں بھی کھڑا ہوتا ہے تھوکتا ہے۔ یہاں تک کہ بس میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بھی تھوکتے جاتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ نسوار کھاتے ہیں۔''

.....

''.....میں نے پیشاب کی حاجت محسوس کی۔ جب میں نے ایک افسر کو کہا، اس نے ایک آدمی کو اشارہ کیا وہ دوڑا ہوا گیا اور میرے لیے ایک ڈھیلا اُٹھا لایا۔ میں نے ڈھیلے کو ہاتھ میں لے کر کہا ''میں اس کو کیا کروں؟'' افسر نے کہا ''یہ پیشاب کے لیے ہے۔''

.....

''میں ایک پاخانہ میں گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ پہلے ہی ڈھیلوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے..... باہر نکلا تو دیکھا کہ کئی لوگ باہر سڑکوں پر کھڑے ہیں.....اور انہوں نے اپنے اپنے بائیں ہاتھ شلوار میں ڈال رکھے ہیں۔ دائیں ہاتھ سے شلوار کا آزار بند پکڑا ہوا ہے۔ یہ لوگ استنجا کر رہے تھے۔''

یہ معمولی حیرتیں ہیں۔ کتاب ہوش ربا حیرتوں کا مرقّع ہے۔ منیر احمد منیر نے اس سفرنامے کا نیا ایڈیشن چھاپ کر ماضی کی تاریخ زندہ کر دی ہے۔ یہ ''طلسم ہوشربا'' قسم کی کتاب 200 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت -/250 روپے ہے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ آتش فشاں، 78۔ ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور

.....

مکالماتِ مُسلم (ابوالامتیاز ع۔س۔مسلم)

مبّصر : انور سدید

پروفیسر محمد عبیداللہ نے زیرِ نظر کتاب ''مکالماتِ ع۔س۔مسلم'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''انٹرویو ایسا طریقۂ کار ہے جس میں انسان کو فی البدیہہ جواب دینا پڑتا ہے۔ اس لیے ''زیرِ انٹرویو شخصیت'' کی زندگی کے اصل سوانح.....اس کے حقیقی خیالات و افکار اور عقائد و نظریات سامنے آنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔''

میں نے علاّمہ ابوالامتیاز ع۔س۔مسلم کے انٹرویوز کی کتاب ''مکالمات'' مؤلف کے اس قول کی روشنی میں پڑھی تو احساس ہوا کہ انٹرویو لینے والوں نے.....جن میں ڈاکٹر اسد فیض، عمران نقوی، سرور حسین نقش بندی، صلاح الدین شیخ، ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن، مہتاب راشدی اور راحیل اطہر جیسے متنوّع نظریات و خیالات کے ادبائے کرام شامل ہیں، زیرِ انٹرویو شخصیت کو داخلی اور خارجی زاویوں سے جانچنے اور پرکھنے کی معنی آفریں کوشش کی ہے۔ علاّمہ ع۔س۔مسلم دانشور ہیں، شاعر ہیں، نثر نگار ہیں اور سب سے اہم یہ کہ عصری حقیقتوں کے شناسا ہیں، ان کے فن اور شخصیت کے نقوش ان کی کالم نگاری، سیّاحت نویسی، افسانہ نگاری اور تحقیقی و تنقیدی مضمون نگاری میں بکھرے ہوئے

اورانہوں نے مشرق ومغرب میں آباد اُردو کے ادیبوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے انٹرویوز میں وہ زندگی، ادب اور سیاستِ عامہ کے علاوہ مذہبیات، فلسفہ، اور سائنس کے موضوعات پر بھی اپنا منفرد نقطۂ نظر بیان کرتے اور اپنے قارئین کے ذہنی، علمی اور ادبی اُفق کو روشن کرنے کی کاوش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی زندگی کے حالات سے بھی پردے ہٹاتے چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اسد فیض نے جناب ع۔س۔ مسلم کی تصنیفات وتخلیقات کا موضوعی اعتبار سے احاطہ کیا ہے اور اس دور کو خصوصی طور پر یاد کیا ہے جب علاّمہ مسلم نے کراچی میں ''مکتبہ نیا راہی'' کی بنیاد رکھی تھی اور تحسین سروری، مولانا حسرت موہانی، انور عنایت اللہ، شوکت صدیقی، مسلم ضیائی، عبدالرؤف عروج اور قیسی رام پوری کی ایسی کتابیں چھاپی تھیں جنہیں کراچی کا منافع پسند ناشر چھاپنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ جناب عمران نقوی نے ان کے سیاسی، ادبی اور فکری شخصیت کا سراغ لگانے کی کاوش کی ہے۔ سرور حسین نقش بندی نے نعت کے حوالے سے انٹرویو لیا ہے۔ صلاح الدین شیخ کا انٹرویو ان کے حالاتِ حیات پر مشتمل ہے اور ان کے خدمتِ خلق کے زاویے کو سامنے لاتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بیرونی دنیا میں آباد ہونے والی اُردو کی نئی بستیوں میں پانے والے ادب کے بارے میں ع۔س۔ مسلم سے معلومات حاصل کی ہیں۔ محترمہ مہتاب راشدی نے ان کو مذہبی، سماجی اور تہذیبی تناظر سے بازیافت کرنے کی کاوش کی ہے۔ سماء ٹی وی کے راحیل اظہر کے سوالات میں مسلم اُمہ کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے اور حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، آج مسلم امّہ بحرانوں کا شکار کیوں ہے؟

متذکرہ بالا اجمال سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علاّمہ ع۔س۔ مسلم نے اپنی ذاتی زندگی میں نظریاتی طور پر توحید، رسالت اور دینِ حق کو فوقیت دی۔ زندگی کا بہت سا حصّہ پاکستان سے باہر مشرقِ وسطیٰ اور عرب امارات میں گزارا اور وہاں اپنے عصری شعور کو بروئے کار لاکر اپنے گردوپیش کو متاثر کیا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ قحط الرّجال کے اس دور میں علاّمہ ع۔س۔ مسلم ایک ایسے مصنّف ہیں جن کے فکر ونظر کی سمت راست ہے اور ان کی بے شمار کتابیں پاکستانیت کی نمائندہ ہیں۔ انٹرویوز کی اس کتاب میں انہوں نے خود انکشافی کا عمل دیانت دارانہ ذمہ داری سے ادا کیا ہے۔ 192 صفحات پر مشتمل یہ کتاب -/350 روپے میں مکتبہ نیا راہی 1/1-3P، دوسری منزل، پی۔ای۔سی۔ ایچ۔ ایس۔ شارع فیصل، کراچی (75400) سے مل سکتی ہے۔ مصنف کا پتہ: ابوالامتیاز ع۔س۔ مسلم۔ پوسٹ بکس نمبر 102609، دوبئی (یو، اے، ای)

.....

جھومتے لفظ (غلام نبی اعوان)

مبّصر : انور سدید

''جھومتے لفظ'' کے مصنّف غلام نبی اعوان نے اپنی اس کتاب کا انتساب ان الفاظ میں کیا ہے:

''ان محروم جذبوں کے نام جنہیں زبان نہیں مل سکی''

لیکن ان کی متذکرہ بالا عنوان کی کتاب پڑھیں تو وہ لفظوں کے رقص میں جذبوں کی محرومی کا ازالہ کرتے نظر آتے ہیں اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ غلام نبی اعوان نے اپنی زندگی کے دورانیے کو ایک ہوش مند انسان کی طرح گزارا ہے اور گردوپیش کے ساتھ وہی سلوک کیا

ہے جو ایک ذی تصور ادیب معاشرے کے ساتھ کرتا ہے یعنی وہ منفی حالات سے نبرد آزما ہوتے اور قسمت کی کلائی کو محنت کے ہاتھ سے مروڑتے ہیں، اور مثبت واقعات سے داخلی مسّرت کشید کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اعوان صاحب اپنے جذبات کو سبکسار کر رہے ہیں اور کامیابی کے حصول کے لیے اُردو زبان کی ثروت مندی سے استفادہ کر رہے ہیں۔

''جھومتے لفظ'' غلام نبی اعوان کے ایک کم تیس مضامین کی کتاب ہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین ''گرو و گرما'' ''گدا و گورستان'' کی سرزمین ملتان کے تناظر میں لکھے گئے ہیں جہاں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں اعوان صاحب کا تبادلہ ہوا تو انہوں نے لکھا:

''ملتان تبادلے سے دل کی بہت سی حسرتیں اور خواہشیں پوری ہوئیں''

اور ملازمت کے سلسلے میں ہی کسی دوسری جگہ جانے کا حکم ملا تو انہوں نے لکھا:

''ملتان کیا چھوٹ رہا ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ میرا جی سے کچھ چھوٹ رہا ہے۔''

انہوں نے ملتان کے احسانات کا ذکر کشادہ دلی اور فراوانی سے کیا ہے کہ ''یہاں آیا تو میری اپنی تکمیل ہوئی، مجھے ملتان نے اپنے ہونے کے احساس کی دولت عطا کی''..... ملتان والوں نے سمجھایا کہ ''غم کو بھلانے کا تعمیری طریقہ یہ ہے کہ ہنسو، مسکراؤ اور غم کو قہقہوں کی کھنکھار سے مدہوش کر دو''..... زندگی کو انشائیہ نگار کی آنکھ سے دیکھنے اور اشیا، مظاہر اور اشخاص کے ذاتی مطالعے سے مثبت اور خوش نظر نتائج نکالنے کا سلیقہ اس کتاب کے مضامین..... ''دوسری شادی کی کہانی''..... ''سسرال کا تحفہ''..... ''ادیب، مونچھ اور سائنس دان''..... ''جوانی کا آخری سال''۔ وغیرہ مضامین میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ غلام نبی اعوان نے اپنے گزارے ہوئے ماضی کو صرف یاد ہی نہیں کیا بلکہ ماضی کو زمانۂ حال میں زندہ کیا ہے اور اس عمل کے دوران ہمیں اپنے دوستوں عرش صدیقی، اے، بی، اشرف، بابر غفار، شمیم ترمذی، خیال امروہوی، ریاض انور، سعید احمد اختر، انوار احمد، عبدالرؤف شیخ سے بھی ملوایا ہے جن کے نام جریدۂ ادب پر سنہری حروف سے لکھے ہوئے ہیں اور جن کی شخصیت کی تابانی غلام نبی اعوان کی اس کتاب میں پھیلی ہوئی ملتی ہے۔

غلام نبی اعوان افواجِ پاکستان میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ قلم اور قرطاس سے رشتہ، بچپن میں ہی قائم ہو گیا تھا۔ ملتان میں انہوں نے کالم نگاری اختیار کی اور سچ اور صرف سچ لکھنے کی عادت پیدا کر لی۔ یہ کتاب بھی مجھے ان کے منتخب کالموں کا مجموعہ ہی نظر آتا ہے جس کے دوسرے حصے میں سعید احمد اختر، آغا گل، ملک مقبول احمد اور انوار احمد کی کتابوں پر تبصرے ہیں۔ اس کتاب میں انشائیہ کی منتشر صورت اسی طرح موجود ہے جس طرح فلک پیما، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی اور ''محشرِ خیال'' کے مصنّف سجاد حسین کے مضامین میں بکھری ہوئی ملتی ہے۔ اُردو نثر کی یہ خوبصورت کتاب 200 صفحات پر مشتمل ہے۔ ملنے کا پتہ..... مقبول اکیڈمی، چوک اُردو بازار، سرکلر روڈ۔ لاہور

.....

محبت بھیگتا جنگل (احمد حماد)

مبّصر : انور سدید

یہ دو شعرا ایک تازہ فکر شاعر کے ہیں:

پہلے بارش ہوتی تھی تو یاد آتے تھے　　اب جب یاد آؤ، تو بارش ہوتی ہے

اس خوف سے اُجڑی ہوئی بستی پہ نہ رویا آ جائے نہ اس بار بھی سیلاب پہ سیلاب

یہ شاعر احمد حمّاد ہے اور ان کے شعری مجموعے کا نام ہے..... ''محبت بھیگتا جنگل''۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کی دو کتابیں ''شام بے چین ہے'' اور ''ترے خیال کا چاند'' شائع ہو چکی ہیں جنہیں نہ صرف مناسب پذیرائی ملی بلکہ احمد حماد کو ایسے نوجوان شعرا میں شمار کیا گیا جن کی دردمندی کے سخن میں حضرت میاں محمد کی پنجابی شاعری کی روایت موجود ہے۔ احمد حمّاد نے بھی اپنے دامن میں پھول باندھ رکھے ہیں اور ان کے اشعار سے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ دوسری طرف انہوں نے زندگی کے وسیع تر عرصے میں اپنی شاعری کو ہچکیوں کا نمائندہ بھی بنایا ہے اور غزل ہو یا نظم وہ آج کے انسان کے ساتھ جو بحرانوں کے گھمسان میں زندگی بسر کر رہا ہے اور عافیت سے محروم ہے۔ ہمدردی کا اظہار ہی نہیں کر رہے بلکہ رجائیت آمیز انداز میں یقین دلا رہے ہیں:

.....خواب گھر کی کھڑکی سے.....وقت کی گلوکارہ.....لوریاں سناتی ہے..... پیار سے بلاتی ہے

اور ''شہرِ افسوس کا خوف'' طاری ہوتا ہے تو احمد حماد کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں اور وہ دعا کرتے ہیں:

''مرے خوشیوں بھرے دن غار میں سوئے پڑے ہیں.....مرے مولا.....انہیں بیدار کر دے''

احمد حمّاد کی شاعری ہمیں زمانی اور مکانی گردوپیش سے انوکھے انداز میں متعارف کراتی ہے۔ ان کا لہجہ جدید غزل کا نیا لہجہ ہے۔ شاعری کی یہ منفرد کتاب 134 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت -/350 روپے۔ ملنے کا پتہ: جہانگیر بکس، 237۔ ریواز گارڈن، لاہور۔

.....

پاکیزہ زندگی (علاّمہ عبدالستار عاصم)

مبّصر : انور سدید

''ہر عبادت کی ابتدا طہارت اور پاکیزگی سے ہوتی ہے.....صفائی کی اہمیّت وضرورت کے باوجود اس سے اغماض کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان بھی جن کا مذہب طہارت اور پاکیزگی کو بہت زیادہ اہمیّت دیتا ہے، اس سے نابلد اور لاپروا ہو چکے ہیں۔''

یہ تاثّرات علاّمہ عبدالستار عاصم کے ہیں جو اس سے قبل دینی اور ادبی موضوعات پر کئی کتابیں شائع کر چکے ہیں اور علمی دنیا میں مقامِ امتیاز رکھتے ہیں کہ ان کے فکر کی جہت مثبت ہے اور ان کے اظہار کی سمت راست ہے اور انکا سماجی مشن آج کے گمراہ انسان کو دینِ حق کی طرف لانا اور پاکیزہ زندگی کا وہ راستہ دکھانا ہے، جس کا بنیادی تعیّن ہادیِ اسلام نے کیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب ''پاکیزہ زندگی'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس میں جسم کو آلائشوں سے پاک کرنے اور بدن کو طہارت سے مصفّٰی کرنے کے اسلامی طریقے بتائے گئے ہیں۔ علاّمہ عبدالستار اس خیال کے حامی ہیں کہ جسم پاک اور صاف ہو تو اس کے باطن میں روح بھی طاہر انداز میں متحرک رہتی اور انسان کی کامیابیوں کی ضامن بن جاتی ہے۔ یہ کتاب صرف پڑھنے کی نہیں بلکہ یہ انسانی جسم کے ساتھ انسانی رُوح کی طہارت کا وسیلہ بھی ہے۔ اور اس کی تحسین ڈاکٹر عبدالقدیر خان، ملک مقبول احمد، سعید بدر، افتخار مجاز اور خاور نعیم ہاشمی جیسے دانشوروں نے کی ہے۔ کتاب کے ماخذات قرآنِ حکیم اور اسلامی کتب ہیں۔ اس کتاب کو دیکھ کر علاّمہ عبدالستار عاصم کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ ان کی یہ قومی خدمت اللہ تعالیٰ قبول

کرے اور قوم پاکیزگی اور طہارت کی طرف مائل ہو۔ ضخامت 270 صفحات۔ قیمت پانچ سو روپے۔ ملنے کا پتہ: مقبول اکیڈمی، چوک اُردو بازار، سرکلر روڈ، لاہور۔ (فون: 042-37324164)

کائنات مُٹھی میں

شاعرہ : ایم زیڈ کنول

صفحات : 128 قیمت : -/250 روپے

پبلشر : باقر پبلی کیشنز، لاہور تبصرہ : آفتاب خان

ایم۔ زیڈ کنول ایک طویل عرصہ سے شاعری کر رہی ہیں یہ اُن کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے جو غزلیات پر مشتمل ہے۔ کنول کی غزل روایت سے جُڑی ہوئی ہے جسے اُنہوں نے نئے نئے استعارات، تشبیہات، تلمیحات کے ساتھ نئی زمینوں اور نئی ردیفوں کے سانچے میں ڈھال کر جدید انداز میں پیش کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ اُن کی غزلیں صرف عام مروجہ شاعری کی طرح عشق و محبت کا احاطہ نہیں کرتی ہیں بلکہ وہ سماج اور انسانی اقدار کے نیک و بد رویّوں کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چند اشعار یہ ہیں:

ہوا کا راستہ مسدود کر دو حکمِ شاہی ہے گھٹن کی تتلیاں من میں بسانے کی اجازت ہے

.....

صبا اوڑھے ہوئے صَرصَر کی چادر لیے آئی سہارا خودکشی کا

.....

سِلے ہیں ہونٹ کسی کے، کسی نے زہر پیا ہوئی ہے دار و رسن پر یہ مہربانی نئی

ایم زیڈ کنول کی شاعری میں اپنی ذات کا نوحہ بھی شامل ہے۔ وہ حوادث زمانہ کو اپنی ذات پر اُتار کر نئے حالات و واقعات کی منظر کشی کرتی نظر آتی ہیں۔

سنگِ خارا کی چتائیں اوڑھ کر گھر سے بے گھر کر دیا برفاب نے

.....

رات بھر تو کنول رہے رقصاں صبح دم آب میں چِتائیں ہیں

.....

آرزو کے چناروں سے لے کر دُھواں میری آنکھوں میں ساون برسنے لگا

مجموعی طور پر ایم۔ زیڈ کنول شاعری میں لب و لہجے کا اچھا اظہار کرتی ہیں تاہم اُن کے ہاں بعض فنی خرابیاں بھی موجود ہیں اور خاص طور پر قافیہ سازی پر غور کرنا چاہیے۔

◆◆◆

جگن ناتھ آزاد

''آپ نے تخلیق کی جو، جوت جلائی ہے، اس کی بہتیری روشنی انڈیا میں بھی پہنچتی ہے۔''

قندِ مکرّر

اپنی بات.....سب کی بات

برّصغیر کے نامور دانشور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ایک طویل خط لکھا ہے۔ یہ خط کیا ہے ایک سیر حاصل مضمون۔ ایک سچا کھرا جائزہ اور بے لاگ تجزیہ ہے۔ اردو کے ادبی رسائل کی پوری تاریخ کو انہوں نے اس میں سمو دیا ہے۔ کہیں کہیں کسی کو اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ اس موضوع پر موصوف سے تفصیلی گفتگو کر کے انھیں کچھ اور حقائق، کچھ مزید اپنی مجبوریاں اور حالات و واقعات کی دوسری جھلکیاں بھی دکھائی جاسکتی ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود ایک ناقابلِ تردید حقیقت یہ ہے کہ ادبی رسالہ اور خالصتہً ادبی رسالہ ہر دور میں چل سکتا ہے۔ کیسے.....؟ یہ ایک طویل بحث ہے۔ کاغذ کی کمیابی نے پہلے ہی ادھ موا کر رکھا ہے، اس بات کو کسی خوشگوار وقت تک کے لئے اٹھا رکھ جائے تو بہتر ہے۔

اظہر جاوید

.....

مکرمی اظہر جاوید! آداب۔ آپ نے ''تخلیق'' کے کچھ شمارے بھیجے تھے۔ میں نے بار بار ان کی ورق گردانی کی۔ کچھ چیزیں پڑھیں کچھ دیکھیں۔ آپ کی ''باتیں'' خاص طور پر پڑھیں۔ اس گفتگو کی روشنی میں جو انٹرکانٹی نینٹل کے سبزہ زار میں ہوئی، میں نے آپ سے کہا تھا کہ آج کے رسالے صرف ادبی ہوتے ہیں۔ علمی نہیں ہوتے۔ اگر ان میں موضوعات کا تنوّع ہو تو شاید زیادہ پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ سکیں۔ لیکن بعد میں سوچا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ ادبی رسالوں کی معاشی بدحالی کے بارے میں سوچنا ہو، تو ملکی صحافت کے معاشی مسائل کی روشنی میں سوچنا ہوگا۔ میرے نزدیک ادبی رسالوں کے ''مالک مدیر'' اس حقیقت کو نہیں پہچان سکے کہ اب یہ کام کسی ایک فرد کے بس کا روگ نہیں رہا۔ اخبار، ہفت روزہ ہو یا ماہنامہ، وہ سرمایہ چاہتا ہے۔ اور وہ بھی بہت زیادہ کیونکہ ایک تو کتابت، طباعت، کاغذ اور دفتر کا خرچ ہے جو بڑھتا چلا جارہا ہے دوسرے، ایڈیٹر کا پیٹ بھی روٹی مانگتا ہے۔ کپڑا مانگتا ہے۔ اور بہر حال مکان کی بھی ضرورت ہے اس لئے اسے اتنی تنخواہ ملنی چاہیے، کہ وہ آج کی مہنگائی میں گزارہ کر سکے۔ تیسرے، جب ضرورتیں محدود تھیں، تو لکھنے والے افسانہ نگاری، مقالہ نویسی اور شاعری کو آمدنی کا ذریعہ نہیں بناتے تھے۔ اب ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔ اس لئے ملازم پیشہ ادیب بھی ذیلی آمدنی حاصل کرنے کے لئے ادبی نگارشات کو ذریعۂ منفعت بنانا چاہتے ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اگر ایڈیٹر کو تنخواہ ملتی ہے، کاغذ والے کو قیمت ملتی ہے، کاتبوں اور چھاپے خانے والوں کو معاوضہ ملتا ہے۔ دفتر کا کلرک اور چپڑاسی بھی مشاہرہ پاتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ لکھنے والوں کو کچھ نہ ملے؟ ہمارے

ہاں عجیب رواج ہے کہ رسالے جاری کرنے والے صرف لکھنے والوں سے قربانی چاہتے ہیں۔اور کسی سے نہیں چاہتے۔آخر کیوں؟اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر لکھنے والا معاوضہ چاہتا ہے۔مثلاً میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی ادبی،علمی رسالے یا کسی محدود آمدن کے ہفت روزے کو مضمون دیتا ہوں۔تو پیسے نہیں لیتا۔کوئی پیش بھی کرے تو نہیں لیتا۔اس لئے کہ میرے پاس آمدنی کے دوسرے وافر وسائل موجود ہیں اور یوں بھی قناعت پسند ہوں۔لیکن ہر شخص کی یہ کیفیّت نہیں ہوتی۔انھیں واقعی ذیلی آمدنی کے وسائل درکار ہیں۔چوتھے آپ اچھے سے اچھا رسالہ مرتّب کرلیں۔اچھے سے اچھے ادیبوں کی کاوشیں جمع کرلیں۔اس کے باوجود رسالہ نہیں بکتا۔کیوں؟اس لئے کہ قارئین کو یہ اطلاع نہیں ملتی کہ فلاں رسالہ اچھا مواد پیش کررہا ہے گویا ''جنگل میں مورناچا،کس نے دیکھا''۔والا معاملہ ہوجاتا ہے۔ایسے میں رسالے کی پبلسٹی ضروری ہے اور پبلسٹی پر روپیہ صرف ہوتا اور وہ بھی بہت زیادہ کیونکہ کسی اخبار کی اشاعت جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنے ہی اشتہاروں کے نرخ زیادہ ہوتے ہیں۔

پانچویں' پرچہ بیچنے کے لئے صرف اچھے مواد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ظاہری حسن و جمال بھی درکار ہوتا ہے جو پرچہ سب سے زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے،گاہک کا ہاتھ اسی طرف بڑھتا ہے اور خوبصورت سرورق کے لئے بھی پیسہ درکار ہے۔

چھٹے' اب پرچہ بیچنے والے ایجنٹ اور ہاکر زیادہ کمیشن چاہتے ہیں۔جس سے مالک کی آمدنی میں کمی ہوجاتی ہے۔

ساتویں' اشتہار کسی اخبار یا رسالے کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔سفارش اور لحاظ سے ایک آدھ یا دو چار اچھے اشتہار مل جاتے ہیں۔لیکن ان سے کام نہیں چلتا۔زیادہ اشتہار اور بہتر نرخوں پر اشتہار اشاعت کی بنا پر ملتے ہیں۔اشاعت کم ہو تو نہیں ملتے۔اور ملتے ہیں تو ایسے نرخوں پر' جن سے بات نہیں بنتی۔

پس میرے نزدیک اگر کسی ادبی رسالے کو واقعی کامیاب بنانا ہے،تو ضروری ہے کہ اس کی ملکیت کسی فرد کے ہاتھ میں ہونے کی جگہ مشترکہ سرمائے کی کمپنی کے ہاتھ میں ہو۔تاکہ بھرپور انداز میں سرمایہ لگایا جائے۔ایڈیٹر کو اچھی تنخواہ دی جائے۔مینجر کو بھی اچھا مشاہرہ دیا جائے۔اچھا معاوضہ دے کر اچھے مضمون لکھوائے جائیں۔روپیہ اور عقل صرف کرکے پروڈکشن میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ہر رسالے کی کوئی نہ کوئی انفرادیت اور کام کی سمت متعین کی جائے۔موضوعات میں تنوّع ہو۔پبلسٹی اعلیٰ پیمانے پر کی جائے۔تاکہ اشاعت ابتداء ہی میں اچھی ہو۔اور وہ بڑھتی چلی جائے۔جوں جوں اشاعت بڑھے گی،اشتہار زیادہ تعداد میں ملیں گے اور زیادہ نرخوں پر بھی۔اشتہارات اور پرچے کی فروخت سے جو آمدنی ہو اس سے پرچے کو مزید بہتر بنایا جائے۔تاکہ اشاعت اور بڑھے۔اور نتیجے میں مزید اشتہار حاصل ہوں۔ڈائی جسٹ میگزین سرمایہ کاری اور بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت ہی کے ذریعے سے کامیاب ہوتے ہیں۔پھر ہم کیوں نہ یہی ذریعہ ادبی رسالوں کے لئے برتیں؟

میں نے جو باتیں لکھی ہیں۔وہ پاپولر ادبی رسائل پر صادق آتی ہیں۔یعنی ایسے رسائل پر،جن میں،افسانے زیادہ ہوں۔عام فہم مضامین کی کثرت ہو۔اور اچھی اچھی نظمیں اور غزلیں چھپتی ہوں..... رہے وہ ادبی رسائل جو ''اعلیٰ معیار'' کے ہوتے ہیں۔اور صرف دانش وروں کے پڑھنے کی چیز ہوتے ہیں،تو ان کا حال صرف ہمارے ہاں ہی خراب نہیں،دوسرے ممالک بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی حال خراب ہی ہے اور ان کے مدیر بھی فقدانِ ذوق کے شاکی ہیں۔

تو میرے بھائی! دل چھوٹا نہ کیجئے۔اس زمانے والی باتیں نہ کیجئے،جب ادبی رسالے آسانی سے چل جاتے تھے۔اور ہاں مجھے

یاد آیا کہ اس دور میں بھی سینکڑوں رسالے نکلتے اور بند ہوتے تھے۔ اور کوئی ایک آدھ رسالہ کامیاب ہوتا تھا۔ مثلاً ہم نے اپنی ہوش میں ''نیرنگِ خیال''، ''عالمگیر''، ''ادبِ لطیف''، ''ادبی دنیا''، اور ''ہمایوں'' کو کامیاب ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ حکیم یوسف حسن ادارت کے ساتھ طب بھی فرماتے تھے۔ حافظ محمد عالم (عالمگیر) نے ایک ہفت روزہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ اور ساتھ کتابیں بھی بیچتے تھے۔ ''ادبِ لطیف'' ایک اشاعتی ادارے کے سہارے سے زندہ رہا۔ ''ادبی دنیا'' مولانا صلاح الدین احمد کی درویشی کے طفیل زندہ رہا۔ اور ''ہمایوں'' میاں بشیر احمد کی دولت کے سہارے سے! یہ جو ''نقوش'' کامیاب ہوا، تو صرف اس لئے کہ اس نے دوسروں سے الگ روش اختیار کر لی۔ اور ساتھ ہی ایک اشاعتی ادارہ بھی موجود ہے۔ کسی رسالے کی کامیابی کے لئے بڑا نام بھی اتنی مدد نہیں دیتا۔ ہمارے والد کا رسالہ ''فانوسِ خیال'' آٹھ مہینے کے بعد جان ہار گیا۔ عابد علی عابدؔ کا ''ہزار داستان'' ایک آدھ سال سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ امتیاز علی تاجؔ کا ''کہکشاں'' دو اڑھائی سال میں سسک سسک کر ختم ہو گیا۔ اختر شیرانی کا ''رومان'' دو سالوں میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ آغا جی اے گل نے ہمارے والد کی سرپرستی میں ''ادیب'' جاری کیا۔ لیکن بند کرنا پڑا۔ مولانا تاجورؔ نجیب آبادی نے ''ادبی دنیا'' اور ''شاہکار'' یکے بعد دیگرے جاری کئے۔ اور دونوں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ حفیظؔ جالندھری نے ''مخزن'' کا دورِ ثانی بڑے ٹھاٹھ سے شروع کیا لیکن قسمت میں ناکامی لکھی تھی۔ ''نوائے وقت'' والوں نے اسی نام سے ایک رسالہ مولانا حامد علی خان کی ادارت میں نکالا۔ لیکن بند کرنا پڑا۔ مولانا حامد علی خان نے ''الحمرا'' جاری کیا۔ وہ بھی بند ہو گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ ''اوراق'' کا حشر تو تازہ داستان ہے۔ اگر آپ کا رسالہ کامیاب نہیں ہو رہا تو کونسی قیامت آ گئی؟ میرے نزدیک ''تخلیق'' کو کامیاب کرنا ہے تو اسی نسخے پر عمل کرنا ہوگا۔ جو میں نے تجویز کیا ہے..... ویسے میں آپ کے لئے ضرور مضمون لکھوں گا اور جلد لکھوں گا۔ سالانہ چندے کا چیک بھی ارسال خدمت ہے۔ اندازے سے بھیج رہا ہوں۔ کیونکہ رسالے میں سالانہ چندے کی رقم کا اندراج نہیں ہوا۔

عبدالسلام خورشید
10۔ سالک روڈ، مسلم ٹاؤن، لاہور-12

(اپریل 1972ء)

◆◆◆

قطعہ

شاہدؔ! رہے گا زندۂ جاوید وہ ضرور
جِس کے بغیر گلستاں پامال ہو گیا
اُس کی کمی کو کوئی بھی پورا نہ کر سکا
اظہرؔ کو اِس جہاں سے گئے سال ہو گیا

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ سونانؔ!

''تخلیق' کا تازہ شمارہ ملا۔آپ نے انور سدید صاحب کے ساتھ مجھے بھی ''تخلیق تحسین ایوارڈ'' سے نوازا ہے۔میں نے تو ادب میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔بہرصورت یہ آپ کی محبت ہے یا پھر یہ اظہر جاوید مرحوم کی دوستی کا ثمر ہے۔میرے حالات میں بین الاقوامی اعزازات کا پورا حصہ شامل ہے۔ہوسکتا ہے کہ آپ کے نزدیک بین الاقوامی حوالوں کی کوئی اہمیت نہ ہو،تاہم آپ نے ایک دو باتیں ایسی لکھ دی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔

آپ نے لکھا ہے ''ابتدائی تعلیم لاہور کے ایک ٹاٹ اسکول میں حاصل کی''.....حالانکہ میں نے تو اسکول کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔صرف محلے کی مسجد میں قرآن ناظرہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔دوسری بات یہ کہ.....ادبی جریدہ ''ماحول'' ماہنامہ نہیں ہفت روزہ تھا۔آپ نے میری کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ۔''انہوں نے مرزا اسداللہ خان غالبؔ کی اردو شاعری کو بھی پنجابی میں ترجمہ کیا ہے''۔آپ نے میری جس کتاب کا حوالہ دیا ہے ''غالب جنہوں ہر کوئی چنگا آکھے'' دراصل یہ نثری کتاب ہے،جو پروفیسر کرار حسین کا ایک اردو مقالہ تھا اور جب غالبؔ کی سو سالہ یادمنائی گئی تھی تو ''ادارہ یادگار غالبؔ'' نے چند کتابیں شائع کی تھیں،چنانچہ فیض احمد فیض صاحب کے کہنے پر مرزا ظفرالحسن نے اس کا مجھ سے پنجابی ترجمہ کرایا تھا۔یہ ایک مختصر سی کتاب تھی۔باقی آپ نے جو کچھ لکھا ہے،وہ آپ کی محبت ہے جس پر تبصرے کی گنجائش نہیں ہے مگر یہ دو تین حوالے غلط تھے،اس لیے ان کی وضاحت ضروری تھی۔

اللہ آپ کو خوش وخرم اور صحت مند رکھے تاکہ آپ اپنے والد کی یادگار کو قائم رکھیں۔

شفیع عقیل (کراچی)

.....

﴿2﴾ سونان اظہر جاوید!

اس وقت میرے سامنے ماہنامہ ''تخلیق'' کا تازہ پرچہ مارچ 2013ء نہ صرف رکھا ہوا ہے بلکہ چیخ چیخ کر اپنے منفرد ہونے کا ثبوت بھی دے رہا ہے.....اس کا سرورق سلیمہ ہاشمی نے بنایا ہے جس سے کسی تکلف کے بغیر معلوم ہو رہا ہے کہ یہ پرچہ ادبی ہے اور ادبی بھی اپنے نرالے انداز کے ساتھ۔میرا مطلب ہے یہ سرورق اس قدر واضح ہے کہ جس سے یہ صاف پتا چل رہا ہے کہ نہ صرف حال میں یہ پرچہ اپنا جواب نہیں رکھتا مستقبل بھی بہت زوردار رکھتا ہے۔اس قدر زوردار کہ یہ سرورق بتا رہا ہے کہ سونان جاوید اس معیاری ادبی پرچے کو نہایت حسن وخوبی سے جاری رکھ سکے گا۔یہ کوئی معمولی بات نہیں.....کم از کم مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ ''تخلیق'' جاری رہ سکے گا لیکن تازہ پرچے

نے میرے خیالات یک لخت بدل ڈالے۔سرورق کھول کر جب اس کی مندرجات کو دیکھتے ہیں تو قلب ونظر روشن ہوجاتے ہیں.....فیض صاحب کی یاد میں انور سدید اور بسمل صابری نے اپنے اپنے انداز میں باتیں کی ہیں۔آگے چلتے ہیں تو ''ممتاز شیریں۔اُردو کی پہلی نقاد'' پر ابن سلطان کا عمدہ مضمون نظر آتا ہے۔اس مضمون کے بعد منظومات پر نظر پڑتی ہے تو وہاں بھی اردو کے بڑے بڑے لکھنے والے نظر آتے ہیں اور قاری کی نگاہیں ان کی تعظیم میں جھک جاتی ہیں اور منظومات کو پڑھنے میں کشف القلوب کا کام شروع ہوجاتا ہے۔غرض تازہ پرچہ کی کونسی چیز ہے جو قابل توجہ نہیں ہے۔یہ تو ایک منہ بولتا پرچہ ہے۔

آخر میں اپنی بات میں پھر دہراتا ہوں کہ میرے لئے یہ سوچنا بہت تکلیف دہ تھا کہ اظہر جاوید کے بعد ''تخلیق'' ختم ہوجائے گا مگر ماشاءاللہ سونان اظہر جاوید نے یہ ثابت کردیا کہ ''تخلیق'' اپنی اعلیٰ روایات کے ساتھ جاری رہے گا اور خوب جاری رہے گا۔آمین!

سیّد مشکور حسین یاد (لاہور)

.....

﴿3﴾ محترمی سونان جاوید!

''تخلیق'' کا نیا شمارہ تو مجھے حیرت زدہ کر گیا۔اس حیرت کا باعث آپ کا جاری کردہ ''تخلیق کا تحسین ایوارڈ'' ہے جس کا آغاز آپ نے اس ناچیز انور سدید اور جامع الصّفات شخصیت شفیع عقیل صاحب سے کیا ہے۔شفیع عقیل صاحب اس اعزاز کے صحیح حقدار ہیں کہ انہوں نے صحافت کے خارزار میں آبلہ پا ہوکر ادب کے گلشن میں پھول مہکائے ہیں،اُردو اور پنجابی ادب کی گراں قدر خدمت کی ہے۔میں نے اپنی ساری زندگی محکمہ آبپاشی کی سروس میں گزار دی اور ادب کو فرصت کے اوقات کا ''مشغلہ'' بنائے رکھا۔اُردو ادب کا عام سا قاری ہونے پر ہی طمانیت محسوس کی۔''تخلیق'' کا یہ ایوارڈ میرے معمولی کام کا بہت بڑا اعزاز ہے کہ یہ ایک ادبی ادارے کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔میں آپ کا اور ایوارڈ کمیٹی کے ارکان کا (جن کے اسمائے گرامی سے میں ناواقف ہوں) دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔میری خوشی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ آپ نے یہ ایوارڈ یادِ مہربان اظہر جاوید کی پہلی برسی پر جاری کیا ہے۔میں توقع کرتا ہوں کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔اس سے قبل جناب محمد طفیل نے ''نقوش ایوارڈ'' جاری کیا تھا۔ان کے صاحبزادے جاوید طفیل صاحب نے اسے ''مدیرِ نقوش'' کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک جاری رکھا۔لیکن اب عرصے سے ''نقوش'' کی اشاعت کا سلسلہ بھی رُکا ہوا ہے۔آپ نے ''تخلیق'' کی اشاعت کو برقرار رکھ کر بھی کارنامہ انجام دیا ہے۔قارئین کرام کی یہ رائے درست ہے کہ اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کو جس مقام پر چھوڑا تھا،آپ نے اسی مقام سے اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھایا ہے اور یہ ''تخلیق'' کے ارتقاء کا سفر ہے جو کامیاب نظر آتا ہے۔اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کی منفرد روایات قائم کیں اور ان پر استقلال سے عمل کیا۔ایک روایت یہ تھی کہ فروری کے شمارے میں فیض صاحب پر مضامین چھاپتے تھے۔اس پرچے میں فیض صاحب پر گوشہ دیکھ کر دوگونہ خوشی ہوئی کہ آپ نے اس کا سرورق محترمہ سلیمہ ہاشمی سے حاصل کیا اور ان سے اپنے عظیم باپ پر ایک مضمون بھی لکھوالیا۔بسمل صابری صاحبہ کی نظم ان کی عقیدت کی مظہر ہے اور یہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔

میں ابنِ سلطان سے متعارف نہیں ہوں۔ممتاز شیریں پر ان کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔بالخصوص اس لیے کہ اُردو کی اس پہلی نقّاد خاتون کو لائبریری کے کسی کونے میں دفن کردیا گیا ہے۔ابنِ سلطان نے ان کو فن کے حوالے سے یاد کیا۔''تخلیق'' میں آپ نے متعدد نئے نام متعارف کرائے ہیں،اور لکھنے والے اُردو دنیا کے گوشے گوشے سے تشریف لائے ہیں گویا ''تخلیق'' کو انٹرنیشنل (بین الاقوامی) پرچہ بنادیا ہے۔مبارکباد۔میں آپ کی کامیابیوں کے لیے دعا کرتا ہوں۔

آخر میں جام سجاد حسین صاحب کا شکریہ واجب ہے کہ انہوں نے میری کتاب ''پرندہ سفر میں'' پر انگریزی اخبار ''دی نیشن'' میں تبصرہ کیا اور آپ کا ممنون ہوں کہ اس کا ترجمہ ''تخلیق'' کے قارئین تک پہنچایا۔ میں نے باقاعدہ شاعر ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا بلکہ اب تک جو کچھ شاعری کے نام پر چھپا ہے اسے شوقیہ طبع آزمائی اور قافیہ پیمائی تصور کرتا ہوں۔ جناب جام سجاد حسین کا یہ جملہ:

''ان کی شاعری میں ورڈز ورتھ کی روحانیت، کالرج کے مابعد الطبیعیاتی عناصر کا تاثر اور شیلے کی نیچرل شاعری کا وجدان نمایاں ہے۔''

مجھے تو حیران کر گیا ہے۔ آپ بھی اسے محترم تبصرہ نگار کی فیاضی سے تعبیر کیجئے اور نظر انداز کر دیجیے۔ جام سجاد حسین نے مشرق کے اس مسکین کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ حالاں کہ میں زمین پر رہنا پسند کرتا ہوں۔

انور سدید (لاہور) .....

﴿4﴾ ڈیئر سونان!

آپ ''تخلیق'' باقاعدہ طور پر نکال کے ایک بڑا ادبی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ہمارے دوست اظہر جاوید کی میراث کو اس قابل ستائش انداز سے آگے بڑھانے کے لیے آپ کو مبارک۔

فخر زمان (لاہور) .....

﴿5﴾ محترمی سونان اظہر!

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مارچ 2013ء کا شمارہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اتنا اچھا، معیاری اور زیادہ مواد آپ نے اس عجلت میں کیسے تیار کر لیا۔ آپ کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔ فیض صاحب کے بارے میں مختصر سہی مگر گوشہ اچھا لگا۔ اظہر جاوید صاحب نے شعیب اور سلیمہ ہاشمی سے جس طرح ''کئے جاؤ کوشش میرے دوستوں'' کے جذبے کے تحت مضمون تحریر کرانے کی کوشش کی وہ ان کی مستقل مزاجی اور جذبۂ کارکردگی کا ثبوت ہے۔ میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کی طرح فرداً فرداً تو تمام تحریروں کا جائزہ نہیں لے سکتا لیکن مجموعی طور پر آپ کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔ مضامین کا معیار اور توازن آپ نے بہت خوبی سے نبھایا ہے۔ نظم و نثر دونوں کو اہمیت دی گئی ہے اور معیار کو برقرار رکھا گیا ہے۔ افسانے معیاری ہیں خدا جانے آپ یہ سب کچھ کون سی زنبیل سے برآمد کرتے ہیں۔ آپ بیتیاں بھی خوب ہیں لیکن ان میں دلچسپی کا عنصر کم ہے اور واقعات کا تذکرہ زیادہ ہے۔ آپ نے اپنے والد کی پہلی برسی بڑے خلوصِ محبت اور جذبے کے ساتھ منائی۔ گوشۂ اظہر جاوید میں کافی مواد موجود ہے۔ بیرون ملک پاکستانیوں کے افسانوں میں ان کے دلوں کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ سب سے اچھی کہانی مجھے ذاتی طور پر ''غفورا خاکروب'' لگی۔ کہانی کو حنیف باوا نے بہت خوبی اور خلوص سے پیش کیا ہے اور اس کا انجام تو بالکل غیر متوقع لیکن حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسے بڑی کہانی کا انعام دے سکتے ہیں۔

یاد آیا آپ ہر شمارے میں بہترین کہانی کو انعام دینے کا سلسلہ کیوں شروع نہیں کرتے۔ جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فون پر بھی کیا۔ آپ بیتیاں اور تنقیدی مضامین کا معیار بھی آپ نے برقرار رکھا ہے۔ شفیع عقیل نے ایک بہت اچھے سلسلے کو ختم کر دیا۔ مجھے اُمید ہے کہ

آپ 'پہلی بات' کا انداز اور اُسلوب مختلف رکھیں گے اور منفی باتوں کے ساتھ مثبت اور حوصلہ افزا باتوں کا بھی تذکرہ کریں گے۔ شفیع عقیل صاحب سے برسہا برس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اب تو ان کی شخصیت ایک بارعب بیوروکریٹ کی نظر آتی ہے لیکن اندر سے وہ بالکل نہیں بدلے۔ گوشۂ فیض تشنہ ہے۔ ممتاز شیریں سے آپ نے نئی نسل کو متعارف کرایا۔ یہ ایک ضرورت تھی۔ آپ کو شاباش ہی دے سکتا ہوں۔ ''انجمن خیال'' کو سجائے رکھیے۔

علی سفیان آفاقی (لاہور)

.....

﴿6﴾ محترم جناب سونان اظہر جاوید!

ہم آپ کو سلام پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اظہر جاوید کی خواہشوں کی ادبی زمین کو آباد رکھا ہے ورنہ کہاں کوئی اولاد اس قسم کی ''جاگیر'' جس میں مالی منفعت کا دُور دُور تک کوئی امکان نہ ہو اُسے سنبھال کر رکھتی ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ وقتی اُبال ہے اور آپ جونہی جذبات کے حصار سے نکلیں گے تو ''تخلیق'' کا سلسلہ رُک جائے گا۔ ہم آپ کے اس اقدام کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ ''تخلیق'' جاری ہے۔ سب سے زیادہ لائقِ تحسین یہ امر ہے کہ آپ نے ''تخلیق'' کے معیار کو بھی قائم رکھا ہے۔ محترم اظہر جاوید کی روح یقیناً اس امر سے سکون پا رہی ہوگی۔ اللہ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ آمین! اُن جیسے حلیم الطبع، شریف النفس لیکن اپنے حق کے لئے ڈٹ جانے والے اور کلمۂ حق بلند کرنے والے ادیب اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ہم کوئی تحریر بھیجتے تو اُن کا فون آ جاتا اور خوب حوصلہ افزائی کرتے۔ جب کبھی تقاریب میں ملاقات ہوتی تو عمر میں فرق ہونے کے باوجود وہ ایک قریبی دوست کی طرح ملتے تو جی سکون پاتا۔ لاہور کے کئی فنکشنز میں اُن سے ملاقات رہی۔ محمود شام کے ساتھ تو ہمارا مشترکہ دوستانہ تھا۔ گوجرانوالہ میں بھی سعید اقبال سعدی کی ''سفینۂ ادب'' کی تقاریب میں بھی ملاقات رہی۔ ''تخلیق'' ہمیں باقاعدگی سے بھیجتے تھے۔ اب جب کہ آپ کے دفتر سے فون آیا کہ پرانے لکھنے والوں کو آپ یاد فرما رہے ہیں، تو اظہر جاوید بہت یاد آئے۔ خوشی ہوئی کہ آپ روایات کے امین ٹھہرے ہیں اور آنکھ بھر آئی کہ اظہر جاوید آج ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ تاہم اُن کا نام ہمارے سینوں میں زندہ رہے گا۔ آپ ''تخلیق'' کی آبیاری کرتے رہیے۔ ہمارے لائق جو کام بھی ہو حکم کیجیے۔ اللہ آپ اور آپ کی ٹیم کو ہمیشہ خوش اور بلند حوصلہ رکھے۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

.....

﴿7﴾ مُحبِ عزیز القدر سونان اظہر صاحب!

موبائل فون کی سہولت نے خط کتابت کا مزا چھین لیا ہے، ہم بطورِ مدیر ''ادبِ لطیف'' اپنے معزز و محترم اہلِ قلم معاونین سے خط لکھ کر نئی تحریر طلب کرتے تھے تو اُن کو یک گونہ مسرت ہوتی تھی، ہمیں بھی ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی تھی۔ اب عجب دَور ہے، ہر رسالے والا SMS کرتا ہے، میں وہ بغیر پڑھے delete کرتا رہتا ہوں۔ یوں بھی 'رومن' میں اوٹ پٹانگ Message سارے دن مجھ سے تو پڑھے نہیں جاتے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ SMS کا ''پیکج'' استعمال کرنے والا کتنا کنجوس ہے کہ اپنی آواز بھی سنانا نہیں چاہتا۔ اس تمہیدِ طولانی کے بعد آمدم برسرِ مطلب۔ آپ نے فون کیا، خاصی دیر تک اپنی گفتگو سے شاد کام کئے رکھا اور پھر تازہ چیزوں کی فرمائش کی۔ سر

آنکھوں پر۔ دو تازہ غزلیں فوری طور پر ارسال ہیں، تفصیلی تعریفی و توصیفی خط کے لئے انتظار کیجئے۔ عدمؔ صاحب پر موعودہ مضمون کے ساتھ کچھ مفصل باتیں عہدِ موجود کے ''تخلیق'' اور مُدیر ''تخلیق'' پر بھی ہوں گی۔ ڈریں مت، مَیں غلطیوں کی نشان دہی کی صورت میں محض کیڑے ہی نہیں نکالتا۔ آپ بہتر کام کر رہے ہیں تو تعریف کے بھی حقدار ہوں گے! فی الحال اجازت۔

ناصرؔ زیدی (لاہور)

.....

﴿8﴾ بہت پیارے بیٹے سونان!

دہلی سے نارنگ ساقی کا فون آیا ہے کہ میری طرف سے ''تخلیق'' کو روانہ کیا گیا، ایک ہزار ہندوستانی روپے کا منی آرڈر مل گیا ہے۔ مجھے دِلی سکون محسوس ہُوا کہ اپنے مرحوم بھائی کے لئے جو کام اُن کا بیٹا انجام دے رہا ہے، ہم اُس میں شامل ہو رہے ہیں اور انشا اللہ تا عمر شامل رہیں گے۔ ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ موصول ہو چکا ہے۔ بہت بہت شکریہ!

لدھیانہ میں جناب ڈاکٹر کیول دھیر ''تخلیق'' کے لئے جی جان سے کوشاں ہیں اور پوری تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ مَیں بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ ''تخلیق'' کے لیے جو بھی ہو سکے گا پہلے کی طرح ہی ہم لوگ سرگرم رہیں گے۔

سردار پنچھی (انڈیا)

.....

﴿9﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

تازہ ''تخلیق'' سے ذوق و شوق کی پرانی تازہ کاری عود کر آئی۔ اس کی رونق سے دل کا مکان شاد و آباد ہوا۔ اس کے دم قدم سے گویا ع حُسن دیکھو غریب خانے کا

ڈاکٹر ابدال بیلا کا افسانہ ''گھونسلے سے گری ہوئی چڑیا'' بظاہر ایک کہانی ہے مگر متعدد ان کہی کہانیوں کو محیط ہے۔ خطوط میں فی الوقت اظہر جاوید کے زمانے والی بات نہیں مگر کچھ کر دکھانے کا جذبہ ضرور موجود ہے۔ شاعری ''بڑھی چڑھی'' ہے۔ دل کو لگی۔ انور سدید کا یہ شعر بہت پسند آیا۔

دل میں شوقِ سفر سمایا تھا
پا برہنہ نکل پڑے گھر سے

مطلع کے دوسرے مصرع میں عین ساقط ہو گئی ہے۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

.....

﴿10﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا شمارہ دسمبر 2012ء اور پھر مارچ 2013ء ملا تو دل شاد ہو گیا کہ آپ میرے عزیز دوست اور اپنے والدِ مرحوم کی اس ادبی یادگار کو نہ صرف برقرار رکھ رہے ہیں بلکہ اس کے معیار کو بھی بہتر سے بہتر بناتے جا رہے ہیں۔ مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ مرحوم کے تقریباً تمام دوستوں کا تعاون آپ کو حاصل ہے۔ البتہ مالی تعاون کے معاملے میں جو صورتِ حال ہے وہ کسی حد تک ''تخلیق'' کے اداریے سے واضح ہو رہی ہے۔ آپ نے اداریے میں کتاب اور ادبی جریدے کا موازنہ کرتے ہوئے اور ناشرین کے استحصال کا ذکر کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ ''کتاب چھاپنا کاروبار ہے، رسالہ چھاپنا ادبی خدمت بلکہ عبادت ہے''.....آپ نے بجا فرمایا مگر کتاب چھاپنا صرف ناشر کے لئے کاروبار ہے، لکھنے والے کے لئے تو اس میں دو چار نہیں بلکہ کئی سخت مقامات آتے ہیں۔ رہی بات رسالہ چھاپنے کی تو بھائی ''ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں'' اور آپ جیسے چند سلجھے ہوئے لوگ ہیں جو ادبی پرچے کے لئے 90 فی صد اپنے وسائل اور 10 فی صد سالانہ زرِتعاون بھیجنے والوں سے مل کر پرچہ نکالتے ہیں۔ ورنہ یہاں ادبی پرچوں کے حوالے سے بھی ایسے ''ایڈیٹروں'' کی کمی نہیں جو لکھنے والوں کو فون کر کے اُن کے لئے ''گوشہ'' اور ''خصوصی نمبر'' نکالنے کے لئے باقاعدہ بڑی بڑی رقوم کا مطالبہ کرتے ہیں اور اظہر ہے کہ کوئی جینوئن ادیب تو ایسا کرنے سے رہا، چنانچہ اُسے بلیک لسٹ کر دیا جاتا ہے اور ''میڈ اِن تائیوان'' والا مال مارکیٹ میں لایا جاتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ کچھ ایسے لوگ امریکہ، کینیڈا اور کچھ عرب ممالک میں بیٹھ کر چند ادبی جرائد کو اِس شرط پر فنانس کر رہے ہیں کہ صفحۂ ادارت پر اُن کا نام تو نہ آئے مگر ہر شمارے میں ان کی ''عظمتِ فن'' پر خوب خوب مضامین بھی ہوں اور اُن کی تخلیقات بھی ہوں.....خیر یہ بہت طویل اور تلخ موضوع ہے اس لئے یہیں ختم۔ جہاں تک پرچے کو سہ ماہی بنانے کی تجویز کا تعلّق ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ خاص طور پر اس لیے کہ یہ روایت بھی اظہر جاوید مرحوم نے ڈالی تھی کہ ''تخلیق'' ہر دو ماہ کے بعد شائع ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ ''تخلیق'' کے اجراء سے پہلے کوئی پرچا دو ماہی بنیاد پر شائع ہوا ہو اور ''تخلیق'' کے بعد بھی ابھی تک کوئی اور پرچا دو ماہی نہیں ہے لہٰذا اس انفرادیت کو برقرار رکھئے۔ محترم عزیز میرٹھی کا مضمون ''گورے کالے'' ان کی خودنوشت کا ایک باب محسوس ہوتا ہے مگر اپنے عمدہ طرزِ اظہار سے افسانہ بھی لگتا ہے۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ افسانہ ہی ہو مگر اپنی ہیئت سے خودنوشت لگتا ہو۔ محترم سلیم آغا قزلباش کا انشائیہ ''تھکن'' بے حد پسند آیا اور ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم کی بہت سی تحریریں یاد آئیں جن میں وہ انشائیے کے فنّی اور ''موادی'' تقاضوں پر زور دیتے تھے۔ زیرِ تبصرہ انشائیہ ہر لحاظ سے ان پر پورا اُترتا ہے۔

نسیمِ سحر (اسلام آباد)

.....

﴿11﴾ محترمی سونان اظہر!

ایک روز پہلے ''تخلیق'' مِلا۔ اس سے پہلے عین اسی روز برادرم اظہر جاوید کے ہاتھ کا لکھا ہوا لفافے پر پتے والا ''تخلیق'' کا شمارہ ملتا تھا، حیرت ہے۔ جو ترتیب اظہر نے بنائی تھی آپ نے من وعن اُس کو اپنایا ہے۔ سرورق نہایت دلآویز کتابت، دلکش جلد بندی عمدہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تین ماہ کے عرصہ میں جو بہتری آپ لا سکتے ہیں اُس پر آپ نے بھرپور محنت کی ہے۔ آپ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اگرچہ یہ دورانیہ تھکا دینے والا ہے۔

شفیع عقیل اور ڈاکٹر انور سدید صاحب میرے عمِّ مکرم واقعی تحسینِ ایوارڈ 2013ء کے مستحق ہیں۔ آپ غور فرمائیں میری عمر 75 برس ہے مگر میں تسلسل سے آدھا گھنٹہ بیٹھ کر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ مگر انور سدید صاحب بالکل نہیں تھکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے سارا دن اور رات جب بھی وقت ملتا ہوگا لکھنے میں صرف کرتے ہوں گے۔ اللہ رب العزت اُنہیں صحت سے نوازے اور عمر دراز عطا کرے۔ آمین!

آفتاب راجا (جوہر آباد)

.....

﴿12﴾ عزیزِ گرامی قدر سونان اظہر جاوید صاحب!

آپ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں کیونکہ آج کل کے نامساعد حالات میں ''تخلیق'' کی اشاعت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس طرح آپ نے نہ صرف ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے بلکہ جناب اظہر جاوید کے عظیم مشن کو بھی حیاتِ ابدی بخشی ہے۔ بلاشبہ آپ ''تخلیق'' کے معیار اور اس کی علمی اور ادبی انفرادیت کو قائم رکھ کر ایک عظیم کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ نیز اِس انمول ادبی وراثت کو نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔

رشید آفرین (سیالکوٹ) .....

﴿13﴾ سونان اظہر جاوید!

فون پر آپ سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔

آپ کا گلہ جائز ہے کہ بانو آپا (بانو قدسیہ) اپنی تحریر کے ساتھ ''تخلیق'' کے نئے سفر میں شریکِ سفر نہیں۔ دراصل ان کے صحت کے معاملات اب انھیں خطوط کے جواب دینے کی بھی مہلت نہیں دیتے۔ کوئی تازہ تحریر لکھنا تو بعد کی بات رہی۔ گھر سے باہر کسی ادبی تقریب میں شمولیت کے لیے مہینوں بعد ان کا جانا ہوتا ہے، وہ بھی بہت مجبوراً کہ صحت اب اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اس کے باوجود میری کوشش رہتی ہے کہ میں ان کو گھر کی قید سے باہر نکالوں لیکن میری کوشش کو کامیابی میں بدلنے میں چار پانچ ماہ کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ تب میں انھیں کسی ادبی تقریب میں لے جاتا ہوں ان کی ذہنی تروتازگی کے لیے۔

جب میں نے آپا جی (بانو قدسیہ) سے آپ کے فون کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ اظہر جاوید کا بیٹا میرا بھی بیٹا ہے۔ میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ سونان جس لگن اور محنت سے کام کر رہا ہے ایک دن وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔

محترم اظہر جاوید ادبی دنیا کے درویش تھے۔ ویسے تو اس ہوش ربا گرانی میں جتنے لوگ بھی ادبی رسائل نکال رہے ہیں وہ سبھی درویش ہیں لیکن اظہر جاوید اپنی طرز کے منفرد درویش اس حوالے سے تھے کہ انھوں نے نئے لکھنے والوں اور والیوں کو بہت سپورٹ اور پروموٹ کیا۔ لکھنے والا سب سے پہلے پذیرائی چاہتا ہے جو ''تخلیق'' سے زیادہ کہیں نہیں مل سکتی۔

اظہر جاوید کا ایک اور انوکھا اور نرالا وصف یہ تھا کہ بے شمار دوستوں کی بہت ساری محبتوں کو انھوں نے بے لوث ہو کر اور خلوصِ دل سے اکٹھا کیا تھا جیسا کہ ہم دیکھتے رہے ہیں کہ ان کے دور میں ''تخلیق'' میں واجبی سے اشتہارات ہوا کرتے تھے اس کے باوجود ''تخلیق'' کی اشاعت میں تسلسل ہمیشہ برقرار رہا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ آپ بھی ''تخلیق'' کے ساتھ ویسے ہی بے لوث خلوص کے ساتھ جڑے رہیں گے۔

آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ محترم اظہر جاوید نے آپ کو رسالے کی ادارت کی تربیت سے دور رکھا۔ اس بنا پر اب آپ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ کچھ ایسا ہی سلوک کرتے رہے ہیں کہ وہ زندگی کے دشوار گزار راہوں سے مشکلات کے کانٹے خود ہی چنتے رہتے ہیں۔ اس عمل میں اپنے بچوں کو شامل نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں ان کے جانے کے بعد یہ عمل نئے سرے سے سیکھنا پڑتا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو تخلیق کاروں کی تحریریں حروفِ تہجی کی بجائے سنیارٹی کے لحاظ سے ترتیب دی جانی چاہئیں۔ اس سلسلے میں آپ محترم انور سدید صاحب سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اثیر احمد خان (لاہور) .....

﴿14﴾ عزیز گرامی قدر سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا مارچ کا شمارہ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ سرورق پر فیض کے ساتھ اظہر بھائی کی تصویر، فیض کی یاد میں مضامین اور نظم اچھی لگی۔ ابنِ سلطان کا مضمون بھی پسند آیا۔ غزلیں، نظمیں معیاری ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد، نجم الحسن رضوی، ابدال بیلا، سلیم آغا قزلباش، نجمہ عثمان، حنیف باوا، سلمیٰ اعوان اور نثار احمد صدیقی کے افسانے خوبصورت ہیں۔ آپ نے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی کہکشاں جمع کر رکھی ہے۔

شفیع عقیل نے کرنل مجید ملک کے بارے میں لکھ کر حق ادا کر دیا۔ فرخندہ لودھی، عزیز میرٹھی، طارق محمود اور نذیر فتح پوری کی آپ بیتیاں بھی کمال کی ہیں۔ گوشۂ اظہر جاوید اور پنجاب رنگ بھی پسند آیا۔ ڈاکٹر معین قریشی کا اپنا ہی رنگ ہے۔ غرض پرچہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

.....

﴿15﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید!

آپ کی عنایت سے ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ مارچ 2013ء میرے سامنے ہے۔ ''پہلی بات'' کا یہ جملہ اداریے کا ماحصل ہے کہ ''تخلیق'' سے تعاون ادبی عبادت ہے۔'' مجھے اُمید ہے کہ اس عبادت میں لوگ جوق در جوق شامل ہوتے جائیں گے۔ تخلیقات و نگارشات کے علاوہ کسی ادبی جریدے کو جاری رکھنے کے لیے پیسے کی ضرورت اظہر من الشمس ہے لہٰذا عام قاری کے ساتھ ساتھ ادباء کو بھی اپنا تعاون جاری رکھنا چاہیے۔

''تحسین ایوارڈ'' کا سلسلہ ''تخلیق'' کی جدّت ہے اور خوب ہے۔ دونوں بزرگ انور سدید اور شفیع عقیل اس سے زیادہ کے حقدار ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کے لیے بسملؔ صابری کا یہ شعر خوب ہے ؎

جب قوم کے خوابوں کی بھی تعمیر ہو بسملؔ
دھڑکن کو بھی شعروں کی کرن کرتے رہیں گے

نظم ''غنودگی'' میں خواب کو آسمان کا رزق اور غنودگی کو زمین کا رزق کہنا ڈاکٹر وزیر آغا کو ہی زیبا، فکر و احساس کی کیسی بالیدگی ہے۔ واہ ڈاکٹر صاحب واہ!

اب افسانوں کی بات ہو جائے۔ 'مٹی کی مہک' ڈاکٹر رشید امجد کا تاثراتی افسانہ۔ ہائے غریب الوطنی۔ اپنی مٹی سے تعلق اور احساس کبھی مٹتا نہیں البتہ زندگی کی شام اس دُکھ کو زیادہ محسوس کرتی ہے۔ افسانے کا ایک جملہ ''ہاتھ جو کھل گیا دل بند ہونے لگے'' اپنے اندر ایک کرب سمیٹے ہوئے ہے۔ نجمہ عثمان کا ''خالی گلدان'' خالی گلدان کو پُر کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ ایک جذبۂ سرشاری مطلوب ہے۔ جنید کے والدین نے بہر حال صحیح فیصلہ کیا جو منطقی تھا۔

حنیف باوا کا 'غفورا خاکروب' صدیوں کی روایت نے پیشوں کو اقدار کی علامت بنا ڈالا۔ اس روایتِ بد کو صرف اور صرف تعلیم سے ہی توڑا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں ایک خاکروب والدین کے بیٹے، ذیشان لبّا مسیح نے سول جج بن کر انسانی عظمت کی عمدہ مثال قائم کی ہے۔ پاکستان کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔ سلمیٰ اعوان ہماری ایک مستند اور تجربہ کار افسانہ نگار ہیں۔ معاشرے کی کڑوی کسیلی سچائیوں سے بنے ان کے افسانے قاری کو مسحور کر لیتے ہیں۔ ''راز ایک مٹھی میں'' اگر گھر کے بزرگ دانش مند ہوں اور انسانی نفسیات کی تھوڑی سوجھ بوجھ رکھتے

ہوں تو بڑے بڑے مسائل چٹکی بجاتے ہی حل کیے جاسکتے ہیں۔ وہ راز مٹھی میں رہا۔ اسے چیلنج کون کرتا۔ چیلنج کرنے والا تو چاروں شانے چت ہو چکا تھا۔ ''اجنبی شہر میں ایک انسان'' نثار احمد صدیقی کا تاثراتی افسانہ ہے۔ کسی دانشور نے کیا خوب کہا کہ ''دنیا میں صرف دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ایک شکم سیر اور دوسرا بھوکا۔ تیسری کوئی قسم نہیں ہوتی'' یہ افسانہ اسی حقیقت کا عکاس ہے۔ ''سہاگ سرائے'' نجم الحسن رضوی کا اپنا اُسلوب افسانے کے ہر سطر سے ظاہر ہے۔ شادی ہال، جس کے ذریعہ گھر بسانے اور خاندان کی اکائی کی بنیاد ڈالی جاتی ہے، اسے گھر جیسا ہونا چاہیے۔ ایک اچھوتا خیال، زیادہ پرانی بات نہیں، صرف پچاس سال قبل ہمیں شادی ہال کی ضرورت نہیں تھی۔ ہائے رے ترقی معکوس جب گھر ڈربہ بن گیا۔ ملک کے ستّر فی صد عوام کے لیے۔ یقیناً ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں ابدال بیلا کا پرانا شیدائی ہوں۔ میں نے ان کی کتاب ''پاکستان کہانی'' پڑھی تو اس کے بعد ان کی ہر ''تخلیق'' میری لائبریری کی زینت ہے۔ ان کی تحریر میں ہمیشہ خونِ جگر شامل رہا ہے۔ ''گھونسلے سے گری ہوئی چڑیا'' اور بستیوں میں بجھتے زندگی کے چراغ۔ ظلم چہار سو پھیلا ہے۔ کہیں پڑھا تھا کہ تقویٰ فقط عبادت گزاری نہیں بلکہ آپ کسی جانور کو بھی بھوکا نہ دیکھ سکیں، یہ تقویٰ ہے۔ انسان اگر انسانیت کے منصب پر فائز ہے تو وہ ظالم ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا 'حصار' احساسِ محرومی کا سدِّ باب کرنے والی پُر اثر تحریر، مینار کی بلندی نے کوتاہ قد کے وجود کو یقین دلا دیا کہ ہر چیز چھوٹی اور منحنی ہے۔ اسے دیکھنے والی آنکھ چاہیے جو اسے مینار کی بلندی نے عطا کر دی۔

نجیب عمر (کراچی)

.....

﴿16﴾ جناب سونان اظہر صاحب!

''تخلیق'' کا مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ ماشاءاللہ خوبصورت اور عمدہ ہے۔ آپ نے مرحوم اظہر جاوید کی پہلی برسی کے حوالے سے ''تخلیق'' کا جو یہ خاص شمارہ پیش کیا ہے وہ ہر نقطۂ نگاہ سے تحسین و ستائش کے لائق ہے۔ احباب کی تحریریں اور دیگر نگارشات ایک سے ایک بڑھ کر ''تخلیق'' اور مرحوم اظہر جاوید کے عین شایانِ شان ہیں۔ آپ کی کوششیں اور روابط و مراسم بھی مرحوم ہی کی طرح قابلِ رشک ہیں۔

اس پرچے کی پروڈکشن میں آپ نے جو نمایاں تبدیلیاں اور جدتیں پیدا کی ہیں وہ خوشگوار اور جمالیاتی ذوق کی غماز ہیں۔ میری دعا ہے کہ مرحوم اظہر جاوید کے ''تخلیق'' اور تخلیقی سفر کو اسی طرح جاری رکھنے کی اللہ آپ کو ہمت اور توفیق ارزانی فرمائے۔

راجہ اسد علی خاں (لاہور)

.....

﴿17﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا شمارہ نمبر 9 میرے سامنے ہے جو مجھے میرے بچپن کے بہترین دوست نجم الحسن رضوی نے مطالعے کے لئے دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ محترم جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد اب ''تخلیق'' کی تمام تر ذمہ داریاں ان کے صاحبزادے جناب سونان کے کاندھوں پر آ پڑی ہیں لہٰذا ان سے ہر مرحلے پر بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔ سونان صاحب! یہ آپ کے علم میں نہیں ہوگا کہ میرے محترم و مرحوم اظہر جاوید صاحب سے بہت ہی دیرینہ تعلقات تھے اور میں ان کا حد درجہ عقیدت مند تھا۔ میں طویل عرصے سے بوجوہ عارضۂ قلب تقریباً گوشہ نشین ہو کر زندگی گزار رہا ہوں۔ اللہ آپ کو کامیابیاں عطا کرے۔ آمین!

ضیاء شہزاد (کراچی)

.....

﴿18﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا سفر جس خوبی سے جاری وساری ہے، اس اعلیٰ کاوش کے لیے آپ اور آپ کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ عمدہ تحریریں، کاغذ اور چھپائی کا بہترین معیار اور قلم کاروں سے آپ کا مسلسل رابطے میں رہنا، گویا آپ وقت کے ناتمام دامن سے پھول چُن رہے ہیں اور اپنے والدِ محترم کی رسمِ عشق بخوبی نبھا رہے ہیں۔ آپ اس بہترین سلسلے کو اسی طریقے پر جاری وساری رکھیے جیسا کہ آپ کے والدِ محترم رکھتے تھے۔ ''تخلیق'' دوماہی ٹھیک ہے۔ ہمت نہ ہاریئے گا۔ ہم سب اہلِ قلم آپ کے ساتھ ہیں۔ مالی معاونت ضرور کریں گے۔ بلند پایہ ادیبوں کی تحسین کے لئے ''تخلیق'' کا ''تحسین ایوارڈ'' بلاشبہ ایک نہایت عمدہ سلسلہ ہے۔ قلم کاروں کی تصاویر جیسے پہلے شائع ہوتی تھیں وہ سلسلہ دوبارہ شروع کیجئے۔ اس سے دل چسپی کا عنصر مزید بڑھ جاتا ہے۔ تنقیدی مضامین کا سلسلہ بڑھایئے۔ تازہ شمارے میں نظمیں اور غزلیں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر جناب انور سدید کے یہ اشعار دل میں اُترتے چلے گئے۔

آنکھ نے دل کا بھید جان لیا　　خون رسنے لگا ہے اندر سے
حملہ آور ہے وقت کی دیمک　　کھوکھلا کر گئی ہے اندر سے

محترمہ بسمل صابری کی نظم ''فیض احمد فیضؔ'' نہایت عمدہ تھی۔ خالدہ احسان کا مضمون ''عجیب مانوس اجنبی تھا''، جناب ابدال بیلا کا افسانہ ''گھونسلے سے گری ہوئی چڑیا''.....اور انجمنِ خیال میں جناب علی سفیان آفاقی کا خط پڑھ کر اُداسیوں کی تمازت میں اضافہ ہوا۔ آپ کی کامیابی وترقی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

صائمہ نورین بخاری (ملتان)

.....

﴿19﴾ محترم سونان اظہر!

''تخلیق'' موصول ہوا۔ مفصّل پڑھا۔ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ آپ کی محنت، جانفشانی اور ادب سے محبت کا ثمر بارآور ہوتا صاف دکھائی دے رہا ہے۔ آج کے پُرفتن اور ''بے ادب'' دور میں ادب سے وابستہ ہر شخص قابلِ احترام ومحبت ہے۔

امتیاز کاظمی (لاہور)

.....

﴿20﴾ مکرمی سونان جاوید!

اظہر جاوید صاحب کے اچانک انتقال سے قارئینِ 'تخلیق' کو جو جانکاہ صدمہ پہنچا ہے اُس کی گرفت سے آزاد ہونا آسان نہیں۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ زندگی اور موت کے درمیان کشمکش کا سلسلہ انسان کی پیدائش کے روزِ اوّل سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس جنگ میں کبھی زندگی غالب رہتی ہے اور کبھی موت کامیاب ہو جاتی ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو شکست دے کر بھی موت اُن پر غالب نہیں ہو پاتی۔ اظہر جاوید بھی ایسے ہی شخص تھے جو زندگی بھر جیتے رہے اور مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ آپ کی ادارت میں 'تخلیق' کا حالیہ شمارہ دیکھ کر اس بات کی خوشی ضرور ہوئی کہ اظہر جاوید زندگی کی جنگ میں تنہا نہیں تھے۔ اُن کے پیچھے ایک کارواں تھا، ایک روایت تھی جو وہ چھوڑ گئے ہیں جس کی مشعل آج آپ نے اپنے پُرعزم اور جواں ہاتھوں میں اُٹھالی ہے۔ 'تخلیق' کی اشاعت کا سلسلہ مابعد اظہر جاوید جاری رکھنے کے لئے میری مبارکباد قبول فرمائیں۔ میری دعائیں اور ممکنہ تعاون ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گا۔ 'تخلیق' کی خریداری کا سالانہ زرِتعاون نارنگ ساقی صاحب کی خدمت میں ارسال کر چکا ہوں۔

سرور حسین (پٹنہ۔انڈیا)

.....

﴿21﴾ محترم سونان بھائی!

اظہر جاوید صاحب مغفور کو پڑھنا میرا ایک معمول تھا۔ان کے انتقال نے شدید صدمے سے دوچار کیا۔صد شکر کہ آپ نے یہ بارِ امانت اُٹھالیا ہے۔ہم آپ کے ساتھ ہیں،حوصلہ رکھیں آپ کو تو تمام بڑے ناموں کی رہنمائی اور تعاون حاصل ہے۔کھری بات کروں گا آپ کی ادارت میں پرچہ دیکھ کر ذرا بھی مختلف ہونے کا احساس نہیں ہوا۔پرانی طمانیت برقرار ہے۔

ہاں ایک بات اور کہنی تھی کہ سالوں سے پرچہ دوماہی ہے۔ہمیں یہ اور نئی قیمت بھی قبول ہے تاہم اگر کبھی یہ ممکن ہو سکے تو ماہوار بنانے کی کوشش کریں تو جلد جلد ملاقات ہوا کرے گی۔تاہم یقیناً اس میں آپ کے کچھ تحفظات ہوں گے۔''تخلیق'' کے معمول کو برقرار رکھنے پر مبارک باد۔

محمد افضال انجم (لاہور)

.....

﴿22﴾ جناب سونان اظہر جاوید!

دو روز قبل آپ کا محبت نامہ 'تخلیق' کے اظہر جاوید نمبر کے ساتھ موصول ہوا جو آپ نے میری درخواست پر خصوصی طور پر کسی دوست سے لے کر مجھے پہنچایا۔آنجہانی اظہر جاوید صاحب پر بھرپور شمارہ پڑھنے کا فیض حاصل ہوا۔ان کی شاعری اور ان پر مضامین پڑھ کر ایک خاص ذہنی کیفیت پیدا ہوئی۔آپ کا اداریہ اُردو ادب کے لحاظ سے حوصلہ افزا ہے۔اس رسالہ کا جاری رہنا مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان پُل کا کام مسلسل انجام دیتا رہے گا۔'تخلیق' کے گذشتہ شمارہ کی روشنی میں میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ ماہنامہ کے طور پر ہر ماہ شائع ہونا چاہیے۔اس کا لطف ہی اور ہے۔زرِسالانہ اگر بڑھانا بھی پڑے تب بھی کوئی بات نہیں۔

وشال کُھلّر (لدھیانہ۔انڈیا)

.....

﴿23﴾ عزیز محترم!

'تخلیق' کا نیا شمارہ معنوی اور صوری اعتبار سے حد درجہ جاذبِ نظر ہے اور یہ کسی لحاظ سے بھی اس ادبی صحافت کے معیار سے کم نہیں ہے جس کی بنیاد آپ کے والد محترم جناب اظہر جاوید صاحب نے رکھی تھی۔مجھے اس بات کی حد درجہ مسرت ہے کہ آپ اپنے والد صاحب کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں اور ادبی صحافت کے نئے آفاق کی تلاش میں سرگرم عمل ہیں۔

خورشید احمر (کراچی)

.....

﴿24﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

اظہر جاوید صاحب کی وفات کے بعد آپ نے سلسلۂ تخلیق کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ رسالے کے معیار کو بھی برقرار رکھا ہے جس سے یقیناً آپ کے والدِ محترم کی روح پُرسکون ہوگی ورنہ اس طرح کے روشن کیے ہوئے چراغ،زندگی کا چراغ گُل ہوتے ہی بجھ جاتے ہیں۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ اِس تخلیق کے چراغ کو ہمیشہ ہمیشہ روشن رکھیں اور وہ تخلیق کار جو اظہر صاحب کے خاص احباب تھے اُن کا قلمی تعاون آپ کو بھی حاصل رہے تاکہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

اسلم سحاب ہاشمی (ساہیوال)

.....

﴿25﴾ جناب سونان اظہر صاحب!

''تخلیق'' بلاشبہ اپنی افادیت اور خوبصورتی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ آپ نے اپنے والد گرامی کی روح کو جس جاں فشانی سے تسکین دی ہے اللہ اُن کو سکون اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور آپ کو اس کی جزا دے۔ آمین!

پچھلے ہفتے جب فیصل آباد سے گھر آئی تو سامنے استقبال کیلئے ''تخلیق'' کو پایا۔ یقین کریں کہ ساری پریشانی اور تھکن دور ہوگئی۔ کھولنے پر اپنا کلام بھی دیکھا تو اور بھی خوشی ہوئی۔ رسالے میں کہیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے نئے سرے سے آباد کیا گیا ہے۔ سب کچھ ویسا ہے لوگوں کی تحریروں میں اظہر صاحب زندہ ہی نہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اُن کی اعلیٰ کارکردگی کے اُنھیں ایوارڈ مل رہے اور وہ سب میں بیٹھے پُرمسرت و پُرجوش طریقے سے سب کو اظہارِ تشکر کر رہے ہوں۔ ''تخلیق'' کی اشاعت کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہم بے چینی سے ماہنامہ کی اشاعت کے منتظر رہتے تھے۔ پھر دو ماہ کی جدائی کی عادت ڈال دی۔ اب اس سے زیادہ نہیں۔

مسرت رعنا (لاہور)

.....

﴿26﴾ محترم سونان اظہر!

اظہر جاوید سے میری پہلی ملاقات ایک فضائی سفر میں ہوئی تھی۔ میں اسلام آباد سے ملتان اور اظہر جاوید ادیبوں کے قافلے کے ہمراہ اسلام آباد سے لاہور..... ادیبوں کی کہکشاں جہاز میں اُتر آئی۔ میں کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھنے لگی۔ جہاز جب تیز رفتاری سے فضا میں اُڑنے لگا تو میں اظہر جاوید سے مخاطب ہوئی۔ آپ نے کہا ''جی میں ہی اظہر جاوید ہوں۔'' میں نے پُرجوش آواز میں کہا۔ ''اچھا..... تو آپ تخلیق والے اظہر جاوید ہیں۔ میں اپنی دوست عذرا اصغر سے آپ کا ذکرِ خیر سنتی رہتی ہوں۔'' یہ مختصر سی ملاقات بڑی دل نشین ثابت ہوئی۔

وقت سرعت سے گزرتا رہا۔ 'تخلیق' بڑی باقاعدگی سے ملتا رہا اور میں زبانی یا تحریری طور ''انجمنِ خیال'' میں اظہر جاوید صاحب کی انتھک محنت اور جانفشاں کاوش کو سراہتی رہی۔ پھر جب لاہور آئی تو عذرا اصغر کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور بتایا کہ میں اس دفعہ اظہر جاوید کو ملے بغیر واپس اسلام آباد نہیں جاؤں گی۔ پرانی انارکلی کی پُرپیچ گلیوں سے گزر کر میں بھگوان سٹریٹ 'تخلیق' کے دفتر جا پہنچی۔ ہمیں دیکھتے ہی کرسی سے اُٹھ کر بڑے تپاک سے ملے۔ سامانِ خورد و نوش دیکھ کر آپ نے کہا ''یہ کیا تکلف؟'' میں نے برجستہ کہا ..... اظہر..... یہ ریت بھی ہے اور پریت بھی۔ اظہر جاوید نے توانائی سے بھرپور ایک قہقہہ لگایا۔ پھر میں نے آپ سے اجازت چاہی اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی دفتر سے باہر آئی۔ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو دیکھا آپ بھگوان سٹریٹ کے تپتے فرش پر ننگے پاؤں کھڑے ہم دونوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ کار کا دروازہ کھول کر آپ نے مجھے اندر بٹھایا اِس نفسانفسی کے دور میں تمہاری محبت اور اپنائیت کا رنگ دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ اللہ اللہ! کتنا پیارا، کتنا چاہنے والا، سچا اور کھرا انسان، نہ روپے پیسے کی چمک دمک۔ بس سچائی اور انمول محبت کے سہارے دلوں پر راج کرنے والا انسان۔ اور اب ان کے بیٹے نے ''تخلیق'' کو جاری رکھ کر سب کے دلوں پر راج کر لیا۔ اللہ تمہاری اس کوشش کو قائم رکھے اور اب تو 'تخلیق' کے معیار کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

﴿27﴾ عزیزی سونان اظہر جاوید!

'تخلیق' کا تازہ شمارہ ملا۔ کرم فرمائی کا شکریہ۔ ماشا اللہ چشم بد دور، نئے نکور اطلسی پیرہن میں ملبوس خوش نما ''تخلیق'' پر آج بھی مرحوم اظہر جاوید کے انگ انگ کی چھاپ اور چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی درد بھری ''پہلی بات'' سے لے کر ''انجمنِ خیال'' تک مرحوم کے اندازِ ادارت کا پرتو موجود ہے۔ افسانوں میں کوئی بھی روایتی نہیں، ہر افسانہ تازہ فکر، نئی سوچ، جدید تقاضوں کا حامل اور عصرِ حاضر کی بو باس سے معطر ہے۔ مضامین اور غزلیں، نظمیں سبھی خوب سے خوب تر ہیں، مگر شاہین، حسن عسکری کاظمی، اسلم گورداسپوری، انور سدید، بسمل صابری، ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی، ناصر علی سیّد، عرش صہبائی، زمان کنجاہی، مظفر حسین منصور، تسنیم کوثر، آفتاب خاں کی غزلیں اور ڈاکٹر محبوب راہی کی تضمین جی کو بہت بھائیں۔ تازہ شمارے سے موصوف کی ہمہ جہت شخصیت کے فن کا ایک اور روشن پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ پنجابی غزلیں اور پنجابی افسانہ ''ویگن والی'' جسے مرحوم نے فلمی کہانی کہا ہے مگر فلمی کہانیوں میں یہ حقیقت بیانی سادگی اور گیرائی کہاں ہوتی ہے۔ منٹو کا پسندیدہ موضوع مگر اس سے کہیں زیادہ دل پذیر و نظر افروز۔ اسے کہانی کی بجائے سوانح حیات کا ایک ورق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیا صاف ستھری، سچی اور آبِ کوثر میں دُھلی زبان ہے۔ محترم انور سدید اور جناب شفیع عقیل کو 'تخلیق' کا ''تحسین ایوارڈ 2013ء'' مبارک ہو، اُمید ہے یہ قابلِ قدر سلسلہ جاری رہے گا۔ آخر میں اپنے سبھی چاہنے اور سراہنے والے اہلِ قلم کا تہ دل سے سپاس گذار ہوں۔

عزیز میرٹھی (لاہور)

.....

﴿28﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ 'تخلیق' کا تازہ شمارہ (مارچ 2013ء) موصول ہوا۔ 'پہلی بات' میں آپ نے اظہر جاوید مرحوم کے حوالے سے اپنی کچھ یادوں کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔ وہ یادیں آپ کے اپنے والد سے گہری وابستگی کو اُجاگر کرتی ہیں۔ اپنے والد سے والہانہ عقیدت و محبت کا ہی یہ جذبہ ہے کہ آپ ایک ادیب نہ ہوتے ہوئے بھی ''تخلیق'' کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اُمید واثق ہے کہ آپ اس سلسلے کو مخلص احباب کے تعاون سے برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں گے۔ اُردو ادب کی دو معتبر شخصیات کو 'تخلیق' کا ''تحسین ایوارڈ'' پیش کر کے آپ نے اہلِ قلم کے اعترافِ فن کا ایک نہایت اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں اُنھوں نے پچاس سے زائد کتب تحریر کر کے ادب کے میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ پیرانہ سالی کے باوجود وہ ادب کے ہر موضوع پر دلجمعی سے لکھ رہے ہیں اور ان کی تحریروں سے ادیبوں کی نوجوان نسل مستفیض ہو رہی ہے۔ ابنِ سلطان نے اُردو کی پہلی ذہین و فطین نقّاد خاتون ممتاز شیریں کے بارے میں جو مضمون قلمبند کیا ہے، وہ ہمیں اُن کی علمی و ادبی خدمات کے بارے میں آگاہی بخشتا ہے۔ حصہ افسانہ کافی معیاری ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ گھر کے افراد کی روزمرہ مصروفیات کے پسِ منظر میں ان کے باہمی رشتوں کی مغائرت پر روشنی ڈالتا ہے۔ جدید عہد کا فرد اس قدر مصروف ہو چکا ہے کہ افرادِ خانہ کا آپس میں ربط و تعلق نہ صرف مشینی طرزِ عمل اختیار کرتے جا رہا ہے بلکہ ایک المیے کی صورت میں ہر گھر کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ نجم الحسن رضوی کے افسانے سے یہ پہلو آشکار ہوتا ہے کہ اگر کہیں سے چار پیسے زائد ملنے کی اُمید ہو تو لوگ سالہا سال کی تگ و دو کے بعد تعمیر کردہ اپنے بنگلے کو شادی گھر میں تبدیل کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے، گویا منفعت پسندی آج کے انسان کے دیگر احساسات پر غلبہ پا چکی ہے۔ ڈاکٹر ابدال بیلا کا افسانہ ''گھونسلے سے گری چڑیا''۔ اپنی علامتی جہت کے باعث قابلِ توجہ ہے۔ اسی طرح حنیف باوا، سلمٰی اعوان، نثار احمد صدیقی اور نجمہ عثمان نے اپنے اپنے افسانوں کے

موضوعات سے انصاف کیا ہے۔ غلام الثقلین نقوی مرحوم کی ڈائری کے اوراق پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے حالات ایک ہی نہج پر گامزن ہیں اور ملکی صورتِ حال حسبِ سابق جوں کی توں برقرار ہے۔

گوشۂ اظہر جاوید کے مطالعے سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کتنی محبت کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا اور جو کوئی ایک بار اُن سے مل لیتا، وہ اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ گوشۂ اظہر جاوید ان کے چاہنے والوں کے جذبات اور احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ مجھے اُمید ہے ''تخلیق'' کو خوب سے خوب تر بنانے کے سلسلے میں آپ کی مساعی جاری رہیں گی۔

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

.....

﴿29﴾ مکرمی سونان اظہر صاحب!

معیاری ادبی تحریروں پر مشتمل ''تخلیق'' موصول ہوا۔ گذشتہ فیضؔ میں ڈاکٹر انور سدید صاحب نے فیضؔ کی معیت میں گزارے یادگار لمحات کا خوبصورت انداز میں احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں فنی مہارت کے ساتھ ساتھ ''اپنا پن'' اتنا شدید اور کشش کا حامل ہوتا ہے کہ قاری بصد شوق اور متجسس ہو کر ہر فقرہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اللہ ان کے قلم کا فیض جاری و ساری رکھے۔ یقیناً وہ ادبی دنیا کے سمندر سے اک نیا شہر اُبھار چکے ہیں۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا کا مضمون ''ممتاز شیریں اُردو کی پہلی نقاد خاتون'' جو انھوں نے ''ابنِ سلطان'' کے نام سے ''تخلیق'' کو بھجوایا ہے اپنے لہو میں مفید معلومات اور حقائق لئے ہوئے ہے۔ رانا صاحب کا یہ فنی کمال ہے کہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اس کے منجملہ پہلوؤں کا احاطہ ماضی و حال کے واقعات اور پیش بندیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔ میگزین میں کہانیوں کا شعبہ دیگر مشمولات کی طرح توجہ طلب ہے۔ آپ نے مارچ کے شمارے میں آٹھ افسانے شائع کئے اور یہ فکشن کے ابلاغ کی مؤثر کوشش ہے۔ حنیف باوا کا افسانہ ''غفورا خاکروب'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حنیف باوا صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ کہانی کو پروان چڑھاتے ہیں اور وہ اس عمل میں کہانی کے پلاٹ کی تیاری کے لگے بندھے ضوابط کے زیرِ اثر مصنوعی اور میکانکی کرداروں کا میلہ نہیں لگاتے اور مقامی آب و ہوا اور معاشرت سے دو ہاتھ دو ڈکھڑے نظر نہیں آتے۔ ان کے اس افسانہ نے کہانیوں کے گوشے کو مزید عمدہ اور قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ حنیف باوا کے افسانوی کام پہ محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ رقم طراز ہیں ''حنیف باوا افسانے کا بڑا نام ہے۔ وہ صرف نام ہی کے نہیں بلکہ کام کے بھی بڑے آدمی ہیں۔''

گوشۂ اظہر جاوید میں اُن کے دوستوں نے جس محبت کا اظہار کیا وہ تعریف کے قابل ہے۔ اللہ اُن کے دوستوں کو سلامت رکھے۔ طنز و مزاح میں ڈاکٹر معین قریشی نے پڑھنے والوں کے ہونٹوں کو متبسم کیا ہے۔ دورِ حاضر میں پریشان حال قاری کے لیے تفریح کا سامان مہیا کیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہے تا کہ جس سے بادِ بہاری میسر رہے۔ مجموعی طور پر ماہنامہ ''تخلیق'' مارچ 2013ء ادبی رسائل میں قد آور دکھائی دیتا ہے۔ نظم اور نثر کے انتخاب سے ایک سمجھ دار ایڈیٹر کا عکس نمایاں اور قابلِ تحسین ہے جس نے ماہنامہ ''تخلیق'' کو بلندیوں پر پہنچا دیا۔

مرزا شبیر بھیروی (بھیرہ)

◆◆◆